

Jhumpa Lahiri کے افسانوی مجموعے

"Interpreter of maladies"

کا ترجمہ اور تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار

شاہد اقبال



فیکلٹی آف لینگویجس

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجس، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۰ء

Jhumpa Lahiri کے افسانوی مجموعے
"Interpreter of maladies"
کا ترجمہ اور تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار

شاہد اقبال

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا
فیملی آف لینگویجز
(اردو زبان و ادب)



نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۰ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخط تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: Jhumpa Lahiri کے افسانوی مجموعے "Interpreter of maladies" کا ترجمہ اور تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: شاہد اقبال رجسٹریشن نمبر: 1373/M/U/F17

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر نازیہ یونس

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان

پروریکٹر اکیڈمکس

تاریخ:

اقرارنامہ

میں، شاہد اقبال، حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، کے ایم۔ فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نازیہ یونس کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

شاہد اقبال

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۰ء

فہرست ابواب

صفحہ نمبر	عنوان
iii	مقالہ کے دفاع اور منظوری کا فارم
iv	اقرارنامہ
v	فہرست ابواب
viii	Abstract
ix	اظہار تشکر

باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

۱	الف: تمہید
۱	i- موضوع کا تعارف
۱	ii- بیان مسئلہ
۲	iii- مقاصد تحقیق
۲	iv- تحقیقی سوالات
۲	v- نظری دائرہ کار
۲	vi- تحقیقی طریقہ کار
۳	vii- مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق
۳	viii- تحدید
۳	ix- پس منظری مطالعہ
۴	x- تحقیق کی اہمیت
۵	ب: افسانہ نگار جھمپالہری کے احوال و آثار
۶	ج: افسانوی مجموعے "Interpreter of Maladies" کا تعارف
۱۰	د: ترجمہ کاری کی مروجہ تکنیکوں کا جائزہ
۱۷	حوالہ جات

باب دوم: Interpreter of maladies کے افسانوں کا با محاورہ ترجمہ

- i- تعطل (A temporary matter) ۱۹
- ii- جدائی (When Mr. Pirzada came to dine) ۴۱
- iii- دکھوں کا ترجمان (Interpreter of maladies) ۶۱
- iv- اصلی دربان (A real durwan) ۸۷
- v- سیکسی (Sexy) ۱۰۰
- vi- مسز سین کا گھر (Mrs Sen's) ۱۲۸
- vii- مبارک گھر (This blessed house) ۱۵۴
- viii- بی بی ہلدار کا علاج (The treatment of Bibi Haldar) ۱۷۶
- ix- تیسرا اور آخری برا عظم (The third and final continent) ۱۹۲

باب سوم: حواشی ۲۱۷

باب چہارم: افسانوی مجموعے کا موضوعاتی جائزہ

- الف: عائلی مسائل سے متعلقہ موضوعات ۲۲۷
- ب: نفسیاتی مسائل سے متعلقہ موضوعات ۲۳۰
- ج: جنسی مسائل سے متعلقہ موضوعات ۲۳۲
- د: ہجرت کے مسائل سے متعلقہ موضوعات ۲۳۵
- ه: تہذیبی و ثقافتی مسائل سے متعلقہ موضوعات ۲۳۸
- حوالہ جات ۲۴۰

باب پنجم: افسانوی مجموعے کا فنی جائزہ

- الف: پلاٹ ۲۴۲

۲۴۸	ب: کردارنگاری
۲۵۸	ج: اسلوب
۲۶۹	حواله جات
	باب ششم: ما حصل
۲۷۱	الف: مجموعی جائزہ
۲۷۴	ب: نتائج
۲۷۴	ج: سفارشات
۲۷۶	کتابیات

Abstract

Jhumpa Lahiri is a prominent name among modern American writers of South Asian descent. Her debut collection of short stories namely "Interpreter of maladies", published in 1999, won her world accolade, a Pulitzer Prize for fiction and a PEN/Hemingway Foundation Award in 2000. This collection of nine short stories portrays heart rending tales of the lives of South Asian immigrants in America who are struggling to cope with the trauma of fractured relationships primarily due to dislocation and disorientation. This thesis entitled as "Translation and critical analysis of Jhumpa Lahiri's Interpreter of maladies" focuses primarily on Urdu translation of these stunning stories using idiomatic and free translation techniques. Also, this research work strives to grasp the artistic genius of Jhumpa by critically analysing her stories. Thus, by translating and analysing these masterpieces, this work is an earnest effort to introduce Jhumpa Lahiri, a master story teller, to the world of Urdu literature.

This research work has been divided into six chapters each focusing on a particular aspect of the topic. First Chapter opens up with an introduction of the writer, a deep look at the book and an overview of the contemporary translation techniques. Second and the most important Chapter consists of idiomatic and free Urdu translation of these stories followed by third Chapter which contains side or explanatory notes of some tricky words and expressions. Fourth Chapter analyses major themes of the stories including migration, marriage, sex, cultural alienation and muted communications while fifth one evaluates plots, characterization and writing style of Jhumpa Lahiri. Sixth and the last Chapter concludes the work by an overview, some conclusions and a couple of recommendations.

اظہار تشکر

اس مقالے کی تکمیل پہ میں خدائے بزرگ و برتر کا شکر گزار ہوں جس نے مجھ ناچیز کو یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا کی۔ میں اپنی نگران کار ڈاکٹر نازیہ یونس کا احسان مند ہوں جنہوں نے نہ صرف ہر لمحے پر میری راہنمائی فرمائی بلکہ میری خامیوں اور کوتاہیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کام کی تکمیل کے لیے مسلسل میری حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ میں سابقہ و موجودہ صدور شعبہ اردو ڈاکٹر روبینہ شہناز اور ڈاکٹر عابد سیال صاحب اور کوآرڈینیٹر ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ کا بھی بے حد شکر گزار ہوں جن کی شفقت اور راہنمائی میرے شامل حال رہی۔ میں شعبہ اردو کے تمام معزز اساتذہ کرام کا بھی ممنون ہوں جن کے دیے گئے علم اور تربیت کے سبب میرے لیے اس تحقیقی کام کو سرانجام دینا ممکن ہوا۔

اپنے والدین کی محبتوں اور حوصلہ افزائی کا ذکر کرنا بھی یہاں بے جا نہیں جن کی دعائیں ہمیشہ میری ہمت بڑھاتی اور میرے ارادوں کو مہمیز دیتی رہی ہیں۔ میں یہاں اپنی شریک حیات ڈاکٹر ربیعہ اعجاز کا ذکر بھی لازمی سمجھتا ہوں کہ جس نے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر میرے ترجمہ شدہ افسانوں کی پروف ریڈنگ کر کے ان کو ممکنہ اغلاط سے پاک کیا۔ میں اپنے تمام ساتھی سکالرز بالخصوص حلیم احمد، فریحہ اکرم اور آفرینش گلناز کا بھی شکر گزار ہوں جو وقتاً فوقتاً تحقیقی امور میں میری مدد کرتے رہے۔

شاہد اقبال

باب اول

موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید:

i۔ موضوع کا تعارف

زیر نظر مقالہ افسانوی مجموعے Interpreter of maladies کا با محاورہ ترجمہ اور تجزیاتی مطالعہ ہے۔ Interpreter of maladies معروف امریکی مصنفہ Jhumpa Lahiri کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے پر انہیں ۲۰۰۰ء میں پلٹزر پرائز برائے افسانوی ادب (Pulitzer Prize for Fiction) سے نوازا گیا۔ اسی سال انہیں اس افسانوی مجموعے پر ہیمنگوے فاؤنڈیشن ایوارڈ (Hemingway Foundation Award) بھی عطا کیا گیا۔ اس افسانوی مجموعے میں کل ۹ افسانے شامل ہیں جن کو متعدد اعزازات سے فردا فردا نوازا گیا ہے۔ یہ افسانے جو ابتدائی طور پر وقتاً فوقتاً مختلف ادبی رسائل و جرائد میں چھپتے رہے زیادہ تر ان کرداروں کی کہانیاں ہیں جو ہندوستان سے ہجرت کر کے امریکا جا بسے ہیں اور اب دو تہذیبوں کے تفاوت کے باعث سماجی، نفسیاتی اور جذباتی الجھنوں کا شکار ہیں۔ یہ افسانے ہجرت کرنے والی پہلی نسل اور نئے کلچر کو اختیار کرنے والی ان کی دوسری نسل کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کی کہانیاں ہیں۔ ان کے اس افسانوی مجموعے کا دنیا کی قریباً تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ

جھمپا لہری معاصر امریکی افسانے کا ایک معتبر نام ہیں۔ جنوبی ایشیا سے تعلق رکھنے والے انگریزی قلم کاروں میں انہیں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے Interpreter of maladies کا ترجمہ و تجزیہ اس واسطے اہم ہے کہ یہ ہمیں انگریزی ادب کی ایک اہم اور جدید جہت سے روشناس کرواتا ہے۔ اس ترجمے کا بنیادی مدعا جھمپا کی تخلیقی کاوشوں کو اردو میں ترجمہ کر کے ان کا تجزیہ کرنا ہے۔ جھمپا کے افسانے اس لیے بھی ہمارے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں کہ یہ جنوبی ایشیا کے باشندوں کی کہانیاں ہیں، ان باشندوں کی کہانیاں جو اپنی دنیا سے کٹ کر نئی دنیا میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ان کے کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ میرے اس مقالے کا ایک اہم حصہ ہے۔

iii- مقاصد تحقیق

زیر نظر تحقیقی مقالے میں درج ذیل تین مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے:

- الف۔ جھمپا لہری کے افسانوی مجموعے Interpreter of maladies کا با محاورہ اور آزاد اردو ترجمہ اور حواشی میں وضاحت طلب الفاظ و تراکیب اور اصطلاحات کی توضیح کرنا۔
- ب۔ مذکورہ افسانوی مجموعے کا موضوعاتی و فکری تجزیہ کرنا۔
- ج۔ اس افسانوی مجموعے کا فنی جائزہ پیش کرنا۔

iv- تحقیقی سوالات

اس مقالے میں درج ذیل سوالات پیش نظر رکھے گئے ہیں:

- الف۔ ترجمے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جائے کہ مصنفہ کے اسلوب، آہنگ اور افکار کو اردو کے مخصوص لب و لہجے میں ڈھال کر پیش کیا جاسکے؟
- ب۔ Interpreter of maladies میں موضوعات کی نوعیت کیا ہے اور مصنفہ نے کون کون سے نفسیاتی، عائلی، جنسی اور ثقافتی مسائل کو اجاگر کیا ہے؟
- ج۔ مذکورہ افسانوی مجموعے کے ایشیائی کرداروں کی تشکیل میں کون کون سے عوامل اہم کردار ادا کرتے ہیں؟

v- نظری دائرہ کار

اس تحقیقی مقالے میں افسانوی مجموعے Interpreter of maladies کے ترجمے و تجزیے کے ذریعے جھمپا لہری کے فن کو سمجھنے اور ان کے ہاں موجود سماجی، نفسیاتی، معاشی، اور جنسی مسائل کی تفہیم پیش نظر رکھی گئی ہے۔ ترجمے کے لیے آزاد با محاورہ ترجمے کے طریقہ کار کو اپناتے ہوئے متن کے زیادہ سے زیادہ قریب رہ کر اس کو اردو کے لب و لہجے میں ڈھالنے کی کاوش کی گئی ہے۔ اس مقالے کے ذریعے تلاشِ معاش میں مشرق سے مغرب ہجرت کر جانے والوں کرداروں کی زندگیوں میں در آنے والی تہذیبی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کی گرہ کشائی کی گئی ہے۔

vi- تحقیقی طریقہ کار

اس تحقیقی مقالے میں بنیادی ماخذ یعنی افسانوی مجموعے Interpreter of maladies پر انحصار کیا گیا ہے۔ چونکہ مقالے کا سب سے اہم اور بنیادی حصہ متن کے ترجمے پر مشتمل ہے اس لیے اس میں فن ترجمہ کاری کے بنیادی

اصولوں کو پیش نظر رکھ کر انگریزی متن کا ایسا با محاورہ اور آزاد ترجمہ کرنے کی کاوش کی گئی ہے جس سے کہانی کی بنیادی بنت بھی برقرار رہے اور یہ اردو کے لب و لہجے میں بھی ڈھل جائے۔ بنیادی ماخذ Interpreter of maladies جو کہ Houghton Mifflin پبلشرز نے ۱۹۹۹ء میں امریکا میں چھاپا اس کی ہندوستان میں اشاعت کے لیے Harper Collins پبلشرز کی تقسیم کی گئی کاپی سعید بک بینک اسلام آباد سے حاصل کی گئی ہے۔ بنیادی ماخذ کے علاوہ ثانوی ماخذات، کہ جن میں سے کچھ کی فہرست کتابیات میں دی گئی ہے، سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ بہت سی انگریزی ماخذات کی کتب کی پاکستان میں عدم دستیابی کی وجہ سے ان کی سافٹ کاپیوں پر انحصار کیا گیا ہے جو انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ حصول کتب کے لیے سرکاری اور جامعاتی کتب خانوں کے ساتھ ساتھ نجی کتب خانوں تک رسائی کی گئی ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے جھپا لہیری کے متعلق موجود مواد کو بھی کھنگالا گیا ہے تاکہ ان کی شخصی اور ادبی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ طلب نہ رہ جائے۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

دستیاب معلومات کے مطابق جھپا لہیری کے افسانوی مجموعے Interpreter of maladies کے اردو ترجمے و تجزیے کا کام ابھی تک ایم اے، ایم فل یا پی ایچ ڈی کی سطح پر نہیں کیا گیا۔ ان کے زیر نظر افسانوی مجموعے کا اگرچہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے لیکن ان کی اس تخلیقی کاوش کو اردو میں ڈھالنے کی ابھی تک کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ انگریزی زبان میں ان کے اس افسانوی مجموعے پر متعدد تحقیقی و تنقیدی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ Interpreter of maladies پر متعدد تحقیقی مقالہ جات بھی زبان انگریزی میں قلمبند کیے گئے ہیں۔

viii۔ تحدید

جھپا لہیری نے افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں انگریزی اور اطالوی زبان میں متعدد تصانیف کی ہیں۔ انہوں نے بطور ناول نگار، افسانہ نگار اور مضمون نگار اپنا لوہا ادبی دنیا سے منوایا ہے تاہم میرے اس مقالے کا موضوع ان کے پہلے افسانوی مجموعے Interpreter of maladies کے تجزیے و محدود ہے۔ ان کا یہ افسانوی مجموعہ کل ۹ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان افسانوں کا با محاورہ ترجمہ اور موضوعاتی و فنی جائزہ میرے اس مقالے کا مطمع نظر ہے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعے کے طور پر جدید امریکی افسانہ نگاروں بالخصوص جنوبی ایشیائی افسانہ نگاروں پر ایک طائرانہ نظر

ڈال کر جھپا لہری کی انفرادیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جھپا کے جملہ ناولوں اور افسانوی مجموعوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے تاکہ ان کے اسلوب کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ ترجمے کے فن کے حوالے سے دستیاب کتب کا بھی اجمالاً جائزہ لیا گیا ہے تاکہ ادبی ترجمے کی راہ میں حائل مشکلات کو سمجھ کر ان پر قابو پایا جاسکے۔ جھپا لہری پر لکھی گئی چیدہ چیدہ کتب کا بھی جائزہ لیا گیا ہے تاکہ ان کے فن کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ اس کے علاوہ اخبار و جرائد میں جھپا کے بارے میں چھپنے والے مواد سے بھی گاہے گاہے مدد لی گئی ہے۔ تحقیقی رسائل و جرائد میں جھپا کے ناولوں اور افسانوں پر متعدد تحقیقی مضامین چھاپے گئے ہیں ان سے بھی متعدد مقامات پر استفادہ کیا گیا ہے۔ انٹرنیٹ پر دستیاب مواد بالخصوص جھپا کے انٹرویوز کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ الغرض نامور محققین کی رائے کو مد نظر رکھتے ہوئے جھپا کے فکری و فنی مقام و مرتبے کا تعین کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔

x۔ تحقیق کی اہمیت

ترجمے کی اہمیت مسلمہ ہے۔ علم و ادب اور تہذیب و تمدن کے فروغ میں زبانوں کے مابین تراجم نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ترجمے ہی کی بدولت ہم دوسری اقوام کے افکار و خیالات اور نظریات و اقدار سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ ادبی تراجم کی اہمیت اس لیے اور بھی زیادہ ہے کہ یہ ایک زبان کے اسلوب، آہنگ، خیالات اور افکار کو دوسری زبان میں ڈھال کر دونوں زبانوں کے ادبوں میں موجود اشتراکات و افتراکات کی تلاش کا نام ہے۔ انگریزی زبان دنیا کی طاقتور ترین زبان ہونے کے ساتھ ساتھ اقوام عالم کے درمیان سیاسی، معاشی اور معاشرتی تعلقات کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے۔ پاکستان کے لیے اس کی اہمیت اس واسطے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ ہماری سرکاری زبان بھی ہے۔ عہدِ سرسید سے لے کر دورِ موجودہ تک ہمارے شاعر، ادیب، محقق اور نقاد چشمہ افرونگ سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔ ہمارے افسانوی ادب بالخصوص ناول، افسانہ اور ڈرامہ وغیرہ کی ابتدا انگریزی ادب کے اثرات کا ہی نتیجہ ہے۔ اس لیے انگریزی ادب سے اردو میں تراجم کی اہمیت کا کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے اپنے مجوزہ موضوع میں ترجمے کے لیے اکیسویں صدی میں امریکی افسانے کے ایک اہم ترین نام جھپا لہری کو اسی لیے منتخب کیا ہے کہ ایک طرف ان کی تخلیقات میں ہمیں جہاں مغربی تہذیب و اقدار کی چاشنی ملتی ہے تو دوسری طرف ان کے کرداروں کا ایشیائی ہونا انہیں ہماری سر زمین سے بھی جوڑتا ہے۔ یوں ان کی کہانیاں مشرق و مغرب کے ایک ایسے ملاپ کی داستانیں ہیں جن کے گھمبیر مسائل و مصائب پر اس شدت سے کبھی قلم نہیں اٹھایا گیا۔ میرے ترجمہ و تجزیہ کا بنیادی مقصد مذکورہ افسانوی مجموعے کو دنیا کے اردو سے متعارف کروانا ہے۔

ب۔ مصنفہ جھمپا لہری کے احوال و آثار

میسویں صدی کے نصف آخر اور اکیسویں صدی کی ابتدا میں انگریزی ادب کے افق پہ کچھ ایسے ستارے طلوع ہوئے جنہوں نے اس جہان کو نئے اور اچھوتے موضوعات سے آشنا کیا۔ تلاش معاش میں مشرق سے ہجرت کر کے مغرب کو اپنا مسکن بنانے والے جنوبی ایشیائی کرداروں کے گرد گھومتے ان کے موضوعات نے انگریزی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ محسن حامد، کاملہ شمسی، بھارتی مکھرجی، مونیکا علی، ندیم اسلم، چترابینرجی، جھمپا لہری اور امیت موہمدر جیسے قلم کاروں نے اپنی تخلیقات سے جنوبی ایشیائی تارکین وطن (South Asian diaspora) کے متنوع مسائل کو نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ جنوبی ایشیائی تارکین وطن کو درپیش نفسیاتی، تہذیبی اور تمدنی چیلنجز پر قلم اٹھانے والے انہی مصنفوں میں جھمپا لہری ایک معتبر نام ہیں۔ جھمپا لہری کا اصل نام نیلنجانا سدھیشنا لہری (Nilanjana Sudheshna Lahiri) ہے اور انہوں نے ۱۱ جولائی ۱۹۶۷ء کو انگلستان کے شہر لندن میں ایک بنگالی خاندان میں آنکھ کھولی۔ ان کے والدین مغربی بنگال سے ہجرت کر کے لندن آئے تھے۔ جب وہ تین سال کی تھیں تو ان کے والدین انگلستان سے ایک اور ہجرت کر کے امریکا چل دیے۔ جھمپا نے اپنا بچپن اور لڑکپن امریکی ریاست رھوڈ آئی لینڈ (Rhode Island) کے ایک چھوٹے سے شہر کنگسٹن (Kingston) میں گزارا جہاں ان کے والد یونیورسٹی آف رھوڈ آئی لینڈ میں بطور لائبریرین خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ ان کو گھر میں پیار سے جھمپا کے نام سے پکارا جاتا تھا بنگالی زبان میں جس کا مطلب دلکش یاد لفریب کا ہے۔ جب انہوں نے اسکول میں قدم رکھا تو ان کے اساتذہ نے بھی انہیں اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ جھمپا نے بعد ازاں اسی نام کو اپنی شناخت بنالیا۔ نام کی شناخت سے جڑے مسائل کو انہوں نے اپنے شہرہ آفاق ناول دانیسم سیک (The Namesake) میں گوگول (Gogol) کے کردار کے ذریعے نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ جھمپا کی والدہ چاہتی تھیں کہ وہ اپنی بنگالی روایات اور تہذیب سے جڑی رہیں چنانچہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں ہمیں پرانی اور نئی دنیاؤں کے درمیان یہ کشمکش بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

جھمپا نے برنارڈ کا لچ سے ۱۹۸۹ء میں انگریزی ادب میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے بو سٹن یونیورسٹی سے انگریزی ادب، ادب و فن کے تقابلی مطالعے (Comparative Studies in Literature and Art) اور تخلیق کاری (Creative Writing) میں ایم۔اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۹۷ء میں انہوں نے رینسیاں اسٹڈیز (Renaissance Studies) میں اپنا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ مکمل کیا۔

جھمپا کا تخلیقی سفر ان کے زمانہء طالب علمی میں کالج دور سے شروع ہوا جب ان کے افسانے دانیو یار کر (The New Yorker)، ہارورڈ ریویو (Harvard Review) اور سٹوری کوئٹری (Story Quarterly) جیسے ادبی رسائل و جرائد کی زینت بننے لگے۔ بعد میں یہ کہانیاں ان کے پہلے افسانوی مجموعے Interpreter of Maladies کی صورت میں شائع ہوئیں۔ نسلاً جنوبی ایشیائی ہونے کے سبب جھمپا نے زیادہ تر اسی زمین سے وابستہ ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جن کا انہوں نے بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ ان کی کہانیوں عہد جدید کے الجھے ہوئے پراگندہ خیال اور پریشاں حال انسانوں کے نوٹے ہیں۔ Interpreter of maladies کے علاوہ ان کا ایک اور افسانوی مجموعہ Unaccustomed earth ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ ان کے دو ناول دانیو سیک (The Namesak) اور دالو لینڈ (The lowland) بالترتیب ۲۰۰۳ء اور ۲۰۱۳ء میں شائع ہو کر ناقدین سے داد پا چکے ہیں۔ دالو لینڈ کو مین بکر پرائز (Man Booker Prize) اور نیشنل بک ایوارڈ (National Book Award) جیسے معتبر ادبی اعزازات کے لیے نامزد کیا گیا۔ جھمپا نے انگریزی کے علاوہ اطالوی زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس زبان میں ان کی دو تخلیقات In Altre Parole اور Dove mi Trovo کے نام سے بالترتیب ۲۰۱۵ء اور ۲۰۱۸ء میں منصفہء شہود پر آچکی ہیں۔ جھمپا کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں متعدد اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

ج۔ افسانوی مجموعے Interpreter of Maladies کا تعارف

Interpreter of Maladies جھمپا لہری کا پہلا افسانوں مجموعہ ہے جس نے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوتے ہی ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ چنانچہ اگلے ہی سال اس مجموعے کو پلٹرز پرائز برائے افسانوی ادب اور ہیمنگوے فاؤنڈیشن ایوارڈ جیسے معتبر ادبی اعزازات سے نوازا گیا۔ اس مجموعے کی دنیا بھر میں ڈیڑھ کروڑ سے زائد کاپیاں فروخت ہوئیں اور سال دو ہزار میں یہ عالمی سطح پر سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں شامل رہا۔ اس مجموعے میں کل ۹ افسانے شامل ہیں جن میں سے ایک کے سوا تمام افسانے ہندوستان یا پاکستان سے ہجرت کر کے امریکا بسنے والے تارکین وطن کی زندگیوں میں درپیش مسائل کی کہانیاں ہیں۔ ان افسانوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

۱۔ A temporary matter

یہ افسانہ ابتدائی طور پر دانیو یار کر میگزین میں اپریل ۱۹۹۸ء میں اشاعت پذیر ہوا اور اب یہ Interpreter of Maladies کا پہلا افسانہ ہے۔ اس میں ایک ایسے شادی شدہ جوڑے کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنے پہلے بچے کی موت کے صدمے سے دوچار ہے۔ شو بھا اور شو کومار بوسٹن کے نواح میں رہائش پذیر ہیں اور بچے کے سانچے نے

انہیں ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے۔ دونوں کے درمیان سرد مہری کی خلیج حائل ہو چکی ہے اور وہ ایک ہی گھر میں اجنبیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ طوفان کے باعث ان کے علاقے میں بجلی کی تاریں گر جاتی ہیں اور ان تاروں کی مرمت کے باعث بجلی کی عدم دستیابی کے سبب انہیں کچھ شامیں اکٹھی گزارنی پڑتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کے بظاہر قریب آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۲۔ When Mr. Prizada Came to dine

مشرقی پاکستان علیحدگی کے تناظر میں لکھی گئی یہ کہانی ابتدائی طور پر ۱۹۹۹ء میں دالوویل ریویو (The Louisville Review) میں شائع ہوئی۔ ڈھاکہ سے تعلق رکھنے والے باٹنی کے پروفیسر پیرزادہ صاحب حکومت پاکستان کے عطا کردہ سکالرشپ پہ امریکا میں نیو انگلینڈ کے علاقے میں یونیورسٹی ہاسٹل میں قیام پذیر ہیں۔ وہ ہر شام ٹیلی ویژن پر ڈھاکہ کی خبریں دیکھنے کے لیے ایک ہندوستانی جوڑے کے گھر جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ ملاقاتیں دوستی میں بدل جاتی ہیں۔ اس جوڑے کی دس سالہ بیٹی لیلیا پیرزادہ صاحب کی کیفیات کو محسوس کرتی اور جنگ زدہ ڈھاکہ میں پھنسی ان کی بیوی اور سات بیٹیوں کے لیے ان کے دکھ کو بیان کرتی ہے۔

۳۔ Interpreter of Maladies

یہ افسانہ اول دا آگنی ریویو (The Agni Review) میں شائع ہوا اور اب اس افسانوی مجموعے کی ٹائٹل سٹوری ہے۔ شادی شدہ زندگی میں بے وفائی اور اس کے اثرات کی پردہ دری کرتی یہ کہانی ایک ہندوستانی نژاد نوجوان امریکی جوڑے مسٹر اور مسز داس کا قصہ ہے جو اپنے تین بچوں کے ساتھ سیاحتی مقامات کی سیر کے لیے ہندوستان آئے ہوئے ہیں۔ ان کا ادھیڑ عمر سیاحتی گائیڈ مسٹر کپاسی انہیں سوریامندر کی سیر کے لیے لے کر جاتے ہوئے گاڑی میں یہ انکشاف کرتا ہے کہ وہ جزوقتی طور پر ایک ڈاکٹر کے ساتھ کام کرتا ہے جہاں اسے ان مقامی مریضوں کی ترجمانی کرنا ہوتی ہے جن کی زبان ڈاکٹر نہیں سمجھ سکتا۔ مسز داس اس کے اس کام سے متاثر ہو کر بچوں اور شوہر کی غیر موجودگی میں مسٹر کپاسی سے اپنے ایک بیٹے کے ناجائز اولاد ہونے کا راز سنیر کرتی ہے۔ اسے توقع ہے کہ مسٹر کپاسی مریضوں کی ترجمانی والے اپنے تجربے سے کام لے اس کے دکھ کا کوئی علاج بتائیں گے لیکن مسٹر کپاسی اس کا یہ راز سن کر بھونچکا رہ جاتا ہے اور مسز داس کے لیے اس کے اپنے دل میں آرزوؤں کا جو محل بننا شروع ہو گیا تھا وہ دھڑام سے گر جاتا ہے۔

۴۔ A real durwan

یہ کہانی ابتدائی طور پر ہارورڈ ریویو (Harvard Review) میں ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔ سماجی بے حسی کو بے نقاب کرتی یہ ایک بوڑھی بنگالی عورت کی پرسوز داستان ہے جو تقسیم ہند کے بعد مشرقی بنگال سے ہجرت کر کے کلکتہ آ بسی ہے اور اب ایک کثیر المنزلہ رہائشی عمارت کے زینے صاف کرنے کا کام کرتی ہے۔ اسی عمارت کی سیڑھیوں کے نیچے ایک تنگ و تاریک جگہ میں اس کا ٹھکانہ ہے اور وہ عمارت میں آنے جانے والوں پر نظر رکھ کر ایک طرح سے درباری کے فرائض بھی بلا معاوضہ سرانجام دے رہی ہے۔ عمارت کے ایک رہائشی مسٹر دلال ترقی پانے کی خوشی میں عمارت کے زینوں پہ ایک واش بیسن کی تنصیب کرتے ہیں جو کچھ دن بعد چوری ہو جاتا ہے۔ عمارت کے سب رہائشی بوڑھی اماں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ ضرور اسی نے چوروں کو اطلاع دی ہوگی۔ بوڑھی اماں اپنی بے گناہی کا یقین دلانے میں ناکام رہتی ہے کیونکہ کوئی بھی اس کی بات سننے کے لیے آمادہ نہیں چنانچہ سزا کے طور پر بوڑھی اماں کو عمارت سے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔

۵۔ Sexy

یہ کہانی اول دانیو یار کر میگزین (The New Yorker) میں دسمبر ۱۹۹۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ کہانی کا مرکزی کردار ۲۱ سالہ امریکی لڑکی میرانڈا ہے جو ایک شادی شدہ بنگالی مرد دیو کے عشق میں مبتلا ہے۔ اس کی دوست لکشمی اسے اپنی کزن کے بارے میں بتاتی ہے جس کا شوہر کسی انگریز عورت کے چکر میں اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ چکا ہے۔ ایک روز وہی کزن جب لکشمی سے ملنے بوسٹن آتی ہے تو لکشمی میرانڈا کو اس کے بیٹے کا خیال رکھنے کی ذمہ داری سونپ کر خود کزن کے ساتھ سیر سپاٹا کرنے نکل جاتی ہے۔ اس سات سالہ لڑکے کا نام روہن ہے جس سے گفتگو کے دوران میرانڈا کو پتہ چلتا ہے کہ اس کے باپ کی بے وفائی نے کیسے اسے اور اس کی ماں کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ احساسِ ندامت میرانڈا کو گھیر لیتا ہے اور وہ دیو سے دور ہو جاتی ہے۔

۶۔ Mrs. Sen's

کلکتہ سے ہجرت کر کے امریکی شہر بوسٹن میں بسنے والی گھریلو خاتون مسز سین کی زندگی میں پیش آنے والی مشکلات کا احاطہ کرتی یہ کہانی ابتدائی طور پر سیلے مینڈر میگزین (Salamander) میں شائع ہوئی۔ مسٹر سین بوسٹن یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر ہیں اور شادی کے بعد وہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ امریکا لے آتے ہیں لیکن ان کی بیوی اس نئی دنیا میں بسنے کے ہنر سے ناواقف ہے۔ اسے رہ کر اپنے گھر کی یاد آتی ہے اور امریکی طرز زندگی کی سرد مہری اس کی

جان کھاتی ہے۔ امریکا منتقل ہونے کے بعد وہ ڈرائیونگ سیکھنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن خود پر اعتماد نہ ہونے کے باعث اس کی ڈرائیونگ کی مشق کچھ ایسی کامیاب نہیں جا رہی۔ وہ ایک انگریز لڑکے ایلین کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اٹھاتی ہے لیکن ایک روز دوران ڈرائیونگ بوکھلا کر گاڑی ایک کھبے سے جا ٹکراتی ہے۔ اسے اور ایلین کو معمولی چوٹیں آتی ہیں لیکن وہ خود کو کمرے میں بند کر لیتی ہے اور یوں نئی دنیا سے آشنائی کا اس کا سفر اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

۷۔ This Blessed House

یہ افسانہ ۱۹۹۹ء میں ابتدائی طور پر ایپوک ادبی میگزین (Epoch) میں شائع ہوا اور اب Interpreter of Maladies کا حصہ ہے۔ نویا ہوتا جوڑے سنجیو اور ٹوئنگل کو کینیڈیٹ میں اپنے نئے گھر منتقل ہونے کے بعد گھر کے مختلف حصوں میں چھپے ہوئے مسیحی متبرکات ملنے لگتے ہیں اور سنجیو، جسے ان چیزوں سے نفرت ہے، انہیں باہر پھینکنا چاہتا ہے لیکن اس کی بیوی ٹوئنگل کو ان میں خاص دلچسپی ہے چنانچہ وہ انہیں لونگ روم کے شیلف پہ سجا دیتی ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے مجسمے، مورتیں، پوسٹ کارڈ اور پوسٹر دونوں میاں بیوی کے درمیان تناؤ پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں لیکن نئے گھر کی پارٹی کے موقع پر جب گھر کی مٹی سے حضرت مسیح کا ایک نیا مجسمہ دریافت ہوتا ہے تو سنجیو ٹوئنگل کا جوش و خروش دیکھ کر اسے لونگ روم میں سجانے کی اجازت دے دیتا ہے یوں مزاجوں میں موجود تفاوت کے باوجود دونوں ایک دوسرے کو سمجھ کر دوبارہ ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔

۸۔ The treatment of Bibi Haldar

یہ افسانہ ابتدائی طور پر سٹوری کو اٹری میگزین (Story Quarterly) میں شائع ہوا۔ اس کا مرکزی کردار ایک ۲۹ سالہ لڑکی بی بی ہے جو ایک پراسرار مرض میں مبتلا ہے اور اس پر وقت بے وقت دورے پڑتے ہیں۔ بی بی اپنے واحد رشتہ دار کزن ہلدار اور اس کی بیوی کے ساتھ ایک کرائے کے اپارٹمنٹ میں رہتی ہے۔ اس کا زیادہ تر وقت اس کثیر المنزلہ رہائشی عمارت کی چھت پہ بنے اسٹور روم میں گزرتا ہے جہاں وہ کزن کی دکان میں بکنے والی چیزوں کا اندارج کرتی رہتی ہے۔ بی بی کے علاج کی پے درپے ناکام کوششوں کے بعد ایک ڈاکٹر کی یہ تجویز بی بی کو بہت بھاتی ہے کہ اس کی شادی کر دی جائے تو شاید وہ ٹھیک ہو جائے۔ بی بی کا کزن اس تجویز کی سختی سے مخالفت کرتا ہے لیکن بی بی کے شور شرابے سے تنگ آکر وہ ضرورت رشتہ کا ایک اشتہار مقامی اخبار میں دے ڈالتا ہے لیکن حسب توقع اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اسی اثنا میں ہلدار کی بیوی کے ہاں ایک بیٹی کی پیدائش ہوتی ہے چنانچہ اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں بی بی کی بیماری نو مولود میں نہ منتقل ہو جائے بی بی کو مستقلاً اپارٹمنٹ سے نکال دیا جاتا ہے اور وہ اسٹور روم کو اپنا ٹھکانہ بنا

لیتی ہے۔ رہائشی عمارت کے مکین ہلد ار کا بی بی کے ساتھ رویہ دیکھ کر اس سے خریداری ترک کر دیتے ہیں اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ دیوالیہ ہو کر اپارٹمنٹ چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جاتا ہے۔ مکینوں پر ایک روزیہ انکشاف ہوتا ہے کہ بی بی پیٹ سے ہے چنانچہ وہ اس کا حتی المقدور خیال کرتے ہیں اور بیٹے کی پیدائش کے بعد بی بی اپنے کزن کے چھوڑے ہوئے سامان سے کاروبار شروع کر دیتی ہے اور ہمیشہ کے لیے اپنے پر اسرار مرض سے نجات پالیتی ہے۔

9۔ The third and final continent

۱۹۹۹ء میں ابتدائی طور پر دانیو یار کر میگزین (The New Yorker) کی زینت بننے والا یہ افسانہ تارکین وطن کے اس جذباتی سفر کی داستان ہے جو نئے سرزمینوں سے رشتہ جوڑتے ہوئے ان پر گزرتی ہے۔ افسانے کا واحد متکلم ایک بنگالی نوجوان ہے جو کلکتہ سے پہلے لندن اور پھر کچھ سال بعد لندن سے بوسٹن ہجرت کرتا ہے۔ بوسٹن میں وہ جس کرائے کے گھر میں رہائش پذیر ہے اس کی ایک سو تین سالہ بوڑھی مالکن مسز کرافٹ سے اسے غیر محسوس طور پر جذباتی لگاؤ ہو جاتا ہے۔ اس کی بیوی مالا کے امریکا آنے کے بعد وہ ایک نسبتاً کشادہ اپارٹمنٹ کرائے پر لے کر اس میں منتقل ہو جاتا ہے لیکن بیوی کے ساتھ اس کا تعلق لیا دیا سار ہوتا ہے۔ ایک روز جب وہ سیر کی نیت سے گھر سے نکلتے ہیں تو نوجوان بیوی کو غیر ارادی طور پر مسز کرافٹ سے ملوانے ان کے گھر لے جاتا ہے جہاں اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ مسز کرافٹ بیچ سے گرنے کے سبب صاحب فراش ہیں۔ مسز کرافٹ سے یہ ملاقات میاں بیوی کے درمیان بیگانگی کی برف پگھلا دیتی ہے اور وہ دونوں پہلی دفعہ ایک دوسرے کے لیے اپنائیت محسوس کرتے ہیں۔

ج۔ ترجمہ کاری کی مروجہ تیکنیکوں کا جائزہ

ترجمہ کاری کے ایک پیچیدہ فن ہونے میں کچھ کلام نہیں۔ ایک زبان کے معانی و مطالب کو بعینہ دوسری زبان میں ایسے منتقل کرنا کہ زبان کا آہنگ و اسلوب، لب و لہجہ، لفظوں کے ظاہری مفاہیم کے ساتھ ساتھ ان کے پیچھے چھپی جملہ کیفیات پوری طرح سے دوسری زبان میں منتقل ہو جائیں اگر ناممکن نہیں تو نہایت مشکل عمل ضرور ہے۔ طبع زاد کے مقابلے میں ترجمے کی ثانوی یا کم تر حیثیت کی بحثوں سے قطع نظر ترجمہ کاری کے ایک مشکل اور ادا فن ہونے کے بارے میں محققین اور نقاد ہمیشہ سے ہم آواز رہے ہیں جیسے ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

"ترجمے کا کام یقیناً ایک مشکل کام ہے اس میں مترجم، مصنف کی شخصیت، فکر و اسلوب سے بندھا ہوتا

ہے۔ ایک طرف اس زبان کا کلچر، جس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے، اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسری طرف

اس زبان کا کلچر، جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے، یہ دوئی خود مترجم کی شخصیت کو توڑ دیتی ہے۔" (۱)

ادبی تراجم کی پیچیدگیاں تو مسلم ہیں لیکن غیر ادبی تراجم جیسے صحافتی و فنی تراجم میں بھی اکثر مترجمین کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پروفیسر مسکین جازی اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"علمی ادبی اور فنی مواد کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا خاصا دشوار کام ہے، یہ کام وہی شخص صحیح طور پر کر سکتا ہے جو متعلقہ علم، صنفِ ادب یا فن کا ماہر ہونے کے علاوہ دونوں زبانوں پر مکمل طور پر قادر ہو۔" (۲)

انسانوں کی طرح دنیا کی ہر زبان بھی اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتی ہے اور اس مزاج کی تشکیل میں اس علاقے کی آب و ہوا، تہذیب و ثقافت اور اس کے بولنے اور برتنے والوں کا اندازِ فکر بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ زبان الفاظ اور جملوں کا ایک بے جان مرکب نہیں ہوتی بلکہ یہ انسانوں کی طرح اپنا ایک جینیاتی، حسی، عقلی اور جذباتی وجود رکھتی ہے۔ زبانوں کے درمیان مزاج کے کچھ پہلوؤں کی یکسانیت یا اختلاف کی بنیاد ان کی آپس کی رشتہ داریاں ہیں یعنی اگر دو زبانوں کا جدا جدا ایک ہی تھا تو ان کی رگوں میں دوڑنے والے لہو کی ساخت اور ان کے جینیاتی ڈھانچوں کی پرداخت میں بہت سے اشتراکات پائے جائیں گے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی کچھ زبانوں کے مزاج میں کسی حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے اس لیے ہر زبان کی انفرادیت کے باوجود ایسی زبانوں کے مابین ترجمے کا عمل کسی قدر آسان ہے۔ جیسے اردو و فارسی اور اردو و ہندی کے درمیان جو نسبی تعلقات ہیں ان کی بنا پر ان زبانوں کا آپسی ترجمہ اس حد تک پیچیدہ عمل نہیں ہو گا جیسے اردو اور چینی کے درمیان یا اردو اور کورین زبان کے درمیان ترجمہ ایک مشکل عمل ہو گا۔

زبانوں کے درمیان اجنبیت کا یہ مسئلہ اردو اور انگریزی کے درمیان بھی حائل ہے۔ اگرچہ گزشتہ تین صدیوں سے انگریزی برصغیر پاک و ہند کے سیاسی، معاشی اور سماجی معاملات میں کسی نہ کسی طرح سے دخیل رہ کر ہمارے لیے بذاتِ خود کوئی اجنبی زبان نہیں رہی لیکن انگریزی کے یہاں کی مقامی زبانوں سے اس اختلاط کے باوجود اس کے مزاج اور آہنگ میں موجود اجنبیت بدستور قائم و دائم ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انگریزی کے ادبی متن کو اردو میں منتقل کرنے کی جتنی بھی کاوشیں کی گئی ہیں ان کو دو بنیادی مسائل سے پالا پڑا ہے۔ اول اگر مترجم نے متن سے کلی طور پر وفادار رہ کر ترجمہ کرنے کی کوشش کی تو ترجمے کے اندر ایک غیریت، ایک کھر دراپن اور ایک طرح کی انگریزیت در آئی ہے یعنی ایسے تراجم میں اردو زبان کی چاشنی کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہیں۔ دوم اگر مترجم نے انگریزی متن کو اردو میں ڈھالتے ہوئے آزادہ روی برتی تو اس کے ترجمے میں اردو زبان کی مخصوص حلاوت تو موجود

ہے لیکن اصل متن کے اسلوب و آہنگ کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہیں یعنی اس کا ترجمہ ترجمہ نہیں رہا بلکہ ایک ایسی طبع زاد تحریر بن کر رہ گیا ہے جس کا محض خیال انگریزی سے ماخوذ ہو۔ انتظار حسین نے اپنے ایک کالم میں اسی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کہیں متن سے اتنی شدت سے وفاداری برتی گئی ہے کہ متن منہ تکتا رہ جاتا ہے کہ میرے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ کہیں متن کو روانی کے شوق میں اس طرح نظر انداز کیا گیا ہے کہ متن کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کدھر گیا۔ آخر اس کی اپنی بھی کوئی قدر و قیمت تھی۔" (۳)

زیر نظر افسانوی مجموعے کو اردو میں ڈھالتے ہوئے انہی دو پیچیدگیوں سے نبرد آزما ہونے کی کاوش کی گئی ہے۔ کسی بھی متن کا ترجمہ کرتے ہوئے ان دو گنجلک مسائل کے علاوہ مترجم کو کچھ بنیادی سوالوں کے جواب بھی تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم یہ کہ ترجمہ کرتے ہوئے کون سی تکنیک استعمال کی جائے۔ لفظی، بالمحاورہ، آزاد اور توضیحی وغیرہ میں سے کس طریقہ کار کو اختیار کیا جائے کہ متن اصل زبان (Source language) سے اپنے پورے آہنگ و اسلوب کے ساتھ ہدفی زبان (Target language) میں ڈھل جائے۔ یہ فیصلہ کرنے میں جہاں متن کی قسم اہم کردار ادا کرتی ہے وہیں مترجم کا مزاج بھی اس فیصلے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ علمی، سائنسی، مذہبی، صحافتی، قانونی اور ادبی وغیرہ متون کے لیے جدا جدا تکنیکوں کا استعمال کیا جانا گزیر ہے کیونکہ ہم ہر قسم کے متن کے لیے کوئی ایک مخصوص تکنیک استعمال نہیں کر سکتے۔ اس فیصلے پر پہنچنے سے پہلے کہ کون سی تکنیک استعمال کی جائے تمام مروجہ تکنیکوں پر ایک طائرانہ نظر ضروری ہے۔

لفظی ترجمہ میں مترجم کے پیش نظر عبارت کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ دوسری زبان میں کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی لفظ چھوٹے نہ پائے۔ زیادہ تر مذہبی متون میں یہی تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ جیسے قرآن کریم کے ابتدائی تراجم لفظی ترجمے کی بہترین مثال ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے قرآن کے لفظی تراجم کے بارے میں لکھا ہے: "اول اول یہ طریقہ تھا کہ اصل جو لفظ ہوتا تھا اس کے ہم معنی الفاظ کو ڈھونڈ کر لفظی ترجمہ کرتے جاتے تھے۔" (۴) مذہبی تراجم کے علاوہ علمی تراجم کرتے ہوئے بھی عام طور پر لفظی ترجمہ کی تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

"علمی ترجمہ عام طور پر لفظی ترجمہ کی ذیل میں آتا ہے۔ اس میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ جس

لفظ یا اصطلاح کا جو ترجمہ ایک جگہ کیا جاتا ہے وہ ان معنوں میں ہر جگہ استعمال کیا جائے تاکہ ترجمہ کی

یکسانیت برقرار رہے اور قاری کا ذہن کہیں الجھنے نہ پائے۔" (۵)

لفظی ترجمہ کرتے ہوئے مترجم عبارت کی ظاہری ہیئت اور اصلی معنویت کو جوں کا توں برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں بعض دفعہ اس کا ترجمہ محض الفاظ کا ایک بے رنگ مرکب بن کر رہ جاتا ہے۔ لفظی ترجمے میں لفظ کے متبادل لفظ رکھتے ہوئے یہ مشکل بھی اکثر پیش آتی ہے کہ ایک زبان میں موجود بہت سے الفاظ کے لیے دوسری زبان میں وہی معنی و مفہوم رکھنے والے الفاظ موجود نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہاں مترجم کو خاصی ذہنی ورزش کرنا پڑتی ہے۔ ادبی متون چونکہ تہہ در تہہ معنویت کے حامل ہوتے ہیں اس لیے ان کا لفظی ترجمہ ناممکنات میں شامل ہے اسی لیے ادبی متن کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم عموماً اس راہ سے کتراتے ہیں۔ نثار احمد قریشی نے اپنی کتاب "ترجمہ: روایت اور فن" میں ترجمے کو دو حصوں الفاظ اور عبارت کے ترجمے کا نام دیا ہے۔ الفاظ کے ترجمے کے لیے درست، عام فہم اور سبک و خوبصورت کی شرائط عائد کرنے کے بعد عبارت کے ترجمے کے ذیل میں وہ کہتے ہیں:

"الفاظ کا ترجمہ کرنا بھی نسبتاً آسان ہے لیکن عبارت کا ترجمہ کرنا اکثر مشکل ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں دو متضاد تقاضوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک طرف تو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہو، اصل عبارت کا محض لب لباب یا تبصرہ نہ ہو اور دوسری طرف ترجمے کی زبان کا محاورہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ہر زبان میں مخصوص اسالیب ہوتے ہیں جن کا لفظی ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں یا تو ترجمے کی زبان کا کوئی ایسا اسلوب اظہار یا محاورہ تلاش کرنا پڑتا ہے جو اصل کا لفظی ترجمہ نہ ہو بلکہ اس کے مرکزی خیال کو ادا کرتا ہو۔ یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر ترجمے میں جملے کی ساخت حسب ضرورت تبدیل کرنی پڑتی ہے یا الفاظ گھٹانے بڑھانے پڑتے ہیں تاکہ مطلب حتی الامکان صفائی اور محاورے کے ساتھ ادا ہو جائے۔" (۹)

جہاں لفظی ترجمہ بے سود ثابت ہو وہاں با محاورہ ترجمہ مترجم کے لیے کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ ہر زبان کا روزمرہ اور محاورہ دوسری زبان سے جدا ہوتا ہے۔ اس لیے مترجم عبارت کا ترجمہ کرتے ہوئے اپنی زبان کے متبادل محاورات استعمال کرتا ہے جس سے عبارت کی اصل معنویت بھی برقرار رہتی ہے اور ترجمے میں روکھاپن بھی نہیں آتا۔ اگرچہ یہاں بھی بعض دفعہ اصل عبارت کے متبادل محاورات دستیاب نہیں ہوتے اس لیے بہت سے مقامات پر مترجم کو گریز پائی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ لفظی ترجمے کے مقابلے میں یہ نسبتاً ایک پیچیدہ راستہ ہے لیکن با محاورہ ترجمے میں نامانوسیت کا وہ احساس کہیں دکھائی نہیں دیتا جو لفظی ترجمے کا بڑا نقص ہے۔ ادبی متون کے ترجمے میں با محاورہ ترجمے کا طریقہ بھی رائج ہے لیکن یہ آزاد ترجمے کی نسبت کم برتا گیا ہے کیونکہ کلی طور پر با محاورہ ترجمے کی تکنیک کو استعمال کرنا بھی نہایت مشکل عمل ہے۔

ادبی متون کا ترجمہ کرتے ہوئے سب سے زیادہ استعمال ہونے والی ٹیکنیک آزاد ترجمہ ہے۔ مترجم یہاں اصل عبارت کا نچوڑ یا مفہوم اپنے الفاظ اور انداز میں بیان کرتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اصل متن کا نفس مضمون مجروح نہ ہو۔ آزاد ترجمے میں مترجم کو بہت سی آزادیاں حاصل ہوتی ہیں۔ وہ جملوں یا مصرعوں کی ترتیب میں الٹ پھیر کا مجاز ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایک الگ بحث ہے کہ لفظ آزاد کا ہر مترجم کیا معنی اخذ کرتا ہے؟ اس کے دماغ میں آزادی کا کیا مفہوم اور اس کی کیا حدود و قیود ہیں؟ کیا آزاد ترجمہ کرتے ہوئے مترجم اصل عبارت میں کمی بیشی کر سکتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ آزاد ترجمے سے ہی منسلک ایک اور قسم کو ہم توضیحی یا تفسیری ترجمہ کہہ سکتے ہیں جس میں مترجم اصل متن کے کچھ الفاظ، خیالات یا افکار وغیرہ کی اپنے ترجمے میں وضاحت ضروری سمجھتا ہے۔ بعض اوقات ایک زبان کا کوئی لفظ اپنے اندر معنی و مفہوم یا خیالات و افکار کی جو گہرائی سموئے ہوئے ہوتا ہے دوسری زبان کا متبادل لفظ وہ معنی اپنے اندر نہیں رکھتا اس لیے مترجم کو اس خامی پر قابو پانے کے لیے توضیح و تشریح کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فاخرہ نورین لکھتی ہیں:

"متن کے ترجمے میں وضاحت سے مراد یہ ہے کہ یہ کسی فن پارے کو ترجمہ کرتے ہوئے اس میں موجود ابہام یا غیر واضح کو واضح بنانے کا رجحان۔ کسی بھی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ہونے والے فن پارے کا ایک مقصد ہدفی زبان کے قاری کے لیے قابل فہم ہونا بھی ہے لہذا اس میں کوئی حرج نہیں کہ مترجم مبہم کو غیر مبہم کرے بلکہ یہ ترجمہ کا حسن ہے۔" (۷)

افسانوی مجموعے Interpreter of Maladies کا ترجمہ کرتے وقت ترجمہ کاری کی ان مروجہ ٹیکنیکوں کا جائزہ لینے کے بعد با محاورہ یا ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے الفاظ میں معتدل ترجمے کی ٹیکنیک کو اختیار کیا گیا گو متعدد مقامات پر محض اس ٹیکنیک پر انحصار کو ناکافی سمجھتے ہوئے آزاد ترجمے کی ٹیکنیک سے بھی کام لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر انصاری لکھتے ہیں:

"ترجمہ کی تین راہیں ہیں۔ ایک لفظی ترجمہ، دوسرا آزاد ترجمہ اور تیسرا ان دونوں کے درمیان کا ترجمہ۔ اس تیسرے یا اعتدال کے ترجمے کو ہم تخلیقی ترجمہ بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ جب ترجمے کی تمام شرائط پوری ہوتی ہیں تو وہ صرف تقلید بالکل نہیں رہ جاتا بلکہ اس میں ایک ایسا فنی حسن ابھرتا ہے جو اصل کو پوری طرح ہضم کر کے اس نئے وجود کے ساتھ زیب و زینت بخشنے کے برابر ہے اور اس طرح بجائے خود تخلیق کے ہم وزن شمار ہونے کے قابل ہے۔" (۸)

اس درمیان کے یا با محاورہ ترجمے کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے ادبی متن کے ذیل میں کچھ شرائط عائد کی ہیں:

"اس نوع کے ترجمے کے لیے ضروری ہے کہ بامحاورہ کیا جائے اور اپنی زبان کے روزمرہ، تشبیہات، ضرب الامثال، استعارات و کنایات اور رموز و علامات سے کام لیا جائے تاکہ ترجمے میں ادبی رنگ آ جائے اور ترجمہ طبع زاد سے کم تر دکھائی نہ دے۔" (۹)

اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے کوشش کی گئی ہے کہ متن سے کلی طور پر وفادار رہتے ہوئے اور افسانہ نگار کے اسلوب کی مکمل پیروی کرتے ہوئے ان افسانوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا جائے۔ اسلوب کی پیروی اس لیے بھی ضروری ہے کہ کسی بھی ادب پارے کا وصف امتیازی اس کا اسلوب ہوتا ہے۔ علمی یا صحافتی ترجمے کے برعکس جہاں خیال کی ترسیل زیادہ اہم ہوتی ہے ادبی ترجمہ اپنے اسلوب سے جدا ہو کر بے معنی ہو جاتا ہے۔ ظہیر احمد اسی ضمن میں رقمطراز ہیں:

"علمی ترجمے اور ادبی ترجمے میں سب سے بڑا فرق ہی یہی ہوتا ہے کہ علمی ترجمے میں سارا زور تصور و خیال کی ترسیل پر ہوتا ہے اس میں اسلوب بیان پر زیادہ توجہ نہیں ہوتی جب کہ ادبی ترجمے میں سارا زور تہذیبی سانچے اور تمدنی فضا کی منتقلی پر ہوتا ہے۔ یہاں خیال کے ساتھ اسلوب بھی اہم ہے یعنی ترجمہ شدہ متن میں ادبی اثر آفرینی کا ہونا ضروری ہے۔" (۱۰)

علمی اور ادبی ترجمے میں فرق کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے بھی کچھ اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے۔ علمی ترجمے میں اصطلاحات کے ترجمے کو سب سے بڑی مشکل قرار دینے کے بعد وہ ادبی ترجمے کے چیلنجز کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"افسانوں ادب کے ترجمے کی بات اور ہے۔ ایسی صورت میں دو تہذیبیں ایک دوسرے کے مقابل ہوتی ہیں۔ ایک تہذیبی سانچے کو دوسرے تہذیبی سانچے میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ ویسے تو ہر زبان کا ہر لفظ اپنی تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے۔ لفظوں کو آپس میں جوڑنے سے جملے کی ساخت بنتی ہے۔ ہر جملے کا ایک آہنگ ہوتا ہے۔ پھر جملے آپس میں مل کر اسلوب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ پورے افسانے یا ناول میں ایک فضا کی تعمیر ہوتی ہے۔ لہذا افسانوی ادب کے ترجموں میں ترجمہ محض لفظ کا نہیں ہوتا۔ جملوں کی ساخت اور آہنگ نیز اسلوب کی نیت کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے اور اسے بھی اپنی زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔" (۱۱)

زیر نظر افسانوی مجموعے میں درج بالا تمام اصولوں، نظریات، شرائط اور افکار کو مد نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ بعض صورتوں میں ایک سے زائد تکنیکوں کا استعمال کر کے اسلوب کے آہنگ کو برقرار رکھنے کی

کوشش کی گئی ہے۔ متعدد مقامات پر ایک ہی پیرا گراف میں کہیں لفظی ترجمے سے کام لیا گیا ہے، کہیں بامحاورہ ترجمے پر انحصار کیا گیا ہے اور کہیں آزاد ترجمے کی تکنیک سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ جھپٹا لہری نے اپنے افسانوں میں جو فضا تشکیل دی بعینہ وہی فضا اردو ترجمہ کرتے ہوئے بھی برقرار رکھی جائے۔ افسانوں میں مصنفہ نے جن جن مقامات پر غم یا خوشی کی جن کیفیات کو اپنے قارئین تک پہنچایا اردو ترجمے میں انہی مقامات پر ویسی ہی کیفیات پیدا کرنے کی کاوش بھی کی گئی ہے۔ متن سے اس حد تک وفاداری برتی گئی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو کوئی ایک جملہ بھی چھوٹے نہ پائے لیکن اس امر کا خیال بھی رکھا گیا ہے کہ متن سے وفاداری پر زبان کی روانی کو قربان نہ کیا جائے۔ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ ترجمہ کہیں ادق نہ ہو اور اس میں کھر دراپن یا بے رنگی نہ آنے پائے اور اردو زبان کی چاشنی بہر صورت موجود رہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلپیٹ تک، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع ہفتم، ۲۰۰۳ء، ص ۱۳
- ۲۔ مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، صحافتی زبان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۷۳
- ۳۔ انتظار حسین، اردو میں ترجمہ کے مسائل (کالم) مشمولہ روزنامہ ایکسپرس، کراچی، ۵ اکتوبر ۲۰۱۵ء
- ۴۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی، جلد ششم، مرتبہ مولوی مسعود علی، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۳۶ء، ص ۴۰
- ۵۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، ترجمہ کافن اور روایت، تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی، بار اول، جون ۱۹۷۶ء، ص ۷۰
- ۶۔ ثار احمد قریشی، ترجمہ: روایت اور فن، نظر ثانی محمد شریف کنجاہی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۶۰
- ۷۔ فاخرہ نورین، ڈاکٹر، ترجمہ کاری، ادارہ تحقیقات اردو، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۶۳
- ۸۔ ظ۔ انصاری، ڈاکٹر، ترجمے کے بنیادی مسائل (مضمون)، مشمولہ فن ترجمہ نگاری، مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند، طبع سوم، ۱۹۹۶ء، ص ۱۰۷-۱۰۸
- ۹۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، مغرب سے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۴۴
- ۱۰۔ ظہیر رحمتی، ادبی ترجمے کی روایت اور مسائل (مضمون) مشمولہ ترجمے کے فنی اور عملی مباحث، مرتبہ مشاورتی کمیٹی، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نیو دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۱۴۹
- ۱۱۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، افسانوی ادب کے تراجم۔ مسائل اور مشکلات (مقالہ) مشمولہ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل (ردواد سیمینار) مرتبہ اعجاز راہی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۹

باب دوم

Interpreter of maladies کے افسانوں کا با محاورہ ترجمہ

افسانوی مجموعے کا مکمل عنوان:

Interpreter of maladies
Stories of Bengal, Boston and beyond

Jhumpa Lahiri

دکھوں کا ترجمان
بنگلہ، بوسٹن اور بے گھری کی کہانیاں
جھمپا لہری

تعطل

انہیں ایک نوٹس کے ذریعے پتہ چلا کہ یہ ایک عارضی تعطل ہے۔ روزانہ شام کو آٹھ بجے ایک گھنٹے کے لیے بجلی کو بند ہونا تھا اور یہ سلسلہ آنے والے پانچ دنوں تک جاری رہتا۔ حالیہ دنوں میں آنے والے برف کے طوفان میں بجلی کی ایک بڑی لائن خراب ہو گئی تھی اور لائن میں اب نسبتاً معتدل موسم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی مرمت کا کام شروع کرنے والے تھے۔ بجلی کے اس عارضی تعطل سے صرف اس گلی کے گھر متاثر ہو رہے تھے جہاں شوبھا اور شوکار پچھلے تین سال سے رہ رہے تھے۔ مارکیٹ سے صرف چند گز کے فاصلے پر واقع یہ ایک سنسان گلی تھی جس کے کناروں پر درختوں کی ایک طویل قطار دور تک چلی گئی تھی۔

"انہوں نے یہ کام اچھا کیا ہے کہ ہمیں پہلے سے ہی اطلاع دے دی" شوبھانے اونچی آواز میں نوٹس پڑھنے کے بعد کہا۔ یوں لگا جیسے وہ شوکار سے زیادہ خود سے مخاطب ہو۔ اس نے فائلوں سے اٹے ہوئے اپنے چرمی بیگ کو کندھوں سے لڑھکا کر داخلی دروازے کے ساتھ ہی رکھ دیا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ شوبھانے ڈھیلے ڈھالے سرمئی ٹراؤزر پر گہرے نیلے رنگ کا برساتی کوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے پاؤں میں سفید جاگنگ شوز تھے۔ نوجوانی میں وہ جس طرح کی عورت نہ بننے کا دعویٰ کیا کرتی تھی تینتیس سال کی عمر میں ہی وہ بالکل ویسی بن چکی تھی۔

وہ ابھی ابھی جم سے لوٹی تھی۔ عنابی رنگ کی لپ سٹک اب صرف اس کے ہونٹوں کے کناروں پہ جمی رہ گئی تھی اور آئی لائیز نے پھیل کر اس کی پلکوں کے نیچے سیاہ داغ چھوڑ دیے تھے۔ شوکار نے اسے دیکھ کر سوچا کہ اب وہ کبھی کبھار ہی ایسی دکھائی دیتی ہے۔ خاص طور پر ان صبحوں میں جب وہ کسی پارٹی سے یا میخانے سے تھک ہار کر لوٹی اور اس میں موندھونے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی اور وہ اس کی بانہوں میں گر کر مدہوش ہو جاتی تھی۔

شوبھانے ڈاک میں آئے لفافوں کے بنڈل کو بے دھیانی سے میز پر رکھ دیا۔ اس کی نگاہیں ابھی تک اس نوٹس پر مرکوز تھیں "ویسے ان لوگوں کو اس طرح کے کام دن کو کرنے چاہئیں!"

"مطلب جب میں گھر میں ہوتا ہوں؟" شوکار نے جواب دیا۔ اس نے چولھے پہ چڑھے دنبے کے گوشت کے سالن پر سے ڈھکن تھوڑا سا سر کا دیا تاکہ اس میں سے کچھ بھاپ نکلتی رہے۔ اس سال جنوری سے ہی وہ گھر پر رہ کر ہندوستان میں کسانوں کی تحریکوں پر اپنے مقالے کے آخری ابواب مکمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تاروں کی مرمت کا کام کب شروع ہونے والا ہے؟" شوکار نے پوچھا۔

"اس پہ لکھا ہے مارچ انیس! کیا آج مارچ کی انیس ہے؟" یہ کہتے ہوئے شوبھا فریج کے ساتھ دیوار پر ایستادہ اس فریم

شدہ کارک بورڈ کی طرف بڑھی جس پر ولیم مورس^۲ کے ڈیزائن کیے ہوئے وال پیپر سے مزین اکیلا کلینڈر ٹنگا ہوا تھا۔ اس نے کلینڈر پر یوں نگاہ دوڑائی جیسے اسے پہلی دفعہ دیکھ رہی ہو۔ کلینڈر کے اوپری حصے پر بنے وال پیپر کے نقش و نگار کو غور سے دیکھتے دیکھتے اس کی نگاہیں نچلے حصے پر تاربخوں کی قطار پر آکر ٹک گئیں۔ یہ کلینڈر ان کے ایک دوست نے کرسمس کے موقع پر انہیں ڈاک کے ذریعے بطور تحفہ بھیجا تھا یہ الگ بات ہے کہ شو بھا اور شو کو مار نے اس سال کرسمس نہیں منائی تھی۔

"اس کا مطلب ہے بجلی کی تاروں کی مرمت کا کام آج شروع ہو رہا ہے۔" شو بھانے گویا اعلان کیا۔ "ویسے اگلے جمعہ کو تمہاری دانتوں کے ڈاکٹر کے ساتھ اپائنٹمنٹ بھی ہے۔"

شو کو مار نے یہ سن کر دانتوں پر اپنی زبان پھیری۔ وہ صبح دانت برش کرنا بھول گیا تھا اور ایسا پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا۔ وہ سارا دن گھر سے باہر نہیں گیا تھا اور گزشتہ روز بھی یوں ہی گزرا تھا۔ جتنا شو بھا اپنے کام کے سلسلے میں گھر سے زیادہ باہر رہتی اور نئے سے نئے پراجیکٹس لیتی اتنا ہی شو کو مار گھر میں گویا گوشہ نشین ہوتا جا رہا تھا۔ وہ گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے بھی گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہ کرتا۔ اس نے دروازے سے ڈاک اٹھانا اور دکان سے پھل اور وائن تک لانی چھوڑ دی تھی۔

چھ ماہ قبل، ستمبر کے مہینے میں جب شو بھا کو درد نہ اٹھا اور اسے بچے کی پیدائش کی متوقع تاریخ سے تین ہفتے قبل ہی ہسپتال داخل ہونا پڑا تو شو کو مار اس سے دور بالٹی مور^۳ میں ایک اکیڈمک کانفرنس میں شریک تھا۔ وہ شو بھا کی حالت کے پیش نظر اسے چھوڑ کر اس کانفرنس میں نہیں جانا چاہتا تھا لیکن شو بھانے ہی اسے زبردستی اس خیال سے بھیجا تھا کہ وہ اگلے سال ملازمت کے لیے قسمت آزمائی کرنے والا تھا اور اس موقع پر اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اہم لوگوں سے تعلقات بنائے۔ شو بھانے اسے یہ کہہ کر تسلی دی تھی کہ اس نے شو کو مار کے فلائیٹ نمبر، کانفرنس شیڈول اور اس ہوٹل کا فون نمبر اپنے پاس لکھ لیا تھا جس میں وہ قیام کرنے والا تھا۔ شو بھانے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں اس نے اپنی دوست جلیسن کو اپنے ساتھ ہسپتال جانے کے لیے کہہ رکھا تھا۔ اس صبح جب شو کو مار ٹیکسی میں ایئر پورٹ جانے کے لیے روانہ ہوا تو شو بھانے دروازے میں کھڑے ہو کر اسے الوداع کہا تھا۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ ایک ہاتھ ہلا کر الوداع کہتے ہوئے اس نے دوسرا ہاتھ اپنے پیٹ کے ابھار پر یوں رکھا ہوا تھا جیسے یہ اس کے جسم کا کوئی فطری حصہ ہو۔

اب شو کو مار اس لمحے کو یاد کرتا جب اس نے شو بھا کو آخری بار اس حالت میں دیکھا تھا کہ وہ ماں بننے والی تھی تو اس کے دماغ کے پردے پر اس ٹیکسی کی تصویر ابھرتی جس میں سوار ہو کر وہ ایئر پورٹ تک گیا تھا۔ یہ ایک سرخ رنگ کی

اسٹیشن ویگن تھی جس پر نیلے رنگ سے لکھائی کی گئی تھی۔ یہ گاڑی ان کی اپنے گاڑی کے مقابلے میں بہت لمبی چوڑی تھی۔ اگرچہ شو کو مار چھ فٹا جوان تھا جس کے بازو اتنے لمبے تھے کہ وہ کبھی اپنے جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اطمینان سے کھڑا نہ ہو سکتا تھا لیکن اس اسٹیشن ویگن کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے خود کو بونا محسوس کیا۔ جب گاڑی لیکن سٹریٹ پر دوڑ رہی تھی تو شو کو مار سوچ رہا تھا کہ بچوں کو موسیقی کی کلاسوں اور ڈاکٹر کو دکھانے لانے لے جانے کے لیے ایک دن انہیں بھی ایسی ہی ایک اسٹیشن ویگن خریدنی پڑے گی۔ خیالوں کی رو میں وہ خود کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا محسوس کرتا اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی شو بھا پیچھے مڑ کو بچوں کو جو س کے ڈبے پکڑاتی۔ اولاد سے منسوب ایسی خوشیوں کا خیال کبھی اسے خوفزدہ کرتا تھا اور اس کی تشویش کو دوچند کر دیتا کیونکہ پینتیس سال کی عمر ہونے کے باوجود وہ ابھی تک طالب علم تھا۔ لیکن اوائل خزاں کی اُس صبح کو جب درخت ابھی زرد پتوں سے لبریز تھے اس نے پہلی دفعہ باپ بننے کے تصور کو خوش آمدید کہا تھا۔

اس دن کنونشن سنٹر کے ایک ہی جیسے دکھائی دینے والوں کمروں میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر جب ایک سٹاف ممبر نے شو کو مار کو گتے کا ایک چھوٹا سا چوکور ٹکڑا اٹھایا جس پر محض ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا تو شو کو مار غیر محسوس طور پر جانتا تھا کہ یہ اسپتال کا نمبر ہے۔ جب وہ بوسٹن واپس پہنچا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ بچہ مردہ پیدا ہوا تھا۔ شو بھا اسپتال کے ایک چھوٹے سے پرائیویٹ کمرے میں بستر پر دراز سو رہی تھی۔ یہ کمرہ اتنا چھوٹا تھا کہ شو بھا کے بستر کے پاس کھڑے ہونے کے لیے بہ مشکل جگہ بچتی تھی۔ اسپتال کے جس حصے میں یہ کمرہ واقع تھا وہ شو کو مار نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ اس سے پہلے جب وہ اور شو بھا ڈاکٹر کو دکھانے آتے تو اس طرف کبھی ان کا گزر نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ پیٹ میں بچے کو خون کی فراہمی معطل ہونے کے سبب انہیں شو بھا کا آپریشن کرنا پڑا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر ایک ہمدردانہ مسکراہٹ سجا کر شو کو مار کو تسلی دی کہ حمل میں اس طرح کے مسائل آتے رہتے ہیں، شو بھا چند ہفتوں میں ٹھیک ہو کر چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گی اور ایسی کوئی پیچیدگی نہیں تھی کہ وہ دوبارہ ماں نہیں بن سکتی۔

آج کل جب بھی شو کو مار کی آنکھ کھلتی شو بھا اپنے آفس جاچکی ہوتی تھی۔ وہ تکیے پر بکھرے شو بھا کے گرے بالوں کو دیکھ کر اس کے بارے میں سوچنے لگتا۔ وہ تصور میں شو بھا کو اس کے آفس میں کافی کا تیسرا کپ پیتے ہوئے ٹیکسٹ بکس میں سے ٹائپنگ کی غلطیوں کی نشاندہی رنگ برنگی پنسلوں کے ذریعے کرتے ہوئے دیکھتا۔ شو بھا نے اسے بتایا تھا کہ ٹائپنگ کی غلطیوں کی نشاندہی اور انہیں درست کرنے کے لیے مختلف رنگ کی پنسلوں کے ذریعے کوڈنگ کرنے کا یہ ایک منفرد طریقہ تھا۔ اس نے شو کو مار کو یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ جب اس کا مقالہ مکمل ہو جائے گا تو وہ اس کی غلطیوں کی نشاندہی بھی اسی طرح سے کر دے گی۔ وہ شو بھا کے کام پر اس لیے رشک کرتا تھا کہ اُس کا کام بالکل واضح اور غیر

مبہم تھا جب کہ شوکومار کو اپنے مقالے کی تکمیل کے لیے بہت سی مبہم اور ان دیکھی راہوں سے گزرنا تھا۔ شوکومار ہمیشہ سے ہی ایک متوسط درجے کا طالب علم رہا تھا اور اس قسم کے طالب علموں کی طرح وہ بھی کسی نکتے کی متجسسانہ کھوج کیے بغیر اس سے متعلقہ تمام تفصیلات کو رٹ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ستمبر کے مہینے تک وہ اپنے کام میں بظاہر پوری تک منہمک رہا تھا۔ وہ اپنے مقالے کے ابواب کی تلخیص کرتا اور مباحث کو پیلی رنگ کی سطروں والے پیڈ پر لکھتا جاتا۔ لیکن اب وہ بدل چکا تھا۔ اب وہ بستر پر اس وقت تک پڑا رہتا جب تک بوریت اسے نہ آن گھیرتی۔ وہ دیر تک اس الماری کو تکتا رہتا جسے شوبھا اکثر ادھ کھلا چھوڑ جاتی تھی۔ اس الماری میں اس کی اوئی جیکٹیں اور پتلونیں ایک قطار میں ٹنگی ہوئی تھیں۔ اس سمسٹر پڑھانے کی اسائنمنٹ کے لیے اسے انہی میں سے انتخاب کر کے کچھ پہننا تھا۔ بچے کی موت کے بعد وہ پڑھانے کی ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہ تھا اس لیے اس کے سپروائزر نے اس کے لیے اگلے بہار کے سمسٹر تک چھوٹ حاصل کر لی تھی۔ ڈگری کے حصول کے لیے یہ شوکومار کا چھٹا سال تھا۔ اس کے سپروائزر کا خیال تھا کہ موسم گرما شوکومار کے لیے اچھا ثابت ہو گا اور وہ اگلے سال ستمبر تک اپنا کام نبٹالے گا لیکن شوکومار کے لیے کچھ بھی اچھا ثابت نہیں ہو رہا تھا۔

اپنے مقالے پر توجہ دینے کی بجائے اب وہ اکثر سوچتا رہتا کہ کیسے وہ اور شوبھا تین بیڈروم کے چھوٹے سے گھر میں ایک دوسرے کو نظر انداز کرنے کے فن میں ماہر ہو گئے تھے۔ جس قدر ممکن ہوتا وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت ایک دوسرے سے دور گزارتے۔ شوکومار سوچتا کہ اب وہ ان ویک اینڈز کا انتظار نہیں کرتا جب شوبھا اپنی رنگ برنگی پنسلیں اور فائلیں لے کر صوفے پر بیٹھی رہتی تھی اور وہ محض اس خیال سے اپنے ہی گھر میں ریکارڈ پر گانے لگانے سے ڈرتا تھا کہ کہیں شوبھا کی یکسوئی متاثر نہ ہو جائے۔ وہ سوچتا کہ ان لمحوں کو اب مدتیں بیت گئی تھیں جب شوبھا اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا دیتی تھی یا وہ اس کا نام سرگوشی میں لیتی اور وہ دونوں سونے سے پہلے ایک دوسرے میں کھو جاتے تھے۔

شروع میں اس کا خیال تھا کہ جذبات پر جے جمود کا یہ دورانیہ مختصر ہو گا اور وہ دونوں کسی نہ کسی طرح اس دور سے گزر جائیں گے۔ شوبھا ابھی محض تینتیس سال ہی کی تو تھی۔ وہ صحت مند تھی اور آپریشن کے بعد اب دوبارہ اپنے قدموں پہ کھڑی تھی۔ لیکن یہ تشفی بھی اسے سکون نہ دیتی۔ شوکومار اکثر دوپہر کے کھانے تک خود کو جیسے تیسے بستر سے نکالتا اور نگلی منزل پہ جا کے کچن میں کافی کے برتن سے شوبھا کی بنائی ہوئی کافی اس مگ میں انڈیلتا جو وہ اس کے لیے دھو کر شیف پہ رکھ جایا کرتی تھی۔

آج کا دن بھی ایسا ہی بے کیف تھا۔ شوکومار نے پیاز کے چھلکے اکٹھے کر کے کوڑے کی ٹوکری میں ڈالے جس میں چربی

کی تہیں پہلے سے پڑی تھیں جو اس نے دنبے کے گوشت سے اتاری تھیں۔ اس نے سنک میں چھری اور کلنگ بورڈ دھونے کے بعد اپنی انگلیوں کے سروں پر کٹا ہوا لیموں رگڑا تا کہ لہسن کی بو جاتی رہے۔ یہ وہ ٹوکا تھا جو اس نے شوبھا سے سیکھا تھا۔

اب ساڑھے سات بج چکے تھے۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر آسمان پہ نگاہ دوڑائی۔ آسمان نرم سیاہ تارکول کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ موسم اب اتنا معتدل ہو چکا تھا کہ لوگ بغیر دستانے اور ٹوپی اوڑھے گھروں سے باہر نکل سکتے تھے لیکن راستوں کے کناروں پر ابھی تک برف جمی ہوئی تھی۔ اس سال برف کے طوفان میں تین فٹ تک برف پڑی تھی اور لوگوں کو ایک ہفتے تک گلیوں میں برف کے درمیان بنائے گئے خندق نما تنگ رستوں سے گزرنا پڑا تھا۔ شوکومار کو تو گویا گھر سے باہر نہ نکلنے کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ لیکن اب برف کم ہونے سے یہ تنگ رستے کھلے ہوتے جارہے تھے اور بر فیلا پانی گلیوں کے کناروں پہ لوہے کی جالیوں میں زیر زمین گم ہوتا جا رہا تھا۔

"سالن آٹھ بجے تک تیار نہیں ہو پائے گا، ہمیں شاید اندھیرے میں ہی کھانا کھانا پڑے۔" شوکومار نے کہا۔

"ہم موم بتیاں جلا لیں گے۔" شوبھانے تجویز دیتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے اپنے بال جو نہایت نفاست کے ساتھ جوڑے کی شکل میں سارا دن باندھ رکھے تھے کھول دیے اور جوتوں کے تسمے کھولے بغیر ان کو کھینچ کے اتار دیا۔

"میں بجلی جانے سے پہلے ذرا نہالوں۔" وہ یہ کہتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔

"میں نیچے ہی رہوں گا۔" شوکومار نے اس کے بیگ اور جوتوں کو فریج کے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

شوبھا اس سے پہلے ایسا نہیں کرتی تھی۔ وہ جب بھی گھر لوٹتی اپنا کوٹ ہینگر پہ لٹکاتی اور اپنے جوتے الماری میں ترتیب سے رکھا کرتی تھی۔ وہ کوشش کرتی کہ جیسے ہی یوٹیلیٹی بل آئیں وہ انہیں ادا کر دے۔ لیکن اب وہ بدل چکی تھی۔ اب وہ اپنے گھر میں ایسے رہ رہی تھی جیسے ہوٹل میں ٹھہری ہو۔ اب اسے یہ خیال تنگ نہ کرتا تھا کہ لونگ روم میں پڑی آرام کرسی کے چھینٹ کا پیلا رنگ ترک قالین کے نیلے اور عنابی رنگ سے لگا نہیں کھاتا اور گھر کے پچھلے حصے میں برآمدے میں رکھے بید کی لکڑی سے بنے دیوان پہ وہ سفید رنگ کا بھڑکیلا تھیلا لیسوں سے لبریز ابھی تک پڑا تھا جن کے بارے میں کبھی شوبھا کی خواہش تھی کہ وہ ان سے پردے بنائے گی۔

جب شوبھانہار ہی تھی تو شوکومار نچلی منزل کے غسل خانے میں دانت صاف کرنے چلا گیا۔ سنک کے نیچے ڈبے میں ایک نیا دانتوں کا برش پڑا تھا۔ برش کے سخت ریشوں سے شوکومار کے مسوڑھے دکھنے لگے۔ اس نے جب واش بیسن میں کلی کی تو پیسٹ میں اس کا خون بھی شامل تھا۔ یہ سستی قسم کا وہ برش تھا جو شوبھاسیل سے اس خیال سے خرید لائی

تھی کہ گھر میں اگر کوئی مہمان رات ٹھہرنے کا پروگرام بنالے تو وہ استعمال کر لے گا۔ یہ چیز شو بھا کے مزاج کا حصہ تھی، وہ ہر اچھے برے وقت کے لیے خود کو پہلے سے تیار رکھتی تھی۔ اگر اسے کہیں کوئی اسکرٹ یا پرس پسند آ جاتا تو اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ دو دو خرید لے۔ اسے تنخواہ کے علاوہ جو بونس ملتے وہ انہیں اپنے نام پر کھلوائے گئے ایک الگ بینک اکاؤنٹ میں رکھتی تھی۔ شو کو مار کو شو بھا کی یہ عادتیں بری نہیں لگتی تھیں۔ باپ کی وفات کے بعد اس نے اپنی ماں کو بکھرتے دیکھا تھا۔ شوہر کے مرنے کے بعد وہ شو کو مار کو زمانے کے سردو گرم کا مقابلہ کرنے کے لیے تنہا چھوڑ کر واپس اپنے آبائی شہر کلکتہ چلی گئی تھی۔ اپنے ماضی کے تلخ تجربات کے سبب شو کو مار کو شو بھا کا اپنی ماں سے مختلف ہونا اچھا لگتا تھا۔ وہ کبھی کبھی حیران ہوتا کہ شو بھا کیسے مستقبل کی پیش بندی پہلے سے کر لیتی تھی۔ وہ جب بھی خریداری کر کے لوٹتی ان کے باورچی خانے کی الماری کھانا پکانے کے تیل کی بوتلوں سے تقریباً بھر جاتی تھی۔ شو بھا اطالوی اور ہندوستانی کھانوں کے لیے اولیو اور کارن آئل کی بوتلیں ذخیرہ کر کے رکھتی تھی۔ ان کے کچن کی الماریاں ہر سائز اور رنگ کے پاستا کے ڈبوں اور باسمنی چاولوں کے تھیلوں سے بھری رہتیں۔ دنبے اور بکرے کے گوشت کی کٹی ہوئی رانیں، جو وہ مسلمان قصابوں سے خرید کر لاتے تھے، بے شمار پلاسٹک کے لفافوں میں منجمد ان کے فریج میں پڑی رہتی تھیں۔ وہ ہر ایک ہفتے بعد سینچر کے دن خریداری کے لیے جاتے۔ شو کو مار شو بھا کے ساتھ اتنی دفعہ خریداری کے لیے رنگ برنگے اسٹالز کی ان بھول بھلیوں میں پھرتا تھا کہ اب اسے ازبر ہو چکا تھا کہ شو بھا کس اسٹال سے کیا چیز خریدتی ہے۔ ہجوم میں راستہ بناتی جب وہ اپنے مطلوبہ اسٹال تک پہنچتی اور ان دکاندار لڑکوں کے ساتھ چیزوں کی قیمتوں پر بحث کرتی جن کی میس بھی ابھی پوری طرح نہیں بھیگی تھیں تو شو کو مار متحیر اسے دیکھتا رہتا۔ یہ لڑکے سرمئی رنگ کے کاغذی لفافوں میں شو بھا کی مطلوبہ چیزوں کو بھی، آلو بخارے، ادرک اور شکر قندی وغیرہ کو مہارت سے باندھ کر ترازو پہ تولتے اور پھر ایک ایک کر کے شو بھا کی طرف اچھالتے جاتے۔ وہ خریداری میں اتنا منہمک ہوتی کہ اس دوران خریداروں کے ہجوم کے ہاتھوں پڑنے والے دھکے بھی اسے برے نہ لگتے۔ یہاں تک کہ جب وہ امید سے تھی تب بھی اس کا یہی معمول رہا۔ شو بھا دراز قامت اور چوڑے چکلے کندھوں والی بھرپور عورت تھی۔ اس کو اس کی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اس کے بھرے بھرے کو لہے بچہ پیدا کرنے میں اس کی مدد کرنے کے لیے ہی بنے ہیں۔ جب خریداری کر کے وہ گھر کی طرف روانہ ہوتے تو رستے میں چارلس اسٹریٹ کے موڑ مڑتے ہوئے وہ ہمیشہ اس بات پہ متعجب ہوتے تھے کہ انہوں نے کھانے کے لیے کتنا کچھ خرید لیا ہے!

لیکن کھانے کا یہ بے تحاشہ سامان کبھی ضائع نہ ہوتا۔ جب کبھی ان کے دوست ملنے آتے تو شو بھا ان کے لیے انہی فریزر میں رکھی بوتلوں، اپنے ہاتھ کے بنے اچاروں اور ان چٹنیوں کی مدد سے کھانا بناتی جو اس نے چھٹی کے دن

ٹماٹروں اور خشک آلو بخاروں کی مدد سے بنائی تھیں۔ مہمانوں کی آمد پہ اس کا آدھا دن کھانے بنانے میں گزر جاتا۔ ان کے باورچی خانے کی الماریاں شیشے کے لیبل کیے ہوئے مرتبانوں سے بھری ہوتی تھیں جن کے مونہ شو بھا نہایت احتیاط سے ایسے بند رکھتی کہ ان کے اندر موجود چیزیں کبھی خراب نہ ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ اشیاء ان کے پوتوں دوہتوں تک کے لیے کافی ہوں گی لیکن اب وہ یہ تمام ذخیرہ ختم کر چکے تھے۔ شو کو مار ایک ایک کر کے ان مرتبانوں کو خالی کرتا جا رہا تھا۔ وہ چاول کے تھیلوں میں سے کپ سے کپ کے چاول نکالتا اور گوشت کے پیکٹ کو فریج سے باہر نکال کے رکھتا تھا کہ اس پہ جمی برف پگھل جائے۔ پھر وہ شو بھا کی کھانا بنانے کی ترکیب کی کتاب کھنگالنے بیٹھ جاتا۔ ہر دوپہر کو اسے اس کتاب کی ورق گردانی کرنی پڑتی تھی جس میں جابجا شو بھانے پنسل سے صراحتیں کر رکھی تھیں کہ فلاں ڈش میں سوکھے دھنیے کے دو چمچ کی بجائے ایک چمچ ڈالنا ہے یا فلاں ترکیب میں مسور کی بجائے مونگ کی دال ڈالنی ہے۔ کھانا پکانے کی ہر ترکیب کے اوپر وہ تاریخ لکھی تھی جب انہوں نے پہلی دفعہ وہ ڈش اکٹھی کھائی تھی۔ جیسے اپریل کی دو تاریخ کو گو بھی سو نف کے تڑکے کے ساتھ، جنوری کی چودہ تاریخ مرغ کا گوشت بادام اور کشمش کے ساتھ وغیرہ وغیرہ۔ شو کو مار کو کچھ یاد نہ تھا کہ انہوں نے کب یہ کھانے کھائے تھے لیکن شو بھا کی اس کتاب میں ہر چیز کا ریکارڈ اس کی نفیس لکھائی میں موجود تھا۔ شو کو مار کو اب کھانا بنانا اچھا لگنے لگا تھا۔ کھانا پکاتے ہوئے ہی اسے یہ احساس ہوتا کہ وہ بھی کوئی مفید کام کر رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو شو بھا تو اب محض دلیے کی ایک پلیٹ پہ ہی اکتفا کرتی۔ وہ اب کھانا بنانے کے کشت سے دور بھاگتی تھی۔

آج بجلی کی بندش کی وجہ سے انہیں اکٹھے کھانا کھانا تھا۔ اس سے پہلے تو معمول یہ بن چکا تھا کہ شو کو مار اپنا کھانا لے کر سٹڈی روم چلا جاتا اور جب یہ میز پر پڑے پڑے ٹھنڈا ہو جاتا تو وہ جلدی جلدی اسے ٹھونس لیتا تھا جبکہ شو بھا کھانا لے کے لونگ روم میں چلی جاتی جہاں وہ ٹی وی پر گیم شو دیکھتی رہتی یا اپنی رنگ برنگی پنسلوں سے کتابوں کی غلطیوں کی اصلاح کرتی رہتی۔ شام کے کسی پہر شو بھا اس کے کمرے کا چکر لگاتی۔ جب وہ اس کے قدموں کی آواز سنتا تو جلدی سے ناول کو ایک طرف رکھ کے اپنے مقالے کے جملے ٹائپ کرنے لگتا۔ وہ اس کے کندھوں پہ اپنے دونوں ہاتھ رکھ کے تھوڑا جھک جاتی اور وہ دونوں سامنے کمپیوٹر کی نیلی سکرین پر اپنے ہیولوں کو چپ چاپ دیکھتے رہتے۔ "اتنی محنت مت کرو!" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ اس سے کہتی اور بستر کی طرف بڑھ جاتی۔ دن کے چوبیس گھنٹوں میں یہی چند لمحے ہوتے جب وہ اس کے پاس آتی تھی اور انہی لمحوں سے اب شو کو مار کو خوف آنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شو بھا خود پر جبر کر کے یہ دکھاوا کرتی ہے۔ وہ کمرے کی دیواروں پر نظر دوڑاتی۔ ان دیواروں کو بیتے موسم گرما میں ان دونوں نے مل کر بڑے شوق سے قطار اندر قطار چلتی بطنوں اور ڈھول باجے بجاتے خرگوشوں کے وال اسکرز سے سجایا

تھا۔ اگست کے اواخر تک اس کمرے میں کھڑکی کے ساتھ سرخ لکڑی سے بنے ایک پنگھوڑے، بچے کا لباس بدلنے کے لیے سبز رنگ کے ہتھوں والی ایک سفید میز اور ایک جھولنے والی کرسی جس کے کشن چو خانے دار کپڑے سے بنے تھے، آچکے تھے۔ بچے کی موت کے بعد شو کو مار نے شو بھا کو ہسپتال سے واپس گھر لانے سے پہلے ان سب نشانیوں کو مٹا دیا تھا۔ اس نے دیواروں پہ لگے آرائشی اسکرز چھپے چھچ کی مدد سے کھرچ کر اتار دیے تھے۔ شو بھا کے برعکس یہ کمرہ اسے غم زدہ نہ کرتا تھا اور وہ اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔ جنوری کے مہینے میں جب اس نے لائبریری کی بجائے گھر میں بیٹھ کر کام کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے اسی کمرے کا انتخاب کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کمرے میں اسے طمانیت کا احساس ہوتا تھا اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ شو بھا اس کمرے میں آنے سے کتراتے تھے۔ شو کو مار واپس باورچی خانے میں آیا اور ایک ایک کر کے سب دراز کھول کر دیکھنے لگا۔ قینچیوں، انڈہ پھینٹنے والی مشینوں اور ہاون دستے کے درمیان اس نے موم بتیوں کا پیکٹ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن موم بتیاں کہیں موجود نہ تھیں۔ ہاون دستہ شو بھا نے کلکتہ کے ایک بازار سے خریدا تھا۔ بچے کی پیدائش سے قبل جب کھانا پکانا اس کا مشغلہ تھا تو وہ اسی ہاون دستے میں لہسن، لونگ اور الائچی کو ٹا کرتی تھی۔ شو کو مار کو درازوں میں ایک ٹارچ ملی لیکن اس میں سیل موجود نہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی سالگرہ کی موم بتیوں کا نصف پیکٹ پڑا تھا۔ پچھلے سال مئی کے مہینے میں شو بھا نے اس کی سالگرہ بڑے شاندار طریقے سے منائی تھی۔ ان کا چھوٹا سا گھر ایک سو بیس مہمانوں سے بھر گیا تھا جن میں ان کے دوست اور دوستوں کے دوست بھی شامل تھے۔ اب وہ ان سب لوگوں کو ملنے سے کتراتے تھے۔ اُس پارٹی میں مہمانوں نے پرتگیزی شراب^۴ کی ان بوتلوں کو لنڈھایا تھا جو شو کو مار اور شو بھا نے ہاتھ ٹب میں برف بھر کے اس کے درمیان بچ بستہ ہونے کے لیے رکھی تھیں۔ شو بھا کو پانچواں مہینہ تھا اس لیے اس نے مارٹینی گلاس میں محض ادرک کے ست سے بنے مشروب پر ہی اکتفا کیا تھا۔ اس موقع کے لیے شو بھا نے اپنے ہاتھوں سے ونیلا کریم کیک اور کسٹرڈ بنایا تھا۔ پارٹی کے دوران ساری رات مہمانوں کے درمیان پھرتے ہوئے شو بھا نے اپنے انگلیاں شو کو مار کی لمبی انگلیوں میں پیوست کیے رکھی تھیں۔

ستمبر سے اب تک ان کے ہاں صرف شو بھا کی ماں ہی بطور مہمان آئی تھیں۔ شو بھا کے ہسپتال سے لوٹنے کے بعد وہ ایریزونا^۵ سے دو ماہ تک ان کے ہاں رہنے کے لیے آئی تھیں۔ وہ ہر شام کھانا بناتیں، سپر مارکیٹ سے چیزیں خرید لاتیں اور کپڑے دھو کر سوکھنے کے لیے ڈال دیتیں۔ وہ خاصی مذہبی خاتون تھیں۔ مہمان خانے میں ایک طرف انہوں نے پوجا پاٹ کے لیے کاسنی رنگ کی دیوی کی فریم شدہ تصویر لگا رکھی تھی جس کے سامنے ایک پلیٹ میں گیندے کے پھولوں کی پتیاں پڑی رہتیں۔ وہ دن میں دو دفعہ شو بھا کے ہاں مستقبل میں صحت مند بچوں کی پیدائش کے لیے

پرارتھنا کرتیں۔ شوکومار سے وہ نرمی سے بات کرتی تھیں تاہم دونوں کے درمیان تکلف کی اک دیوار ہمیشہ حائل رہتی۔ وہ شوکومار کی سوئیریں نہایت مہارت سے تہہ لگا کر رکھتی تھیں۔ یہ فن انہوں نے ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور میں کام کرتے ہوئے سیکھا تھا۔ شوبھا کی ماں نے اپنے قیام کے دوران شوکومار کے سردیوں کے کوٹ کے ٹوٹے ہوئے بٹن کو تبدیل کیا، اس کے لیے ایک سوئیر اور بھورے رنگ کا مفلر بُنا اور خاموشی سے یہ چیزیں اس کے حوالے کر دیں ایسے جیسے وہ یہ چیزیں کہیں گرا بیٹھا تھا جو وہ اس کے لیے واپس لے آئی تھیں۔ انہوں نے اس سے کبھی شوبھا کے بارے میں بات نہیں کی۔ ایک دفعہ جب باتوں باتوں میں شوکومار نے بچے کی موت کا ذکر کیا تو انہوں نے سوئیر بننے ہوئے رک کر اوپر دیکھتے ہوئے محض اتنا کہا تھا: "لیکن تم تو وہاں موجود ہی نہیں تھے۔"

موم بتیوں کی ناکام تلاش کے بعد شوکومار یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ شوبھا جو ہر آنے والے وقت کے لیے پہلے سے پیش بندی کر لیا کرتی تھی وہ اس عام سی ہنگامی صورت حال کا ادراک پہلے سے کیوں نہ کر سکی کہ بجلی کا بریک ڈاؤن بھی ہو سکتا ہے۔ شوکومار نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تاکہ وہ سالگرہ کی موم بتیوں کو کہیں رکھ کر جلا سکے۔ بالآخر اس نے کھڑکی میں سنک کے ساتھ رکھے ہوئے سدا بہار بیل کے گملے کی مٹی پہ موم بتیاں جمادیں۔ گملا اگرچہ پانی کی ٹونٹی سے چند انچ کے فاصلے پر ہی تھا لیکن اس کی مٹی بالکل خشک ہو چکی تھی۔ موم بتیاں جمانے کے لیے شوکومار کو اس کی مٹی کو پہلے پانی سے تر کرنا پڑا۔ اس نے باورچی خانے کی میز سے ڈاک کے انبار اور لائبریری سے لائی گئی ان کتابوں کو ایک طرف کیا جنہیں ابھی تک انہوں نے نہیں پڑھا تھا۔ اس میز پر بیٹھ کر اسے شادی کے بعد پہلا کھانا ابھی تک یاد تھا۔ ایک ہی گھر میں ایک ساتھ رہنے کا احساس اتنا فرحت انگیز تھا کہ وہ دونوں کھانے سے زیادہ ایک دوسرے سے پیار کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس نے میز کے درمیان میں رکھے کڑھائی کیے ہوئے دو میٹ اور لکھنوء سے ان کے ایک چچا کی طرف سے بھیجا گیا شادی کا تحفہ اٹھا کر نیچے رکھے اور وہ پلیٹیں اور شراب پینے کے گلاس نکال کر میز پر سجادیے جو وہ مہمانوں کی آمد پر نکالا کرتے تھے۔ اس نے گملا میز کے درمیان میں رکھ دیا۔ بیل کے سفید کناروں اور ستاروں کی شکل والے پتوں کو دس چھوٹی چھوٹی موم بتیوں نے گویا گھیر لیا تھا۔ شوکومار نے ڈیجیٹل کلاک ریڈیو کو آن کر کے وہ اسٹیشن لگا دیا جس پر جاز موسیقی بج رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" شوبھانے سیڑھیوں سے اتر کر میز پہ سبھی سالگرہ کی موم بتیوں پہ نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے بال سفید تو لیے میں لپیٹ رکھے تھے۔ تو لیا اتار کر اس نے ایک کرسی کی پشت پر رکھ دیا اور اپنے گیلے، سیاہ بالوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ جب وہ خالی خولی سے انداز میں چولہے کی طرف بڑھ رہی تھی تو آپس میں الجھے ہوئے کچھ بالوں کو وہ اپنی انگلیوں سے سلجھاتی جا رہی تھی۔ اس نے صاف ستھرے ڈھیلے ڈھالے پاجامے پر ٹی شرٹ پہن رکھی

تھی اور اس پر پرانا نہانے کا اونی جامہ اوڑھ رکھا تھا۔ بچے کی پیدائش کے بعد اب اس کا پیٹ واپس جا چکا تھا اور اس کی کمر اس کے کولہے کے ابھار سے اوپر دوبارہ پتلی ہو چکی تھی۔ اس نے جامے کی بیلٹ کو ڈھیلی ڈھالی گرہ لگا رکھی تھی۔ اب تقریباً آٹھ بج چکے تھے۔ شو کو مارنے چاول میز پر رکھے اور گزشتہ روز کی دال کو مائیکرو ویو اوون میں رکھ کہ اس پر ٹائمنگ سیٹ کرنے لگا۔

"تم نے روغن جوش بنایا ہے" شو بھانے کڑاہی کے شیشے کے ڈھکنے سے سالن پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ شو کو مارنے دنبے کے گوشت کے ایک ٹکڑے کو اپنی انگلیوں کے درمیان دبا کر اس کی گلاوٹ کو محسوس کیا۔ پھر اس نے گوشت کے ایک بڑے ٹکڑے کو چمچے کی مدد سے دبا کر دیکھا کہ گوشت آسانی سے ہڈی سے جدا ہوتا ہے یا نہیں۔ "یہ بالکل تیار ہے" اس نے اعلان کرتے ہوئے کہا۔

اوون نے دال کے گرم ہونے کا اعلان پیپ بجا کر جیسے ہی کیا بجلی بند ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی ریڈیو سے بجنے والی موسیقی بھی تھم گئی۔

"تم نے صحیح وقت پہ کام مکمل کیا۔" شو بھانے کہا۔

"مجھے جلانے کے لیے بس سالگرہ والی موم بتیاں ہی ملیں" شو کو مارنے گملے کی مٹی میں دبائی ہوئی موم بتیوں کو روشن کرتے ہوئے کہا۔ اس نے پیکٹ میں باقی بچی ہوئی موم بتیوں اور ماچس کی ڈبیا کو اپنی پلیٹ کے ساتھ ہی رکھ دیا۔ "یہ بھی ٹھیک ہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا"، شو بھانے اپنے گلاس کے نچلے حصے پہ انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ "یہ منظر بہت خوبصورت لگ رہا ہے۔"

موم بتیوں کی مدھم روشنی میں وہ جانتا تھا کہ شو بھانے کیسے بیٹھی ہے۔ وہ ہمیشہ کرسی پہ تھوڑا آگے جھک کر بیٹھتی تھی۔ کرسی کے پائیدان پر دونوں پاؤں ایک دوسرے پہ رکھ کر وہ اپنی بائیں کہنی میز پر ٹکا لیا کرتی تھی۔

موم بتیوں کی تلاش کے دوران شو کو مار کو ایک کریٹ میں سے، جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ خالی ہو چکا ہے، شراب کی ایک بوتل ملی تھی۔ بوتل کا ڈھکن کھولتے ہوئے شو کو مار نے اسے اپنے دونوں گھٹنوں میں دبا لیا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں بوتل چھلک نہ جائے اس نے گلاس گود کے پاس رکھ کر بہت احتیاط سے شراب ان میں انڈیلی۔ پلیٹوں میں چاول ڈالتے ہوئے یا سالن میں سے گرم مصالحوں کی پتیاں اور لونگ چن کر نکالتے ہوئے دونوں خاموشی سے اپنے لیے کھانا خود نکالتے رہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد شو کو مار نئی موم بتیاں جلا کر گملے کی مٹی میں دبا دیتا۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم انڈیا میں ہوں۔" شو بھانے اسے موم بتیوں کے لیے بنائے گئے اس عارضی اسٹینڈ پہ موم بتیاں

جماتے دیکھ کر کہا۔ "انڈیا میں تو بعض دفعہ کئی کئی گھنٹوں کے لیے بجلی غائب ہو جاتی ہے۔ مجھے تو ایک دفعہ مکھی بھات کی پوری رسم اندھیرے میں گزارنی پڑی تھی۔ بچہ جس کو پہلی دفعہ کھانا کھلانے کے لیے یہ تقریب رچائی گئی تھی بے چارہ گرمی کی وجہ سے مسلسل روتا بلکتا رہا تھا۔"

ہمارا بچہ تو رو بھی نہیں پایا۔ شو کو مار نے دل میں سوچا۔ وہ کبھی اپنے بچے کی یہ رسم نہ دیکھ پائیں گے۔ شو بھاجب امید سے تھی تبھی اس نے اپنے بچے کو پہلا کھانا کھلانے کی رسم کے لیے مہمانوں کی فہرست بنالی تھی۔ اس نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اس کے تین بھائیوں میں سے کون سا بھائی بچے کو اس کا پہلا کھانا اپنے ہاتھوں سے کھلائے گا۔ اگر ان کے ہاں بیٹا ہو تا تو یہ تقریب چھ ماہ بعد ہونی تھی اور بیٹی کی صورت میں سات ماہ بعد۔ لیکن یہ تقریب اب کبھی نہیں ہونی تھی۔

"تمہیں گرمی تو نہیں لگ رہی؟" شو کو مار نے شو بھاسے پوچھا۔ اس نے ہاتھ سے دھکیل کر گیلے کو میز کے دوسرے کونے کی طرف کر دیا جہاں لائبریری کی کتابیں اور ڈاک کا ڈھیر پڑا تھا۔ ایسا کرنے سے روشنی اور مدھم پڑ گئی اور ان دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھنا اور مشکل ہو گیا۔ شو کو مار پہ نہ جانے کیوں جھنجلاہٹ طاری ہو رہی تھی۔ وہ نہ جانے کیوں واپس اپنے کمرے میں جانا چاہتا تھا۔

"نہیں تو مجھے تو گرمی نہیں محسوس ہو رہی۔ ویسے کھانا بہت مزیدار ہے۔" شو بھانے کانٹے کو پلیٹ پہ آہستہ آہستہ بجاتے ہوئے کہا۔

شو کو مار نے شو بھاکے گلاس کو شراب سے پھر بھر دیا جس پر شو بھانے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ ہمیشہ سے ایسے نہ تھے۔ اب تو شو کو مار کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ باتیں کرنی پڑتیں جنہیں سن کر شو بھاپنی پلیٹ سے یا اپنی پروف ریڈنگ کی فائلوں سے سراٹھا کر اس کی طرف دیکھے۔ وہ باتیں جن میں شو بھاکے دلچسپی ہوتی۔ لیکن اس ساری تنگ و دو کے بعد شو کو مار نے بالآخر خاموشی سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ اس نے شو بھاکو خوش کرنے کی کوششیں ترک کر دی تھیں۔

"مجھے یاد ہے جب ہم نانی اماں کے گھر ہوتے اور بجلی چلی جاتی تھی تو ہم سب کو کچھ نہ کچھ سنا پڑتا تھا۔" شو بھانے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ شو کو مار کو اس کا چہرہ بہ مشکل نظر آ رہا تھا لیکن اس کی آواز کے زیر و بم سے وہ جانتا تھا کہ شو بھانے اپنی آنکھیں ایسے بھینج لی ہیں جیسے وہ دور کسی چیز کو دیکھ رہی ہو۔ یہ شو بھاکے پرانی عادت تھی۔

"مثلاً کیا باتیں کرتے تھے؟"

"مجھے کچھ خاص یاد نہیں، یہی کوئی شعر، کوئی لطیفہ یا دنیا کے بارے میں کچھ نئی معلومات۔ میں نہیں جانتی کہ کیوں

لیکن میرے رشتے دار ہمیشہ مجھ سے میری امریکی دوستوں کے نام جاننا چاہتے۔ پتہ نہیں کیوں انہیں یہ معلومات دلچسپ لگتی تھیں۔ پچھلی دفعہ جب ملیں تو میری خالہ نے مجھ سے میری پرائمری اسکول کی چار کلاس فیلوز کے بارے میں پوچھا۔ میں تو ان کے نام تک بھول چکی ہوں۔"

شو کو مار نے انڈیا میں شو بھا جتنا وقت نہیں بتایا تھا۔ شو کو مار کے ماں باپ جو نیو ہیپ شائر^۸ میں رہتے تھے جب کبھی انڈیا جاتے اس کے بغیر جاتے تھے۔ جب پہلی دفعہ وہ انڈیا گیا تو چھوٹا سا تھا۔ وہاں اسے اتنے خطرناک پیچش لگ گئے تھے کہ اس کے ماں باپ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس کا باپ جو ویسے ہی نروس رہتا تھا اس کے بعد اسے اس ڈر سے انڈیا نہیں لے کر گیا کہ مبادا اسے کچھ ہونہ جائے۔ چنانچہ جب بھی وہ انڈیا جاتے شو کو مار کو اس کے انکل اور آنٹی کے ہاں کنکارڈ^۹ شہر میں چھوڑ دیتے تھے۔ لڑکپن میں جب گرمیوں کی چھٹیاں ہوتیں تو شو کو مار کو بھی انڈیا جانے کی بجائے کشتی رانی کرنا یا آئس کریم سے لطف اندوز ہونا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ جب وہ کالج کے آخری سال میں تھا تو اس کا باپ دنیا سے سدھار گیا۔ باپ کے جانے کے بعد اسے انڈیا میں دلچسپی ہونے لگی اور اس نے کورس کی کتابوں سے انڈیا کی تاریخ پڑھنا شروع کی۔ اب اسے لگتا تھا کہ کاش اس کے پاس بھی انڈیا سے جڑی اس کے بچپن کی کوئی کہانی ہوتی۔

"چلو ہم بھی ایسا ہی کرتے ہیں" شو بھا اچانک بولی۔
"کیا کریں؟"

"اندھیرے میں ایک دوسرے کو کچھ سناتے ہیں۔"

"مثلاً کیا؟ مجھے تو کوئی لطیفہ بھی نہیں آتا۔"

"لطیفہ نہیں" شو بھانے کچھ سوچتے ہوئے کہا، "کیا خیال ہے اگر ہم ایک دوسرے کو وہ باتیں بتائیں جو ہم نے اس سے پہلے کبھی سنیں نہیں کیں۔"

"جب میں ہائی اسکول میں تھا تو ہم لوگ ایک کھیل کھیلا کرتے تھے" شو کو مار نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔

"تم اس کھیل کی بات کر رہے ہو جس میں کسی سوال کا جواب دینے یا کوئی باہمت کرنے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے؟" میں جو بات کر رہی ہوں یہ اس سے مختلف ہے۔ چلو میں شروع کرتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے شو بھانے شراب کا ایک گھونٹ بھرا اور بولی:

"جب پہلی دفعہ میں تمہارے اپارٹمنٹ میں اکیلی تھی تو میں نے اس تجسس کے ہاتھوں تمہاری ایڈریس بک کھول کر پڑھی تھی کہ اس میں میرا نام درج ہے یا نہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس وقت ہمیں آپس میں ملتے ہوئے دو ہفتے گزر چکے تھے۔"

"میں کہاں تھا تب؟"

"تم دوسرے کمرے میں فون کال کا جواب دینے گئے تھے۔ یہ تمہاری والدہ کی کال تھی اس لیے مجھے یقین تھا کہ اس کا دورانیہ طویل ہو گا۔ میں یہ دیکھنا چاہ رہی تھی کہ تم مجھے کتنی اہمیت دینے لگے ہو۔"

"تو کیا تمہارا نام تھا ایڈریس بک میں؟"

"نہیں تھا! لیکن میں ناامید نہیں ہوئی تھی۔ اب تمہاری باری ہے تم کچھ بتاؤ۔"

شو کو مار کو کچھ ایسا یاد نہیں آ رہا تھا جو وہ شو بھا کو بتاتا لیکن شو بھا اس کی منتظر تھی۔ شو کو مار کو شو بھا کے اندر وہ توانائی نظر آ رہی تھی جو پچھلے کئی مہینوں سے غائب تھی۔ اب بتانے کے لیے رہ ہی کیا گیا ہے؟ شو کو مار نے چار سال قبل اس پہلی ملاقات کے بارے میں سوچا جو کیمبرج یونیورسٹی کے لیکچر ہال میں بنگالی زبان کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی۔ اتفاقاً ان دونوں کی نشستیں پہلو بہ پہلو تھیں۔ شو کو مار مشاعرے میں موجود دوسرے لوگوں کے برعکس جو ہر مصرعے پر داد دے رہے تھے شاعرانہ زبان کی نزاکتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا اس لیے وہ جلد ہی بوریت کا شکار ہو گیا تھا۔ اکتا کر اس نے اپنی گود میں رکھے اخبار میں دنیا کے مختلف شہروں کے درجہء حرارت کا موازنہ شروع کر دیا۔ گذشتہ روز سنگاپور میں اکیانوے ڈگری، سٹاک ہولم میں اکاون ڈگری۔۔۔ وہ ایک ایک کر کے مختلف شہروں کے درجہء حرارت پڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی نشست کے بائیں جانب نگاہ دوڑائی تو وہاں ایک عورت ایک فولڈر کی پشت پر سبز یوں اور کھانے پینے کی چیزوں کی فہرست بنا رہی تھی۔ اس عورت کی خوبصورتی نے شو کو مار کو چو نکا دیا تھا۔

"اوکے" اس نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا، "جب ہم پہلی دفعہ ڈنر کرنے پر تگلوی ریسٹورنٹ میں گئے تھے تو میں بیرے کو ٹپ دینا بھول گیا تھا۔ میں دوسری صبح دوبارہ وہاں گیا، اس بیرے کا نام دریافت کیا اور اس کے لیے مینیجر کے پاس ٹپ چھوڑ دی تھی۔"

"تم واپس سمرویل" محض اس بیرے کو ٹپ دینے گئے تھے؟"

"ہاں میں ٹیکسی کے ذریعے گیا تھا۔"

"ویسے تم بیرے کو ٹپ دینا بھولے ہی کیوں تھے؟"

اب سا لگرہ کی موم بتیاں جل کر بجھ چکی تھیں۔ لیکن شو کو مار شو بھا کے چہرے کو اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی ترچھی آنکھیں، اس کے عنابی ہونٹ اور اس کی ٹھوڑی پہ بچپن میں کرسی سے گرنے کا نشان۔ دو سال کی عمر میں لگنے والا یہ نشان یوں لگتا جیسے انگریزی زبان کا "کوما" ہو۔ شو بھا کا حسن جو کبھی شو کو مار کو مسحور کیے رکھتا تھا اب مدھم پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ میک اپ جس کے بارے میں کبھی شو کو مار کا خیال تھا کہ شو بھا کو اس کی ضرورت نہیں

اب لازمی لگنے لگا تھا۔ اس کے بغیر اب شوبھا ادھوری سی لگتی تھی۔

"اس ریستورنٹ میں کھانے کے اختتام تک میرے دماغ میں نہ جانے کیوں یہ خیال جنم لے چکا تھا کہ میری تم سے ہی شادی ہونی ہے۔" شو کو مار نے کہا۔ اس حقیقت کو اس نے پہلی دفعہ اپنے اور شوبھا کے سامنے تسلیم کیا تھا۔ "شاید اسی خیال نے میری توجہ اس حد تک اپنی طرف کھینچ لی تھی کہ میں بیرے کو ٹپ دینا بھول گیا تھا۔"

اگلی رات شوبھا اپنے معمول سے ذرا جلدی گھر آگئی۔ گذشتہ روز کا دنبے کے گوشت کا سالن بچا ہوا تھا، شو کو مار نے وہی گرم کر لیا تا کہ وہ سات بجے تک کھانا کھالیں۔ وہ دن کے وقت قریبی سٹور سے موم بتیوں کا پیکٹ اور ٹارچ کے لیے سیل خرید لایا تھا۔ اس نے موم بتیاں رکھنے کا سٹینڈ تیار کر لیا تھا۔ پیتل سے بنے اس سٹینڈ پہ موم بتیاں رکھنے کی جگہوں کو کنول کے پھولوں کی شکل دی گئی تھی۔ لیکن انہوں نے بجلی جانے سے قبل ہی میز کے عین اوپر چھت سے لٹکتے تانبے کی سی رنگت والے لیمپ کی روشنی میں کھانا کھالیا۔

کھانا کھانے کے بعد جب شوبھا کھانے کی پلیٹیں سمیٹ کر سنک کی طرف دھونے کے لیے لے کر جانے لگی تو شو کو مار کو قدرے حیرت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ شوبھا کھانے کے بعد لوگ روم میں چلی جائے گی اور وہاں معمول کے مطابق فائلوں کی دیوار کے پیچھے گم ہو جائے گی۔

"انہیں دھونے کی فکر نہ کرو" شو کو مار نے اس کے ہاتھ سے پلیٹیں لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہ کروں!" شوبھا برتن دھونے کے محلول کا ایک قطرہ اسفنج پہ گراتے ہوئے بولی۔ "آٹھ بجنے والے ہیں۔" شو کو مار کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آج سارا دن اس نے اس لمحے کا انتظار کیا تھا جب بجلی چلی جائے گی اور دونوں اکٹھے ہوں گے۔ شوبھا نے اسے ایڈریس بک میں اپنا نام تلاش کرنے والی جو بات کل رات بتائی تھی وہ دن بھر اسی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ جب وہ پہلی دفعہ ملے تھے تو شوبھا اس وقت کتنی باہمت، کتنی پر امید لیکن کتنی گھبرائی ہوئی تھی۔ اس وقت کی شوبھا کا تصور کر کے شو کو مار کو اچھا لگا تھا۔

وہ دونوں سنک کے سامنے ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے تھے اور ان کے عکس کھڑکی کے فریم میں کسی تصویر کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ یوں پہلو بہ پہلو کھڑے ہونے سے شو کو مار کو ایسے لگا جیسے وہ شادی کے بعد پہلی دفعہ آئینے کے سامنے اکٹھے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ شرمایا گیا۔ اسے اب یہ یاد بھی نہیں تھا کہ انہوں نے آخری دفعہ کب یوں اکٹھے کھڑے ہو کر تصویر بنوائی تھی۔ پارٹیوں میں جانا انہوں نے ترک کر دیا تھا۔ وہ کہیں بھی اب اکٹھے نہیں جاتے تھے۔ اس کے کیمرے میں شوبھا کی صحن میں بنائی گئی اس وقت کی تصویریں تھیں جب وہ امید سے تھی۔ اس کے بعد سے اب تک انہوں نے کوئی تصویر نہیں بنائی تھی۔

پلیٹیں دھونے کے بعد انہوں نے تو لیے سے اکٹھے ہاتھ پونچھے۔ آٹھ بجتے ہی سارا گھر تاریکی میں ڈوب گیا۔ شو کو مار نے موم بتیاں جلا دیں۔ کل کی سالگرہ والی موم بتیوں کے مقابلے میں ان موم بتیوں کی توانا لو اسے اچھی لگی۔

"چلو باہر چل کر بیٹھتے ہیں، میرے خیال میں ابھی ٹھنڈ زیادہ نہیں ہے۔" شوبھانے کہا۔

ان دونوں نے ایک ایک موم بتی اٹھائی اور گھر کے باہر دروازے کی سیڑھیوں پہ آکر بیٹھ گئے۔ برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ابھی تک گلی میں موجود تھے اس لیے یوں گلی میں آ کے بیٹھنا عجیب لگ رہا تھا۔ لیکن ہوا میں موجود تازگی نے سب کو باہر آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گھروں کے دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ ان کے سامنے سے ٹارچیں اٹھائے پڑوسیوں کی ایک ٹولی گزری۔

"ہم ذرا کتابوں کی دکان تک کچھ کتابیں دیکھنے جا رہے ہیں۔" سفید بالوں والے ان کے پڑوسی نے اونچی آواز میں کہا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس کی دہلی پتلی بیوی نے ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لیے جیکٹ پہن رکھی تھی اور وہ رسی تھامے اپنے کتے کو اپنے ساتھ ٹھلارہی تھی۔ ان کا تعلق بریڈ فورڈ سے تھا۔ پچھلے سال ستمبر میں انہوں نے بچے کی وفات پر شو کو مار اور شوبھانے کے لیے ان کے میل باکس میں ایک تعزیتی کارڈ چھوڑا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ کتابوں کی دکان والی طرف بجلی بحال ہو گئی ہے۔" آدمی نے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے ورنہ آپ کو اندھیرے میں ہی ٹامک ٹونیاں مارنی پڑیں گی۔" شو کو مار نے جواب دیا۔

عورت نے یہ سن کر قہقہہ لگایا اور اپنے شوہر کے بازو کے حلقے میں سے اپنا بازو نکال لیا۔

"ہمارے ساتھ چلنا ہے؟" اس نے ان سے سوال کیا۔

"نہیں، بہت شکریہ" شوبھانے اور شو کو مار دونوں نے بہ یک وقت جواب دیا۔ شو کو مار کو حیرت ہو رہی تھی کہ کیسے اس کے اور شوبھانے کے الفاظ بالکل ایک جیسے تھے۔

آج تاریکی میں بیٹھے ہوئے شو کو مار سوچ رہا تھا کہ شوبھانے سے کیا نیا بتائے گی۔ وہ بھلا کیا ایسا بتا سکتی تھی جو شو کو مار نے اپنے کسی بدترین خواب میں بھی نہ سوچا ہو۔ کیا وہ یہ بتائے گی کہ اس کا کسی اور مرد سے افیر ہے یا یہ بتائے گی کہ اس کے دل میں شو کو مار کے لیے کوئی عزت نہیں کیوں کہ پینتیس سال کا ہونے کے باوجود وہ ابھی تک کچھ نہیں کما رہا؟ یا وہ اس کو بچے کی پیدائش کے وقت اس سے دور بالٹی مور میں ہونے پر اسی طرح الزام دے گی جیسے اس کی ماں نے دیا تھا؟ لیکن شو کو مار جانتا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی بات درست نہیں تھی۔ شوبھانے کی اسی طرح وفادار تھی جس طرح وہ شوبھانے کا وفادار رہا تھا۔ شوبھانے کو اس کی صلاحیتوں پر اعتبار تھا۔ شوبھانے خود ہی اس پر زور دے کر اسے بالٹی مور بھیجا تھا۔

پھر ایسا کیا تھا جو وہ ایک دوسرے کے بارے میں نہیں جانتے تھے! شو کو مار جانتا تھا کہ شو بھا سوتے ہوئے اپنے مٹھیوں کو بھیجنے لیتی تھی اور جب وہ کوئی بھیانک سپنا دیکھتی تو اس کا جسم جھٹکے کھانے لگتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شو بھا کو گرمے سے زیادہ خربوزے پسند تھے۔ وہ جانتا تھا کہ بچے کی موت کے بعد جب وہ اسپتال سے لوٹے تو شو بھانے گھر میں داخل ہوتے ہی جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ اس نے چیزوں کو اٹھا اٹھا کر برآمدے میں ایک جگہ پھینکنا شروع کر دیا تھا۔ الماریوں سے کتابیں، کھڑکیوں میں رکھے پودے، دیواروں سے سینگلز، میزوں پر پڑے فریم شدہ فوٹو اور چولہے کے ساتھ لٹکے برتن سب اٹھا کر اس نے ایک جگہ ڈھیر لگا دیا تھا۔ جب وہ یہ سب کرتے ہوئے ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف خود کار انداز میں بڑھ رہی تھی تو شو کو مار ایک طرف کھڑا اس کو محض خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اپنی اس مشق سے مطمئن ہو کر وہ اس انبار کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ خالی خولی نظروں سے اسے تکتے ہوئے اس کے ہونٹ حقارت سے بھیجنے ہوئے تھے۔ شو کو مار کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی ان چیزوں پر تھوک دے گی۔ کچھ دیر کے بعد اچانک شو بھانے رونا شروع کر دیا تھا۔

دروازے کی سیڑھیوں پہ بیٹھے بیٹھے شو کو مار کو ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ شو بھا کچھ بولے۔ وہ چاہتا تھا کہ شو بھا اپنا کوئی راز اس پر منکشف کرے۔

"جب تمہاری ماں ہمارے ساتھ کچھ وقت رہنے کے لیے آئی تھیں،" شو بھانے بالآخر سکوت توڑتے ہوئے کہا، "اور جب میں نے ایک رات کہا تھا کہ آج مجھے دیر تک کام کرنا ہے تب میں گیلینین کے ساتھ گھومنے گئی تھی اور ہم نے مارٹینی پی تھی۔ کام محض بہانہ تھا۔"

شو کو مار نے اس کے چہرے کے خطوط پر نگاہ دوڑائی، اس کی ستواں ناک اور کسی قدر مردانہ جبرٹا اندھیرے میں بھی نمایاں تھے۔ شو بھا جس رات کا ذکر کر رہی تھی وہ شو کو مار کو اچھی طرح یاد تھی۔ اس شام وہ یکے بعد دیگرے دو کلاسیں پڑھا کر تھکا ہارا گھر لوٹا تھا۔ ماں کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے اس کی خواہش تھی کہ شو بھا وہاں ہوتی تو ماں سے اچھی اچھی باتیں کرتی کیوں کہ وہ ماں کو خوش کرنے والی باتیں بنانے پر پارہا تھا۔ اس کے باپ کو مرے بارہ سال ہو چکے تھے اور اس کی ماں ان کے پاس اس لیے دو ہفتے رہنے آئی تھی تاکہ وہ مل کر مرحوم کی یادیں تازہ کر سکیں۔ اس کی ماں ہر شام کوئی ایسی ڈش بناتی تھی جو اس کے باپ کو پسند تھی لیکن وہ بے چاری خود اس قدر دکھی ہو جاتی کہ اس سے کھایا نہ جاتا۔ اس کی آنکھیں اپنے مرحوم شوہر کو یاد کر کے بھر آتیں۔ شو بھا اسے تسلی دیا کرتی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپاتی رہتی۔

"یہ کتنا المناک ہے نا!" ماں کی یہ کیفیت دیکھ کر شو بھانے اس وقت شو کو مار کو کہا تھا۔

اب شوکومار نے چشم تصور سے شوہا کو اس شراب خانے میں جیلین کے ساتھ مخملیں صوفے پر بیٹھے دیکھا جس میں وہ دونوں رات کو فلم دیکھنے کے بعد جایا کرتے تھے۔ اس نے شوہا کو جیلین سے سگریٹ لیتے اور سسرالیوں کے اس کے گھر آکر براجمان ہو جانے کی شکایت کرتے اور جیلین کو اس سے ہمدردی جتانے تصور کیا۔ جیلین ہی شوہا کو اسپتال بھی لے کر گئی تھی۔

"اب تمہاری باری ہے۔" شوہا کی آواز نے شوکومار کے خیالات کی لڑی توڑ دی۔

شوکومار کو اپنی گلی کے نکل سے ڈرل مشین کے شور اور زور زور سے بولتے الیکٹریشنوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے گلی کے تاریکی میں ڈوبے مکانوں پر نگاہ دوڑائی۔ ایک مکان کی کھڑکیوں میں موم بتیاں جلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں اور اس کی چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

"کالج میں میں نے مشرقی تہذیبوں کے پرچے میں نقل کی تھی "شوکومار گویا ہوا۔" یہ میرا آخری سمسٹر اور آخری امتحان تھا۔ والد صاحب کو فوت ہوئے ابھی چند ماہ گزرے تھے۔ میرے ساتھ والی میز پر ایک امریکی لڑکا بیٹھا تھا۔ پڑھائی کے معاملے میں وہ بڑا جنونی تھا۔ اسے اردو اور سنسکرت زبانیں آتی تھیں۔ میں اس کی جوابی کاپی کو با آسانی دیکھ سکتا تھا۔ پرچے میں ہمیں ایک شعر دیا گیا تھا اور اس کی صنف کی شناخت کرنے کو کہا گیا تھا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ غزل کا شعر ہے یا کسی اور صنف کا۔ میں نے اس امریکی لڑکے کا جواب اپنی کاپی پر ہو بہو نقل کر دیا تھا۔"

یہ واقعہ پندرہ سال پہلے گزرا تھا لیکن شوکومار شوہا کو اب یہ راز بتا کے خود کو ہلکا چھلکا محسوس کر رہا تھا۔

شوہا اس کی طرف مڑی۔ اس کی نگاہیں شوکومار کے چہرے کی بجائے اس کے جوتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ نرم چمڑے سے بنے یہ بوٹ اب پرانے ہو چکے تھے اور ان کا پچھلا حصہ گھسا ہوا تھا۔ شوکومار ان کو اب سلپیر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ شوکومار اس سوچ میں تھا کہ کیا شوہا کو اس کی نقل والی بات بری لگی ہے۔ شوہانے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہلکا سا دبایا۔ "تمہیں یہ وضاحت دینے کی ضرورت نہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔" اس نے شوکومار کے قریب کھسکتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں نوبے بجلی آنے تک وہاں بیٹھے رہے۔ جیسے ہی تاروں میں برقی رود دوبارہ دوڑنا شروع ہوئی انہوں نے گلی میں لوگوں کی تالیوں اور ٹیلی ویژنوں کے آن ہونے کی آوازیں سنیں۔ بریڈ فورڈ فیملی واپس آرہی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں کون آئس کریمیں تھیں۔ انہوں نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلائے۔ شوکومار اور شوہانے بھی جوابی ہاتھ ہلائے۔ پھر وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کر اندر چل دیے۔ شوکومار کا ہاتھ ابھی تک شوہا کے ہاتھ میں تھا۔

ان دونوں کے درمیان ان لمحوں میں ہونے والی گفتگو غیر محسوس طور پر اعترافات کا ایک سلسلہ بن چکی تھی۔ اپنے

ان چھوٹے چھوٹے گناہوں کا اعتراف جس سے انہوں نے ایک دوسرے کو یا خود کو دکھی کیا تھا۔ اگلے روز شو کو مار گھنٹوں یہ سوچتا رہا کہ وہ شام کو شو بھا کے سامنے کیا اعتراف کرے گا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا تھا۔ کیا شو بھا کو وہ یہ بتادے کہ اس نے شو بھا کے فیشن میگزین سے ایک عورت کی تصویر پھاڑ کر ایک ہفتے تک اپنے پاس اپنی کتاب میں چھپائے رکھی تھی یا وہ یہ اعتراف کر لے کہ اس نے شو بھا کی طرف سے ان کی شادی کی تیسری سالگرہ کے موقع پر تحفے میں دیا ہوا بغیر آستینوں کا سویٹر گم نہیں کیا تھا بلکہ فیلینی ڈیپارٹمنٹ سٹور میں پیسوں کے عوض تبدیل کر لیا تھا۔ ان کی شادی کی پہلی سالگرہ کے موقع پر شو بھا نے خاص اس کے لیے انواع و اقسام کی دس ڈشیں بنائی تھیں۔ لیکن تیسری سالگرہ پر ملنے والا یہ سویٹر کا تحفہ شو کو مار کو پسند نہیں آیا تھا۔ کیا وہ شو بھا کو یہ بتادے کہ ایک روز اکیلے وہ دن دیہاڑے ایک ہوٹل بار میں شراب پی کر مست ہو گیا تھا اور اس نے بار ٹینڈر سے اپنی بیوی کا شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ دیکھو مجھے میری بیوی نے سویٹر تحفے میں دیا ہے اور بار ٹینڈر نے متانت سے جواب دیا تھا: "تم شادی شدہ ہو، بھلا اور کیا توقع رکھتے ہو؟"

میگزین سے عورت کی تصویر پھاڑ کر اپنے پاس رکھنے سے متعلق وہ آج تک سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ عورت شو بھا کی طرح خوبصورت نہ تھی۔ اس نے سفید، بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے چہرے پر ایک عجب بیزاری طاری تھی۔ اس کی دہلی پتلی ٹانگیں مردوں جیسی دکھائی دیتی تھیں اور اس نے اپنے برہنہ بازوؤں اٹھار کھے تھے جیسے وہ اپنی بند مٹھیوں سے اپنے کانوں پر مکے مارنے لگی ہو۔ دراصل یہ ٹانگوں پہ چڑھائی جانے والی جرابوں کا ایک اشتہار تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب شو بھا امید سے تھی اور اس کا پیٹ یکدم اس قدر پھول گیا تھا کہ شو کو مار اسے چھونے سے کترانے لگا تھا۔ شو کو مار کی نگاہ اس عورت کی تصویر پر پہلی دفعہ تب پڑی جب وہ شو بھا کے پہلو میں لیٹا اسے میگزین پڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب کچھ روز بعد اس نے اسی میگزین کو ردی کے ڈھیر میں پڑے دیکھا تو اس نے بہت احتیاط سے اس میں سے وہ صفحہ پھاڑ لیا جس پہ وہ تصویر تھی۔ ایک ہفتے تک وہ روزانہ کم از کم ایک دفعہ اس تصویر کو دیکھا کرتا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے دل میں اس عورت کے لیے شدید طلب پیدا ہوتی لیکن ایک آدھ منٹ کے بعد یہ غائب ہو جاتی اور اس کی جگہ حقارت اور نفرت کے جذبات ابھر آتے۔ یہ واحد بے وفائی تھی جو اس نے شو بھا سے کی تھی۔

بجلی جانے کی تیسری رات اس نے شو بھا کو سویٹر والا واقعہ سنایا اور چوتھی رات تصویر کا قصہ بتا ڈالا۔ جب وہ اپنے یہ راز منکشف کر رہا تھا تو شو بھا اسے خاموشی سے سنتی رہی۔ اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ نہ کوئی احتجاج نہ اظہار ملامت۔ وہ خاموش سنتی رہی اور جب وہ بیان کر چکا تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے دبا دیا۔ تیسری رات شو بھا نے

اسے اپنا قصہ سناتے ہوئے بتایا کہ ایک دفعہ ایک سیمینار میں لیکچر سننے کے بعد جب شو کو مار اپنے ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین سے اگلے سمسٹر میں فیلوشپ حاصل کرنے کے بارے میں تا دیر محو گفتگو رہا تھا تو اس کی ٹھوڑی پہ کھانے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹکا ہوا تھا۔ شو بھا کسی وجہ سے اس پر غصے تھی اس لیے اس نے اسے اشارے سے بھی آگاہ نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی ٹھوڑی صاف کر لے۔ چوتھی رات شو بھانے سے بتایا کہ اسے شو کو مار کی لکھی ہوئی واحد نظم جو یوٹا^۳ کے ایک ادبی میگزین میں شائع ہوئی تھی کبھی بھی پسند نہیں آئی تھی۔ یہ نظم شو کو مار نے شو بھا سے ملنے کے بعد لکھی تھی اور شو بھا کا خیال تھا کہ یہ مبالغہ آمیز جذباتیت سے بھرپور تھی۔

بجلی کے بند ہونے اور گھر کے تاریکی میں ڈوبنے نے ان کے اندر ایک تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ وہ جو ایک دوسرے سے بات چیت کرنا بھول گئے تھے اب دوبارہ بولنے لگے تھے۔ تیسری شب کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں صوفے پر بیٹھے تھے۔ جیسے ہی تاریکی پھیلی شو کو مار نے شو بھا کو ماتھے اور مونہ پر بوسے دینے شروع کر دیے۔ اس کا انداز بے ڈھب اور بکھرا بکھرا تھا۔ اگرچہ تاریکی تھی پر اس نے آنکھیں میچ لی تھیں اور اسے یقین تھا کہ شو بھا کی آنکھیں بھی بند ہیں۔ چوتھی رات وہ دونوں اندھیرے میں ساتھ ساتھ احتیاط سے سیڑھیاں چڑھتے بالائی منزل پر اپنی خواب گاہ میں پہنچے۔ انہوں نے شدت سے ایک دوسرے سے ایسے پیار کیا جسے وہ مدت ہوئی بھول چکے تھے۔ شو بھا خاموشی سے سسکیاں بھرتی اور اس کا نام سرگوشیوں میں لیتی رہی۔ اس کی انگلیاں تاریکی میں شو کو مار کی بھنؤں پہ گردش کرتی رہیں۔ پیار کرتے ہوئے شو کو مار سوچ رہا تھا کہ آنے والی رات وہ شو بھا کو کون سا ان کہا واقعہ سنائے گا اور شو بھا بھلا اس پر کیا راز افشا کرے گی۔ یہ سوال اسے ابھی سے بے چین کر رہے تھے۔ "مجھے بھیج لو، مجھے اپنی بانہوں میں بھیج لو شو بھا" پیار کرتے ہوئے وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ جب بجلی آئی تو وہ دونوں محو خواب ہو چکے تھے۔

پانچویں روز صبح کے وقت شو کو مار کو الیکٹرک کمپنی کی طرف سے ایک اور نوٹس میل باکس میں پڑا ہوا ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ بجلی کی لائنیں شیڈول سے پہلے ہی ٹھیک کر لی گئی ہیں۔ شو کو مار کو یہ پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ آج شام شو بھا کے لیے جھینگا ملائی ڈش بنائے گا لیکن جب وہ سٹور میں خریداری کے لیے پہنچا تو کھانا بنانے کے لیے اس کا جوش ماند پڑ چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ آج کی شام پہلے کی طرح نہیں گزرے گی کیونکہ آج بجلی بند نہیں ہوگی۔ سٹور میں جھینگے سوکھے سڑے اور بد رنگ نظر آرہے تھے اور کو کوٹ ملک کا ڈبہ گرد سے اٹا ہوا اور قیمت میں مہنگا تھا لیکن اس نے پھر بھی یہ چیزیں خرید لیں۔ اس نے ایک موم بتی اور شراب کی دو بوتلیں بھی رکھ لیں۔

اس روز شو بھا ساڑھے سات بجے گھر پہنچی۔ "میرا خیال ہے ہمارے ایک دوسرے کو ان کہی باتیں بتانے کے کھیل کا اختتام ہو گیا ہے" شو کو مار نے شو بھا کو نوٹس پڑھتے ہوئے دیکھا تو کہا۔ شو بھانے اس کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ "اگر تم

چاہو تو ابھی بھی موم بتیاں جلا سکتے ہو!" وہ آہستہ سے بولی۔ آج وہ جم نہیں گئی تھی۔ اس نے سوٹ کے اوپر برساتی پہن رکھی تھی اور اس کے چہرے پر میک اپ کی تازہ تہہ سبھی ہوئی تھی۔

جب وہ بالائی منزل پہ لباس تبدیل کرنے گئی تو شو کو مارنے اپنے لیے گلاس میں شراب انڈیلی اور ریکارڈ پہ تھیلو نیس مونک^{۱۲} کا وہ البم لگا دیا جس کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ شو بھا کو بہت پسند ہے۔

جب وہ واپس آئی تو دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ شو بھانے نہ اس کا شکریہ ادا کیا اور نہ اس کے بنائے کھانے کی تعریف کی۔ وہ چپ چاپ تاریکی مائل کمرے میں موم بتی کی روشنی میں کھانا کھاتے رہے۔ وہ ایک مشکل دور سے گزر آئے تھے۔ جھینگے کھانے کے بعد انہوں نے شراب کی ایک بوتل ختم کی پھر دوسری کھول لی۔ وہ اس وقت تک اکٹھے بیٹھے رہے جب تک موم بتی بجھنے کے قریب نہیں پہنچ گئی۔ شو بھانے کرسی پہ اپنا پہلو بدلا۔ شو کو مار سوچ رہا تھا کہ وہ ابھی کچھ کہنے والی ہے لیکن اس نے پھونک مار کر موم بتی گل کی، اٹھ کر لائٹ جلائی اور دوبارہ آکر بیٹھ گئی۔

"ہمیں لائٹ بند نہیں رکھنی چاہیے؟" شو کو مار نے پوچھا۔

شو بھانے اپنی پلیٹ ایک طرف کی اور ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کرتے ہوئے نرمی سے بولی: "میں چاہتی ہوں کہ جب میں یہ بات تمہیں بتاؤں تو تم میرے چہرے کو دیکھ رہے ہو!"

شو کو مار کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ جب شو بھانے اسے اپنے حاملہ ہونے کی خبر سنائی تھی تب بھی اس نے بالکل یہی الفاظ استعمال کیے تھے، تب بھی اس کا لہجہ بالکل آج کی طرح نرم تھا۔ اس دن وہ باسکٹ بال کا میچ دیکھ رہا تھا اور شو بھا نے ٹیلی ویژن بند کر دیا تھا۔ وہ اس وقت کوئی ایسی خبر سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ آج وہ تیار تھا۔ لیکن وہ شو بھا کے دوبارہ امید سے ہونے کی خبر نہیں سننا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے جھوٹ موٹ کی خوشی اپنے چہرے پر سبجانی پڑے۔ "میں کئی دنوں سے ایک اپارٹمنٹ کی تلاش میں تھی اور اب مجھے میرا مطلوبہ اپارٹمنٹ مل گیا ہے۔" شو بھانے اپنی آنکھوں کو ایسے سیڑھتے ہوئے کہا جیسے وہ شو کو مار کے بائیں کندھے سے پار کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس میں کسی کا قصور نہیں تھا، شو بھانے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ وہ جس کرب سے گزر رہے تھے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ کچھ وقت تنہا رہنا چاہتی تھی۔ ایک سکیورٹی ڈیپازٹ میں اس کے پاس کچھ رقم محفوظ پڑی تھی۔ یہ اپارٹمنٹ بیکن ہل پہ تھا اس لیے وہ اپنے دفتر پیدل آ جاسکتی تھی۔ اس شام گھر آنے سے پہلے وہ کرائے نامے پہ دستخط کر آئی تھی۔

شو بھا اس سے نظریں نہیں ملا رہی تھی لیکن شو کو مار اسے خالی خالی نظروں سے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ یہ تو واضح تھا کہ وہ یہ بات کہنے کے لیے پہلے سے تیاری کرتی رہی تھی۔ وہ ان جملوں کو دہراتی رہی تھی۔ اس سارے عرصے کے دوران

وہ اپارٹمنٹ تلاش کرتی رہی تھی، وہ یہ دیکھتی رہی ہوگی کہ کیا دستیاب اپارٹمنٹ میں پانی کا پریشر ٹھیک ہے اور وہ پراپرٹی ایجنٹ سے اس امر کی تصدیق کرتی رہی ہوگی کہ گرم پانی کے اخراجات کرائے میں شامل ہیں یا نہیں۔ یہ جاننا شوکومار کے لیے اذیت ناک تھا کہ شوبھان گزری شاموں میں اس سے جدا زندگی گزارنے کی تیاری کرتی رہی ہے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک انجانے سے درد نے اس کے دل کو جکڑ لیا ہو، جیسے اس کا سینہ کسی بھاری بوجھ تلے دب گیا ہو۔ کیا یہی وہ اطلاع تھی جو اسے بتانے کے لیے وہ پچھلی چار شاموں سے کوشش کر رہی تھی! کیا یہی اس کے کھیل کا انت تھا!

اب شوکومار کی باری تھی کہ وہ شوبھا کو وہ کچھ بتائے جو وہ آج تک اس سے چھپاتا رہا تھا۔ پچھلے چھ ماہ سے وہ یہ راز اپنے سینے میں دبائے ہوئے تھا۔ اس نے خود سے تہیہ کیا تھا کہ وہ شوبھا کو کبھی یہ نہیں بتائے گا۔ حمل کے دوران شوبھانے الٹراساؤنڈ کرواتے وقت ڈاکٹر سے کہا تھا کہ اسے بچے کی جنس کے بارے میں نہ بتایا جائے۔ وہ اسے ایک سرپرائز رکھنا چاہتی تھی۔ شوکومار اس پر راضی تھا۔

بچے کی موت کے بعد جب کبھی وہ دونوں اکٹھے بیٹھتے اور اس سانچے کا ذکر کرتے تو شوبھا ہمیشہ اس بات پر اطمینان کا اظہار کرتی کہ انہیں بچے کی جنس کا علم نہیں تھا ورنہ اسے یاد کر کے اور زیادہ اذیت ہوتی۔ ایک طرح سے شوبھا اپنے اس فیصلے پر ہمیشہ فخر کا اظہار کرتی۔ اس بھید میں پناہ لے کر وہ مطمئن تھی۔ شوکومار جانتا تھا کہ شوبھا کے خیال میں بچے کی جنس اس کے لیے بھی ایک راز ہی ہے۔ شوبھا کے خیال میں وہ بالٹی مور سے بہت دیر میں اسپتال پہنچا تھا اور اس وقت تک سب ختم ہو چکا تھا۔ لیکن شوکومار اتنا لیٹ نہیں تھا۔ جس وقت وہ اسپتال پہنچا تو بچے کا ابھی کریا کریم نہیں ہوا تھا۔ وہ بچے کو دیکھ سکتا تھا، اسے سینے سے لگا سکتا تھا۔ اول تو اسے مردہ بچے کو سینے سے لگانے کی تجویز سے جھر جھری سی آگئی لیکن جب ڈاکٹر نے کہا کہ ایسا کرنے سے اس کا غم کم ہو گا تب اس نے اپنے بچے کو اٹھا کر سینے سے چمٹا لیا۔ شوبھا اس وقت سو رہی تھی۔ نرسوں نے بچے کو صاف کر کے اس کے سوجے ہوئے پوٹے بند کر دیے تھے۔ اس کی آنکھیں اس دنیا پہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی تھیں۔

"ہمارے بی لڑکا تھا" شوکومار بولا، "اس کی جلد گندمی سے زیادہ سرخ تھی، اس کے سر پہ سیاہ بال تھے اور اس کا وزن پانچ پاؤنڈ تھا۔ اس نے مٹھیاں بالکل ایسے بھیج رکھی تھیں جیسے تم سوتے میں بھیجتی ہو۔"

شوبھانے اب اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے کے عضلات دکھ سے کھنچ گئے تھے۔ شوکومار نے کالج کے امتحان میں نقل کی تھی، اس نے میگزین سے عورت کی تصویر پھاڑ کر اپنے پاس رکھی تھی، وہ اس کی دی ہوئی سویٹر واپس کر آیا تھا اور اس نے دن دیہاڑے خود کو نشے میں ڈبو لیا تھا۔ یہ وہ باتیں تھیں جو شوکومار نے اسے بتائی تھیں۔

لیکن یہ بات کہ اس نے ان کے بچے کو اسپتال کے کسی تاریک کمرے میں سینے سے لگایا تھا اور اس وقت تک کھڑا رہا تھا جب تک اسپتال کی نرس اس سے بچہ لے کر چلی نہیں گئی، یہ شوبھا کے لیے بہت المناک انکشاف تھا۔ یہی وہ ایک چیز تھی جسے شوبھا زندگی بھر راز رکھنا چاہتی تھی۔ شو کو مارنے بھی خود سے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ یہ راز کبھی شوبھا کو نہیں بتائے گا کیونکہ وہ اس سے محبت کرتا تھا لیکن آج نہ جانے جذبے کی کس رو میں وہ یہ راز کھول بیٹھا تھا۔

شو کو مار اپنی جگہ سے آہستہ سے کھڑا ہوا اور خالی پلیٹیں سمیٹ کر سنک پر لے گیا لیکن انہیں کھنگالنے کی بجائے وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ باہر شام ابھی تک کسی قدر گرم تھی، بریڈ فورڈ فیملی کے میاں بیوی بازوؤں میں بازو ڈالے چہل قدمی کر رہے تھے۔ وہ جب بے خیالی میں اس جوڑے کو دیکھ رہا تھا تو اچانک کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ وہ فوراً پیچھے مڑا۔ شوبھا نے کمرے کی لائٹ بند کر دی تھی۔ وہ چپ چاپ چلتی ہوئی واپس میز تک آئی اور بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد شو کو مار بھی واپس اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ تاریکی میں دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ ان باتوں کو یاد کر کے رو رہے تھے جن کا اس سے پہلے انہیں علم نہ تھا۔

جدائی

یہ انیس سو اکتھتر عیسوی کے موسم خزاں کا قصہ ہے۔ ہمارے گھر ایک شخص ہر شام یہ آس لیے آیا کرتا تھا کہ اسے اپنے کچھڑے ہوئے گھر والوں کی کوئی خیر خبر مل سکے۔ اس کا نام پیر زادہ تھا اور اس کا تعلق ڈھاکا سے تھا۔ ڈھاکا اب بنگلہ دیش کا دارالحکومت ہے لیکن اُس زمانے میں یہ پاکستان کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ وہ سال بڑی ابتلا کا سال تھا۔ پاکستان خانہ جنگی کا شکار تھا۔ ملک کے مشرقی حصے میں رہنے والے ملک کے مغربی حصے میں رہنے والوں سے خود مختاری کے حصول کے لیے جنگ لڑ رہے تھے۔ ڈھاکہ مشرقی حصے میں رہنے والوں کا محور و مرکز تھا۔ مارچ کے مہینے میں پاکستانی فوج نے ڈھاکا پر چڑھائی کی تھی۔ اس شہر کو گولاباری کا نشانہ بنایا گیا تھا اور املاک کو نذر آتش کیا گیا تھا۔ استادوں کو گلیوں میں گھسیٹ کر گولیاں ماری گئی تھیں اور خواتین کو فوجی بیرکوں میں گھسیٹ کر ان کی عصمت دری کی گئی تھی۔ موسم گرما کے اختتام تک تین لاکھ لوگوں کے مرنے کی خبریں آرہی تھیں۔ پیر زادہ صاحب کا ڈھاکا میں ایک تین منزلہ مکان تھا اور وہ وہیں کی ایک یونیورسٹی میں باٹنی کے لیکچرر تھے۔ اسی شہر میں ان کی بیوی، جس سے ان کی شادی کو بیس سال بیت چکے تھے، اور سات بیٹیاں رہتی تھیں جن کی عمریں چھ سے سولہ سال کے درمیان تھیں۔ ان سب لڑکیوں کے نام الف کی آواز والے حروف سے شروع ہوتے تھے۔

"یہ ان کی ماں کا آئیڈیا تھا۔" ایک دن پیر زادہ صاحب نے اپنی بیٹیوں کے ناموں کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ انہوں نے بیٹیوں کی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر بھی اپنے بٹوے سے نکال کر دکھائی جس میں وہ ساتوں کسی سیاحتی مقام پر پنک مناتے ہوئے ایک قطار میں آلتی پالتی مارے بیٹھی تھیں۔ ان سب کی چٹائیں ربن سے بندھی ہوئی تھیں اور وہ کیلے کے درخت کے چوڑے چکے پتوں پر چکن تورمہ رکھ کر کھا رہی تھیں۔ "میں بھلا ان کے ناموں میں کیسے تمیز کروں؟ عائشہ، عامرہ، امینہ، عزیزہ،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تمہیں سمجھ آرہی ہے یا یہ کتنا مشکل ہے؟"

پیر زادہ صاحب ہر ہفتے اپنی بیوی کو خط لکھتے اور اپنی ہر بیٹی کے لیے بچوں کی تصویریں کہانیوں والی کتابیں بھیجتے لیکن ڈھاکہ میں باقی ہر چیز کی طرح ڈاک کا نظام بھی تہہ وبالا ہو چکا تھا۔ اس لیے پچھلے چھ ماہ سے پیر زادہ صاحب کو اپنے گھر والوں کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل پائی تھی۔ پیر زادہ صاحب امریکہ میں نیو انگلینڈ کے علاقے کے پودوں کے مطالعے کے لیے حکومت پاکستان کے عطا کردہ سکالرشپ پہ ایک سال کے لیے یہاں آئے تھے۔ موسم بہار اور گرما میں انہوں نے ورنمانٹ اور مین^{۱۵} کے علاقوں سے اپنا مطلوبہ ڈیٹا اکٹھا کیا تھا اور خزاں میں وہ بوسٹن کے شمال میں واقع یونیورسٹی میں اپنی تحقیقی دریافتوں پہ ایک مختصر کتاب لکھنے کے لیے قیام پذیر تھے۔ ہم بھی ان دنوں یہیں رہائش پذیر

تھے۔ پیرزادہ صاحب کے لیے یہ ریسرچ گرانٹ ایک بڑا اعزاز تھا لیکن جب ان کو ملنے والے پیسوں کو ڈالروں میں تبدیل کیا جاتا تو یہ کوئی بڑی رقم نہ بنتی تھی۔ اس وجہ سے وہ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں ایک ایسے کمرے میں رہ رہے تھے جہاں نہ ان کے پاس علیحدہ کچن کی سہولت تھی اور نہ ہی الگ سے کوئی ٹیلی ویژن! وہ ہمارے گھر کھانا کھانے اور شام کی خبریں دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔

شروع شروع میں تو میں یہ سمجھ ہی نہ پائی تھی کہ وہ ہمارے گھر کیوں آتے ہیں۔ اس وقت میری عمر کوئی دس سال کے قریب تھی۔ میرے والدین کا تعلق چونکہ انڈیا سے تھا اس لیے ہمارے جاننے والوں میں بہت سے انڈین شامل تھے۔ اس لیے مجھے اس بات پر تو حیرت نہیں تھی کی میرے امی ابو پیرزادہ صاحب کو اپنے ساتھ کھانے میں کیوں شریک کرتے تھے۔ یہ یونیورسٹی کا ایک چھوٹا سا کیمپس تھا۔ اینٹوں سے بنے تنگ تنگ راستوں اور سفید ستونوں والی عمارتوں پر مشتمل یونیورسٹی ایک چھوٹے سے گاؤں کے مضافات میں واقع تھی۔ میرے والدین کو اکثر یہ شکایت رہتی تھی کہ گاؤں کی سپر مارکیٹ سے سرسوں کا تیل تک نہیں ملتا، نہ ڈاکٹر فون کرنے پر گھروں میں جا کر مریضوں کو دیکھنے کے لیے دستیاب ہوتے اور نہ ہی پڑوسی بغیر دعوت کے کسی کے گھر آتے جاتے تھے۔ ان کمیوں کو پورا کرنے کے لیے میرے امی ابو ہر نئے سمسٹر کی ابتدا میں یونیورسٹی میں نئے آنے والوں کے ناموں کی فہرستیں نکال کر بیٹھ جاتے اور اپنے ہم وطنوں کی تلاش شروع کر دیتے۔ پیرزادہ صاحب کو بھی انہوں نے اسی طرح دریافت کر کے فون کیا تھا اور اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی تھی۔

میرے دماغ کے پردے پر پیرزادہ صاحب کے ہمارے گھر پہلی، دوسری یا تیسری دفعہ آنے کی کوئی یاد نقش نہیں لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ اس سال ماہ ستمبر کے اختتام تک میں ان کو اپنے گھر کے لوگ روم میں دیکھنے کی اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ ایک شام جب میں برف کے ٹکڑے فریج سے نکال نکال کر جگ میں ڈال رہی تھی اور میں نے امی کو الماری سے چوتھا گلاس نکال کے پکڑانے کے لیے آواز دی جو وہ کچن میں پالک اور گاجروں کی مکس سبزی بناتے ہوئے چیخ اور ایگزاسٹ فین کے شور میں نہ سن سکیں تو میں خود ہی الماری سے گلاس نکالنے کے لیے پیچھے مڑی۔

"یہ چوتھا گلاس کس کے لیے لیلیا؟" ابو نے سوال کیا جو فریج کے پاس ہی جھکے مٹھی میں کاجو بھر کر کھا رہے تھے۔

"ابو ایک گلاس ان انڈین انکل کے لیے جو ہمارے گھر آتے ہیں۔"

"پیرزادہ صاحب آج نہیں آئیں گے۔ اور ہاں پیرزادہ صاحب کو اب انڈین نہیں سمجھا جاتا" میرے والد نے اپنی

نفاست سے ترشی ہوئی داڑھی میں سے کاجو سے گرنے والے نمک کو صاف کرتے ہوئے گویا مجھ پہ انکشاف کیا۔

"بٹوارے کے بعد سے وہ ہندوستانی نہیں رہے۔ ہمارا ملک انیس سو سینتالیس میں دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔"

جب میں نے ابو کو بتایا کہ میں تو یہ سمجھا کرتی تھی کہ یہ ہمارے دیس کی برطانوی راج سے آزادی کا سال تھا تو وہ بولے: "ہاں! ایک ہی وقت میں ہم آزاد بھی ہوئے اور ہمیں دو ٹکڑوں میں کاٹ بھی دیا گیا۔" انہوں نے اپنی انگلی سے میز پر ایکس کا نشان بناتے ہوئے گویا وضاحت کی۔ "کسی کیک کی طرح ہمیں دو حصوں میں کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ یہاں ہندو وہاں مسلم۔ ڈھا کا اب ہندوستان کا حصہ نہیں رہا۔"

انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ بٹوارے کے وقت ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے گھروں کو نذرِ آتش کیا تھا اور بہت سوں کے نزدیک اب بھی ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا تصور تک محال تھا۔ مجھے یہ باتیں ناقابلِ فہم سی لگتی تھیں۔ پیر زادہ صاحب اور میرے امی ابو ایک ہی زبان بولتے تھے، وہ ایک ہی جیسے لطیفوں پہ ہنستے تھے اور دکھنے میں بھی لگ بھگ ایک جیسے ہی لگتے تھے۔ وہ سالن کے ساتھ آم کا اچار کھاتے اور شام کے کھانے میں چچ کی بجائے ہاتھوں سے چاول کھاتے تھے۔ میرے والدین کی طرح پیر زادہ صاحب بھی کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اپنے جوتے اتار دیتے، کھانے کے بعد وہ بھی ہاضمے کو درست رکھنے کے لیے سوئف چباتے، شراب سے دور رہتے اور چائے کے کپ میں سادہ بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھاتے تھے۔

لیکن ان سب اشتراکات کے باوجود ابو کا اصرار تھا کہ میں اس بنیادی فرق کو سمجھ لوں جو ہم میں اور پیر زادہ صاحب میں موجود تھا۔ اور یہ سمجھانے کے لیے وہ مجھے اپنی میز کے اوپر دیوار پر ٹنگے دنیا کے نقشے کے پاس لے گئے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے انہیں اس بات کا خوف تھا کہ کہیں میں انجانے میں پیر زادہ صاحب کو ہندوستانی کہہ کر ناراض نہ کر دوں۔ حالانکہ مجھے لگتا تھا کہ پیر زادہ صاحب شاید ہی کبھی کسی بات پر ناراض ہوتے ہوں گے۔

"پیر زادہ صاحب بنگالی ہیں لیکن وہ مسلمان ہیں۔" ابو نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اس لیے وہ مشرقی پاکستان میں رہتے ہیں انڈیا میں نہیں!" وہ اپنی انگلی بحر اوقیانوس، یورپ، بحیرہ روم اور مشرق وسطیٰ پر سے پھیرتے ہوئے نقشے کے نارنجی رنگ کے اس حصے پر ٹھہر گئے جس کی شکل کسی دیو ہیکل ہیرے جیسے تھی اور جس کے بارے میں امی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ کسی ایسی عورت سے ملتا جلتا ہے جس نے ساڑھی اوڑھ رکھی ہو اور اپنا بایاں بازو پھیلا رکھا ہو۔ نقشے کے اس حصے پر بہت سے شہروں کے ناموں کے گرد دائرے لگائے گئے تھے اور یہ بتانے کے لیے کہ میرے امی ابو نے ان شہروں کا سفر کر رکھا ہے ان کو لکیریں کھینچ کر آپس میں جوڑا گیا تھا۔ کلکتہ جو کہ ان کی جائے پیدائش تھا اس پہ ایک چھوٹا سا سرمئی رنگ کا ستارہ بنا کر اسے نمایاں کیا گیا تھا۔ میں نے اس وقت تک کلکتہ کا محض ایک دفعہ ہی سفر کیا تھا اور اس سفر کی کوئی بھی یاد میرے دماغ کے پردے پر موجود نہ تھی۔

"لیلیا دیکھو نقشے میں پاکستان ہندوستان سے مختلف رنگ میں دکھایا گیا ہے، یہ ایک مختلف ملک ہے۔" میرے والد نے

تعلیم حاصل کر رہی ہے؟"

ہمیں سکول میں امریکی تاریخ اور جغرافیہ پڑھایا جاتا تھا۔ اس سال اور اس سے پہلے گزرے ہر سال ہمیں یوں لگتا جیسے ہمیں تاریخ پڑھانے کی ابتدا ہر دفعہ امریکی جنگ آزادی سے کی جاتی ہے۔ ہمیں سکول بسوں میں بھر کر پلائی ماؤتھ کی چٹان^{۱۶} دکھانے، فریڈم ٹریلز^{۱۷} کی سیر کروانے اور بنکر ہل یادگار^{۱۸} دکھانے لے جایا جاتا۔ ہم رنگ برنگے کاغذوں ماڈل بناتے جن میں جارج واشنگٹن کو بپھرے ہوئے دریائے ڈیلوی^{۱۹} کو عبور کرتے ہوئے دکھایا جاتا۔ ہم کنگ جارج کی پتلی بناتے جس میں انہوں نے سفید چست پاجامہ پہن رکھا ہوتا اور ان کے بالوں میں سیاہ رنگ کاربن ٹکا ہوتا۔ جب ہمارے ٹیسٹ ہوتے تو ہمیں تیرہ امریکی نوآبادیوں کے خالی نقشے دے کر ان کے نام، تاریخیں اور ان کے دارالحکومتوں کے نام لکھنے کو کہا جاتا۔ میں اس میں اتنی ماہر تھی کہ آنکھیں بند کر کے یہ سوال حل کر لیتی تھی۔

اگلی صبح پیرزادہ صاحب حسب معمول چھ بجے ہمارے گھر آئے۔ اتنے دنوں کے میل ملاپ کے بعد اگرچہ وہ اور میرے ابو ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں رہے تھے لیکن وہ جب بھی آتے زبانی حال احوال پوچھنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے ہاتھ ضرور ملاتے۔

"تشریف لائیے! پیرزادہ صاحب کا کوٹ لے لو لیلیا!"

پیرزادہ صاحب نے حسب معمول نہایت نفیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ ان کے کالر پہ ریشمی ٹائی کی گرہ اور ان کے گلے میں مفکر تھا۔ ہر شام جب وہ ہمارے گھر آتے تو ان کا سوٹ، ان کی ٹائی اور ان کے مفکر کے ارغوانی، ہلکے سبز اور بھورے رنگ مل کر ایک دلکش امتزاج بنا رہے ہوتے تھے۔ پیرزادہ صاحب گھٹے ہوئے جسم کے مالک تھے اور اگرچہ ان کے پاؤں کی انگلیاں بے ڈھبی تھیں اور ان کی توند کسی قدر پھیلی ہوئی تھی لیکن پھر بھی ان کے مجموعی جسمانی ہیئت دلکش تھی۔ وہ جب کھڑے ہوتے تو ان کے انداز سے یوں لگتا جیسے انہوں نے دونوں ہاتھوں میں ایک ہی جیسے وزن کے سوٹ کیس اٹھا رکھے ہوں۔ ان کے کانوں پہ سفید ہوتے ہوئے بالوں کی جھال ایسی محسوس ہوتی جیسے انہیں باہر کی دنیا کے بے ڈھنگے شور سے بچا رہی ہو۔ ان کی پلکیں گھنی تھیں اور آنکھوں میں سرمے کی ایک لکیر سے دکھائی دیتی۔ ان کی بھاری بھر کم موچھوں کے کونے اوپر کی طرف بڑی لطافت سے مڑے رہتے۔ ان کے بائیں گال کے عین وسط میں کشمش کے کسی چپٹے دانے کی طرح ایک تل نکلا ہوا تھا۔ پیرزادہ صاحب ہمیشہ ایرانی بھیڑ کی کھال سے بنی ترکی ٹوپی اوڑھے رکھتے تھے اور میں نے کبھی انہیں ننگے سر نہیں دیکھا تھا۔

میرے ابو پیرزادہ صاحب کو ہمیشہ یہ پیشکش کیا کرتے کہ وہ انہیں گاڑی میں ہاسٹل سے اٹھلاتے ہیں لیکن پیرزادہ صاحب کو اپنے ہاسٹل سے ہمارے گھر تک کا سفر پیدل طے کرنا اچھا لگتا تھا۔ لگ بھگ بیس منٹ کی اس مسافت میں وہ

رستے میں پڑنے والے پیڑوں اور جھاڑیوں کا مشاہدہ کرتے جاتے۔ اس روز بھی جب وہ پیدل مارچ کے بعد ہمارے گھر پہنچے تو موسم خزاں کی ٹھٹھرتی ہوائ نے ان کی انگلیوں کے پوروں کو گلابی کر دیا تھا۔

"مجھے یہ خوف بے چین کر رہا ہے کہ ہمیں شاید سرزمین ہند پہ ایک اور ہجرت کا سامنا کرنا پڑے۔" انہوں نے آتے ہی ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

"اب تک تعداد نوے لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔" میرے ابو بولے۔

پیرزادہ صاحب نے اپنا کوٹ میرے حوالے کیا کیونکہ یہ میری گویا ایک طرح سے ڈیوٹی تھی کہ وہ جب بھی ہمارے گھر آئیں میں ان کا کوٹ لے کر سیڑھیوں کے نیچے بنی الماری میں لٹکا دوں۔ پیرزادہ صاحب کا سرمئی اور نیلے خانوں میں بٹا ہوا دھاری دار کوٹ نہایت اعلیٰ معیار کی اون کا بنا ہوا تھا اور اس کے بٹن کسی جانور کے سینگوں کو نہایت نفاست سے تراش کر بنائے گئے تھے۔ اس کوٹ کے ریشوں سے لیموؤں جیسی مدھر خوشبو اٹھ رہی تھی۔ کوٹ پر کسی معروف برانڈ کا کوئی ٹیگ جڑا ہوا نہیں تھا۔ صرف اندر کی طرف چمکدار سیاہ دھاگے کی جڑواں لکھائی میں ایک لیبل پر "زیڈ۔ سید ٹیلرز" کڑھا ہوا تھا۔ بعض دفعہ اس کوٹ کی جیب میں میپل کا ایک آدھ پتا بھی اٹکا ہوتا۔

پیرزادہ صاحب نے اپنے تسمے کھولے اور جوتے کمرے کے کونے میں جوڑ کر رکھ دیے۔ ہمارے ناہموار اور گیلے لان کی پیلی مٹی جوتوں کے تلووں سے چمٹی ہوئی تھی۔ کوٹ اور جوتوں سے آزاد ہونے کے بعد انہوں نے میرے گلے پر اپنی چھوٹی چھوٹی، بے تاب انگلیوں کو آہستہ سے یوں پھیرا جیسے دیوار میں کیل ٹھونکنے سے پہلے اس کی سختی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ پھر پیرزادہ صاحب میرے ابو کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے لونگ روم میں داخل ہوئے جہاں ٹیلی ویژن پر مقامی چینل سے خبریں چل رہی تھیں۔ جیسے ہی یہ دونوں صوفوں پر دراز ہوئے امی کچن سے قیمے کے کباب اور دھنیے کی چٹنی لے آئیں۔ پیرزادہ صاحب نے فوراً ہی ایک کباب اٹھالیا۔

"اب تو بس امید ہی کی جاسکتی ہے کہ ڈھاکہ میں بے گھر ہونے والوں کو پیٹ بھر کر کھانا مل رہا ہو۔" وہ دوسرا کباب اٹھاتے ہوئے گویا ہوئے۔ پھر جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے انہوں نے اپنے سوٹ کی جیب کو ٹٹولا اور ایک پلاسٹک کا چھوٹا سا انڈہ جس کے اندر دل کی شکل کی جیل کینڈیاں تھیں نکال کر مجھے دے دیا۔ "یہ اس گھر کی چھوٹی سی لیڈی کے لیے!" یہ کہتے ہوئے انہوں نے غیر محسوس سے انداز میں سر کو جھکایا۔

"پیرزادہ صاحب! یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں۔" امی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ہر رات اس کے لیے یہ کیوں لے آتے ہیں؟ آپ اس کی عادتیں بگاڑ رہے ہیں!"

"میں صرف ان بچوں کی عادتیں بگاڑتا ہوں جن کی عادتیں نہیں بگڑ سکتیں!"

یہ میرے لیے بڑا عجیب سالحہ ہوتا تھا جس کا میں خوف اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ انتظار کیا کرتی تھی۔ میں پیرزادہ صاحب کی اس بھری پری اور نفیس شخصیت کی موجودگی کے احساس سے گویا مسحور ہو جاتی تھی اور جب وہ میری طرف ایسے ڈرامائی سے انداز سے متوجہ ہوتے تو میں خود کو بہت اہم محسوس کرتی۔ لیکن ان کے لہجے اور حرکات و سکنات میں موجود بے تکلفانہ ٹھہراؤ مجھے نروس سا کر دیتا تھا اور کبھی مجھے یوں لگتا جیسے میں اپنے گھر میں اجنبی ہوں۔ یہ گویا اب ایک معمول کی رسم بن گئی تھی اور پہلے دن کے بعد کئی ہفتوں، جب تک ہم آپس میں کسی قدر بے تکلف نہیں ہو گئے، یہی وہ واحد لمحہ ہوتا جب پیرزادہ صاحب مجھ سے براہ راست مخاطب ہوتے تھے۔ میں کوئی ردِ عمل نہ دیتی، کوئی بات نہ کرتی اور بظاہر روز روز ملنے والی ان رنگ برنگی ٹافیوں اور چاکلیٹوں پہ کسی کیفیت کا اظہار نہ کرتی۔ اس تحفے سے میں ایسے مہبوت ہو جاتی کہ شکریہ بھی نہ کہہ پاتی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے صرف ایک دفعہ ایک ارغوانی رنگ کے چمکیلے کاغذ میں لپیٹی دلکش لولی پاپ ملنے پر پیرزادہ صاحب کو شکریہ کہا تھا اور اس پر وہ بولے تھے: "نہ، نہ، شکریہ کس لیے؟ میں بینک جاتا ہوں تو بینک والی لڑکی میرا شکریہ ادا کرتی ہے، دکان میں جاتا ہوں تو کیش کاؤنٹر پہ بیٹھا کیشئر میرا شکریہ ادا کرتا ہے، جب لا بیریرین کو طویل عرصہ کتاب اپنے پاس رکھنے کے بعد واپس کرتا ہوں تو لا بیریرین میرا شکریہ ادا کرتا ہے، جب ٹیلی فون آپریٹر لڑکی میری فون کال ڈھکا کا نہیں ملا پاتی تو وہ میرا شکریہ ادا کرتی ہے۔۔۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ میں اگر اس ملک میں، اسی مٹی میں دفن ہوا تو میرے جنازے پر بھی میرا شکریہ ادا کیا جائے گا!"

پیرزادہ صاحب کی دی ہوئی ان ٹافیوں کو بغیر کسی اہتمام کے فٹافٹ کھا جانا میرے خیال میں کسی طرح سے بھی مناسب نہ تھا۔ اس لیے میں ہر شام ملنے والے اس خزانے کو بڑے تزک و احتشام سے کسی قیمتی موتی یا کسی مدفون تہذیب کے انمول سکے کی طرح اس چھوٹی سی منقش صندلی صندوقچی میں رکھ دیتی جو دادی اماں کی نشانی تھی۔ دادی اماں اس میں چھالیا رکھ کرتی تھیں اور ہر صبح غسل کرنے کے بعد وہ اسی صندوقچی میں سے چھالیا نکال نکال کر چبایا کرتی تھیں۔ یہ دادی کی وہ واحد یادگار تھی جو میرے پاس تھی اور پیرزادہ صاحب کی ہمارے گھر آمد سے پہلے مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ میں اس صندوقچی میں کیا رکھوں۔ اب میں وقتاً فوقتاً کبھی دانت برش کرنے سے پہلے اور کبھی سکول سے واپسی پر یونیفارم ٹانگنے کے بعد اس صندوقچی کا ڈھکن کھول کر پیرزادہ صاحب کے دیے ہوئے ان میٹھے تحفوں سے لذت کام و دہن کرتی تھی۔

ہر رات کی طرح اس رات بھی ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھانے کی بجائے ہم لوگ کافی کی میز کے گرد ہی بچھن پھنسا کر بیٹھ گئے کیونکہ ڈائننگ ٹیبل سے ٹی وی صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہماری پلیٹیں ہمارے زانوؤں پر دھری تھیں اور ہم

خاموشی سے ٹیلی ویژن سکرین پر نظریں جمائے کھانا کھا رہے تھے۔ امی پکن سے ہمارے لیے یکے بعد دیگرے تڑکا لگی مسور کی دال، ناریل میں پکی سبز پھلیاں اور کشمش ملا کر دہی کی چٹنی میں پکائی گئی مچھلی کی ڈشیں لاتی رہیں۔ میں امی کی مدد کے لیے پانی کے گلاس، کٹے ہوئے لیموں اور سرخ مرچیں پکڑتی جا رہی تھی۔ یہ سب مصالحہ جات امی ابو ہر ماہ چائنا ٹاؤن سے لاتے تھے اور بوقت ضرورت ہم لوگ مصالحے کی ان رنگ برنگی بوتلوں میں سے مطلوبہ مصالحہ اپنے سالن پر چھڑک لیا کرتے تھے۔

ہر دفعہ کھانا کھانے سے پہلے پیر زادہ صاحب ایک عجیب سی حرکت کرتے۔ وہ اپنی سامنے کی جیب سے بغیر پٹے والی ایک نفرتی گھڑی نکالتے، اس کو چند لمحوں کے لیے اپنے بالوں بھرے کان کے قریب لاتے اور پھر اپنی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے اس کو تین دفعہ چابکدستی سے چابی دیتے۔ انہوں نے ایک دفعہ مجھے سمجھایا تھا کہ ان کی کلائی کی گھڑی کے برعکس یہ جیبی گھڑی ڈھاکہ کا ٹائم بتاتی تھی جو امریکا سے گیارہ گھنٹے آگے تھا۔ جب تک پیر زادہ صاحب کھانا کھاتے رہتے یہ گھڑی کافی کی میز پر ان کے سامنے تہہ کیے ہوئے کاغذی نیپکن پہ پڑی رہتی۔ اس دوران وقت دیکھنے کے لیے وہ شاید ہی اس کی طرف کبھی نگاہ اٹھاتے۔

جب سے مجھے ابونے یہ سمجھایا تھا کہ پیر زادہ صاحب ہندوستانی نہیں ہیں میں نے ان کی حرکات و سکنات کا بغور مشاہدہ شروع کر دیا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کس طرح ہندوستانیوں سے مختلف ہیں۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ان کی یہ جیبی گھڑی ان چیزوں میں سے ایک ہے جو انہیں ہم سے مختلف بناتی ہے۔ اس رات پیر زادہ صاحب جب اپنی جیبی گھڑی کو چابی بھرنے کے بعد کافی کی میز پر رکھ رہے تھے تو ایک عجیب سی بے چینی نے مجھے گھیر لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے زندگی ڈھاکہ سے گزر کر ہم تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے چشم تصور سے پیر زادہ صاحب کی بیٹیوں کو صبح اٹھتے، اپنے بالوں پہ ربن باندھتے، ناشتے کا انتظار کرتے اور اسکول کے لیے تیار ہوتے ہوئے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ہمارے کھانے اور ہمارے تمام کام ان سب کاموں کا محض ایک عکس تھے جو اس سے پہلے ڈھاکہ میں انجام پا چکے تھے۔ ہم سب جیسے پیر زادہ صاحب کے ڈھاکہ کی ایک بچھڑی ہوئی پر چھائیں تھے!

ساڑھے چھ بجے ٹیلی ویژن پہ قومی خبریں چلتی تھیں اس لیے ابونے انٹینا درست کر کے ٹی وی کی آواز کچھ اونچی کر دی۔ اس وقت میں عموماً کتاب پڑھنے میں خود کو مگن کر لیا کرتی تھی مگر اس رات ابونے اصرار کیا کہ میں ان خبروں کو بغور دیکھوں۔ ٹی وی اسکرین پہ گرد آلو سڑکوں پہ ریگتے ہوئے ٹینک، مسمار عمارتیں اور نامانوس سے درختوں پہ مشتمل جنگلوں میں پناہ لیتے مشرقی پاکستان کے پناہ گزین دکھائے جا رہے تھے جو ہندوستانی سرحد کی طرف خود کو بچانے کے لیے دوڑ رہے تھے۔ میں نے گہرے میالے پانیوں کی وسعتوں پہ تیرتی ہوئی ان چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو دیکھا جن کے

بادبان کسی دستی پنکھے کے پروں جیسے تھے، اس یونیورسٹی کو دیکھا جس کے ارد گرد خاردار تاریں لگا کر اسے بند کر دیا گیا تھا اور اخبارات کے ان دفاتر کے مناظر دیکھے جنہیں جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا۔ میں نے یہ سب دیکھتے دیکھتے مڑ کر پیر زادہ صاحب کو دیکھا۔ یہ سب مناظر ان کی آنکھوں کی پتلیوں میں چھوٹی چھوٹی شبیہوں کی صورت تیرتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے چہرے پہ جیسے تمام تاثرات منجمد ہو گئے تھے، وہ بظاہر شانت لیکن یوں چونکا ہوا کر بیٹھے تھے جیسے کوئی کسی انجان جگہ سے انہیں کچھ ہدایات دے رہا ہو۔

خبروں میں جب اشتہارات کا وقفہ آیا تو امی باورچی خانے سے مزید چاول لینے کے لیے اٹھ گئیں اور ابو اور پیر زادہ صاحب کسی جنرل کی خان کی پالیسیوں پہ اظہارِ تاسف کرنے لگے۔ وہ آپس میں ان ریشہ دوانیوں پہ تبادلہء خیال کر رہے تھے جن کے بارے میں مجھے کچھ علم نہ تھا اور اس تباہی کا ذکر کر رہے تھے جسے سمجھ پانا میرے لیے اس عمر میں ممکن نہ تھا۔

"دیکھو! تمہاری عمر کے بچوں کو اپنی بقا کے لیے کیا کیا کچھ کرنا پڑ رہا ہے!" ابو نے مجھے مچھلی کا ایک اور ٹکڑا پکڑاتے ہوئے کہا۔ لیکن میرے لیے اب مزید کچھ کھانا ممکن نہ رہا تھا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے اپنے ساتھ بیٹھے پیر زادہ صاحب کو دیکھا جنہوں نے گہرے سبز رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی اور جو خاموشی سے اپنی چاولوں کی پلیٹ کے درمیان کنواں سا بنا رہے تھے تاکہ اس میں دال ڈال سکیں۔ میری سمجھ کے مطابق وہ اس مزاج کے آدمی نہیں تھے کہ ایسے گھمبیر مسائل انہیں پریشان کر سکتے۔ میں سوچ رہی تھی کہ شاید ان کی خوش پوشاکی کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ خود کو ہر لمحہ ہر طرح کی خبر سننے کے لیے تیار رکھنا چاہتے تھے۔ مجھے لگتا جیسے وہ ایک لمحے کے نوٹس پر کسی بھی جنازے میں شریک ہو سکتے تھے۔ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اگر ابھی ٹیلی ویژن کی سکرین پر پیر زادہ صاحب کی ساتوں بیٹیاں ہنستی کھیلتی اور ہاتھ ہلاتی اپنی بالکونی میں کھڑی دکھائی دیں تو پیر زادہ صاحب کا کیا ردِ عمل ہو گا۔ میں چشم تصور سے دیکھ سکتی تھی کہ اگر ایسا ہو جائے تو وہ ایک دم کتنے شانت ہو جائیں گے۔ لیکن میرا یہ خیال محض خیال ہی رہ گیا!

اُس رات جب سونے سے پہلے میں نے اپنی ٹافيوں والی صندوقچی اٹھا کر اپنے بستر کے سرہانے رکھی تو مجھے اس روایتی طمانیت کا احساس نہ ہوا جو عموماً اس لمحے ہوا کرتا تھا۔ میں یہ کوشش کر رہی تھی کہ پیر زادہ صاحب، ان کے معطر اوور کوٹ اور ان سے جڑی اس بے ہنگم اور دکھتی ہوئی دنیا کو نہ سوچوں جس کا نظارہ آج ہم نے اپنے شاندار لونگ روم میں بیٹھ کر کیا تھا۔ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی کئی لمحوں تک میں ان سب کے سوا کچھ نہ سوچ سکی۔ میرے رگ و پے میں یہ خیال خوف کی انجانی لہریں دوڑا رہا تھا کہ کیا پیر زادہ صاحب کی بیوی اور بیٹیاں بھی اب ریگتے اور چیختے چلاتے اس ہجوم کا حصہ ہوں گی جو آج ہم نے ٹیلی ویژن اسکرین پر دیکھا تھا۔

اس خیال کو اپنے دماغ سے جھٹکنے کے لیے میں نے اپنی مسہری اور اس کے پیلے رنگ کے جھالردار پردوں پر نگاہ دوڑائی، سفید اور بنفشی رنگوں کے امتزاج سے بنے والے پیروں سے سچی دیواروں پہ ٹنگی اپنی کلاس کی فریم شدہ تصاویر کو دیکھا، پھر الماری کے دروازے کے ساتھ پنل سے بنے ان نشانات کو دیکھنے لگی جو میرے ابو ہر سال میری سالگرہ کے موقع پر میرے قد کی پیمائش کرنے کے بعد لکھ دیا کرتے تھے۔ لیکن میں نے اپنا دھیان بٹانے کی جتنی کوشش کی اتنا ہی یہ خیال میرے دماغ میں راسخ ہوتا چلا گیا کہ پیر زادہ صاحب کی بیوی اور بیٹیاں یقیناً ان ہنگاموں میں مرچکی ہوں گی۔ یہ سوچ کر مجھے ایک جھر جھری سی آگئی اور تب میں نے وہ کیا جو میں نے اس سے قبل کبھی زندگی میں سوچا بھی نہ تھا۔ میں نے صندوقچی میں سے ایک سفید چاکلیٹ نکالی اور اس کو اپنے مونہ میں رکھ کر اس وقت تک ساکت بیٹھی رہی جب تک یہ نرم نہیں ہو گئی۔ پھر چاکلیٹ کو آہستہ آہستہ چباتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ پیر زادہ صاحب کی بیوی اور بیٹیاں محفوظ و مامون رہیں۔ میں نے اس سے قبل کبھی کسی چیز کے لیے دعا نہیں مانگی تھی اور نہ ہی مجھے دعا کرنا سکھایا گیا تھا یا دعا کرنے کی کبھی تلقین کی گئی تھی لیکن میں نے خود سے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ موجودہ حالات میں یہی وہ کام ہے جو مجھے کرنا چاہیے۔ اس رات جب سونے سے پہلے میں اپنے دانت صاف کرنے واش روم گئی تو میں نے برش کرنے کا محض دکھاوا کیا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنی دعا کو بھی پیسٹ کے ساتھ کھگال کے مونہ سے باہر پھینک دوں۔ میں نے دانتوں کے برش کو پانی سے گیلا کیا، دانتوں کے پیسٹ کو اٹھا کر اس کی جگہ تبدیل کی تاکہ امی ابو کو شک نہ ہو کہ میں نے برش نہیں کیا اور چپ چاپ اپنے بستر پر آکر سو گئی۔ اس رات نیند کی آغوش میں جاتے ہوئے میری زبان پہ چاکلیٹ کی مٹھاس باقی تھی۔

ہمارے گھر کے لوگ روم میں جس جنگ کے بارے میں اس قدر تشویش پائی جاتی تھی دوسرے روز اسکول میں اس کا کسی نے تذکرہ تک نہ کیا۔ ہم نے کلاس میں معمول کے مطابق امریکی انقلاب کے بارے میں پڑھا، ٹیکسوں کے نظام میں پائی جانے والی نا انصافیوں کے بارے میں جانا اور امریکی آزادی کے اعلا میے میں سے اقتباسات یاد کیے۔ تفریح کے گھنٹے میں لڑکے دو ٹکڑوں میں بٹ کر، کچھ سرخ کوٹوں والے برطانوی فوجی اور کچھ امریکی انقلابی بن کر، دیوانہ وار پیٹلوں اور ہنڈولوں کے ارد گرد ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے رہے۔ کلاس میں ہماری استاد مسز کینن نے چاک بورڈ کے اوپر کسی فلم اسکرین کی طرح حرکت کرنے والے نقشے کی مدد سے ہمیں بحری جہاز مے فلاور^{۲۰} کے برطانیہ سے نو دریافت شدہ امریکا کی طرف پہلے سفر کے رستوں کی نشاندہی کی اور لبرٹی بیل^{۲۱} کا محل وقوع سمجھایا۔ ہماری کلاس میں ہر ہفتے دو بچے جنگ آزادی کے کسی نہ کسی پہلو پہ ایک رپورٹ بنا کر پیش کیا کرتے تھے اس لیے ایک روز مجھے بھی میری دوست ڈورہ کے ساتھ یارک ٹاؤن سرنڈر^{۲۲} کے بارے میں رپورٹ بنانے کے لیے سکول کی لائبریری

میں بھیج دیا گیا۔ مسز کینن نے ہمیں ایک کاغذ کی چٹ دی تھی جس پہ ان تین کتابوں کے نام لکھے تھے جو ہمیں کتابوں کی فہرست میں تلاش کر کے ان میں سے معلومات اکٹھا کرنی تھیں۔ ہمیں ہماری مطلوبہ کتابیں فوراً ہی مل گئیں اس لیے ہم ایک چھوٹے سے گول میز کے گرد بیٹھ کر انہیں پڑھنے اور ان میں سے نوٹس بنانے لگے۔ لیکن میں اپنی توجہ اس کام پہ مرکوز نہیں کر پار ہی تھی اس لیے میں اٹھ کر لائبریری کے اس حصے کی طرف چلی گئی جہاں میں نے "ایشیا" لکھا ہوا دیکھا تھا۔ مجھے اس حصے میں چین، انڈیا، انڈونیشیا، کوریا کے متعلق کتابیں دکھائی دے رہی تھیں۔ بالآخر میری ایک کتاب پر نظر پڑی جس پہ لکھا تھا "پاکستان: سرزمین اور لوگ"۔ میں نے ایک چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھ کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ میں ایک کے بعد ایک صفحہ پلٹتی چلی گئی۔ ان صفحات پہ دریاؤں، دھان کے کھیتوں اور فوجی یونیفارم پہنے مردوں کی تصویریں تھیں۔ کتاب میں ڈھاکہ کے متعلق ایک باب تھا۔ میں اس کی سالانہ بارش کی مقدار اور پٹ سن کی پیداوار کے متعلق پڑھنے لگی۔ جب ڈورہ الماریوں کے درمیان رستے پہ نمودار ہوئی تو میں ڈھاکہ کی آبادی کا چارٹ دیکھ رہی تھی۔

"تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟ مسز کینن لائبریری میں ہی ہیں، وہ ہمیں ہی دیکھنے آئی ہیں کہ ہم کام کر رہے ہیں یا نہیں۔" میں نے یہ سنتے ہی جھٹ سے کتاب بند کر دی۔ کتاب کے بند ہونے کی بلند آواز کے ساتھ ہی مسز کینن جلوہ گر ہوئیں اور ان کے پرفیوم کی تیز خوشبو نے اس تنگ سے رستے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ انہوں نے کتاب کو اس کے ایک کونے سے ایسے اٹھایا جیسے یہ میرے سوپر پہ اٹکا کوئی بال ہو۔ پھر انہوں نے ایک اچھتی ہوئی نگاہ کتاب کے عنوان پر دوڑائی اور دوسری نگاہ مجھ پہ ڈالی۔

"کیا یہ کتاب آپ کی رپورٹ کا حصہ ہے لیلیا؟"

"نہیں مسز کینن!"

"پھر اس کو دیکھنے کی میرے خیال میں کوئی ضرورت نہیں۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے کتاب کو واپس الماری میں اس کی جگہ پہ رکھ دیا۔

جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے خبروں میں ڈھاکہ کا ذکر کم سے کم تر ہوتا جا رہا تھا۔ اب اگر ڈھاکہ کی کوئی مختصر سی خبر نشر بھی کی جاتی تو وہ اشتہارات کے پہلے یا دوسرے وقفے کے بعد کی جاتی جب تمام اہم خبریں گزر چکی ہوتیں۔ ڈھاکہ میں اخبارات پر پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں، ان کی ترسیل کے راستے بند کر دیے گئے تھے اور ان کا گلا گھونٹ کر ان کی آواز کو دبایا جا رہا تھا۔ بعض دنوں میں تو، بلکہ اکثر دنوں میں، خبروں میں محض عمومی صورت حال کا ذکر کر کے مرنے والوں کی تعداد بتانے پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ سزائے موت پانے والے

شاعروں اور نذرِ آتش ہونے والے دیہاتوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اس سب کے باوجود پیر زادہ صاحب اور میرے امی ابوشام کی محفل میں تا دیر بیٹھے رہتے اور طرح طرح کے کھانوں سے لطف لیتے۔ خبروں کے بعد جب ٹیلی ویژن بند کر دیا جاتا اور امی برتن دھو کر فارغ ہو جاتیں تو یہ لوگ ایک دوسرے کو لطفنے اور پرانی کہانیاں سناتے اور چائے کی پیالیوں میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھاتے رہتے۔ جب کبھی سیاسی امور پر باتیں کر کر کے تھک جاتے تو پھر ان کے موضوعات سخن بدل جاتے۔ پھر پیر زادہ صاحب کی نیو انگلینڈ کے موسمی پودوں پر لکھی جانے والی زیرِ تصنیف کتاب پر بات ہوتی، ابو کی اگلی معیادِ ملازمت کے لیے نامزدگی کا ذکر چھڑتا یا امی کے بینک میں کام کرنے والے ساتھی امریکنوں کے کھانے پینے کی عجیب و غریب عادات پر اظہارِ تعجب کیا جاتا۔

اس رات بھی، معمول کے مطابق، جب کھانا کھانے کے بعد مجھے بالائی منزل پہ اپنے اسکول کا کام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا تو میرا دھیان ان کی باتوں کی طرف ہی لگا رہا۔ مجھے ان کے چائے پینے، کیسٹ پلیئر پر کشور کمار کے گانے سننے، کافی کی میز پہ سکریبل کھیلنے اور انگریزی لفظوں کے جہوں پر بحث کرنے اور ہنسنے کی آوازیں بڑی دیر تک آتی رہیں۔ میرا دل کر رہا تھا کہ میں بھی ان کی اس محفل میں شریک ہوتی۔ خاص طور پر میں پیر زادہ صاحب کو تسلی دینا چاہتی تھی۔ لیکن میں اس وقت پیر زادہ صاحب کے بیوی بچوں کے لیے چاکلیٹ کھانے اور ان کے محفوظ رہنے کی دعا کے سوا کچھ نہ کر سکتی تھی۔ یہ لوگ گیارہ بجے تک سکریبل کھیلتے رہے اور پھر شاید کہیں آدھی رات کو پیر زادہ صاحب اپنے ہاسٹل جانے کے لیے رخصت ہوئے۔ ہر رات کو بالائی منزل پر آجانے کے سبب میں نے کبھی پیر زادہ صاحب کو رخصت ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن ہر رات جب میں نیند کی آغوش میں جا رہی ہوتی تو مجھے ان کی مدہم ہوتی ہوئی آوازیں سنائی دے رہی ہوتی تھیں جن میں کسی نئے ملک کے بننے کی توقع کا اظہار کیا جاتا۔

اکتوبر کے مہینے میں ایک دن پیر زادہ صاحب نے ہمارے گھر میں آتے ہی پوچھا: "یہ لوگوں کے گھروں کے دروازوں پر نارنجی رنگ کی بڑی بڑی سبزیاں سی کیا ہیں؟ کیا پیٹھے کی کوئی قسم ہے؟" "نہیں یہ ذرا بڑی قسم کے کدو ہیں" امی نے جواب دیا۔ "لیلیا! سپر مارکیٹ جائیں تو مجھے یاد دلانا ہم بھی ایک لے آئیں گے۔"

"اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ کیا ظاہر کرتا ہے۔" پیر زادہ صاحب نے دوبارہ پوچھا۔ "اس کو اندر سے خالی کر کے جیک کی لالٹین^۳ بنائی جاتی ہے۔" میں نے باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "اس طرح! تاکہ لوگوں کو ڈرایا جاسکے۔"

"اب سمجھا!" پیر زادہ صاحب نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔"

اگلے روز امی دس پاؤنڈ وزنی ایک موٹا تازہ گول پمپکن لے کر آئیں اور اسے کھانے کی میز پر رکھ دیا۔ شام کے کھانے سے پہلے جب ابو اور پیر زادہ صاحب ٹیلی ویژن پہ مقامی خبریں دیکھ رہے تھے تو امی نے مجھے کہا کہ میں مار کر کی مدد سے اس پہ نقش بنادوں لیکن میں اس کا گودا نکال کر اسے ایسے ہی باقاعدہ لائین بنانا چاہتی تھی جیسے میں نے پڑوسیوں کو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا، چلو اس پہ چاقو سے آنکھیں اور مونہ بناتے ہیں!" پیر زادہ صاحب نے میری تائید کرتے ہوئے کہا۔ "آج خبریں رہنے دیتے ہیں۔" وہ یہ کہہ کر صوفے سے اٹھے اور بغیر کچھ پوچھے باورچی خانے میں چلے گئے۔ جب وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک لمبا ساندانے دار دھار والا چاقو تھا۔ انہوں نے میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ "کیا میں شروع کروں؟"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ ہم چاروں کھانے کی میز کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم اس میز کے گرد اکٹھے ہوئے تھے۔ ٹیلی ویژن بدستور چل رہا تھا لیکن کوئی اسے دیکھنے والا نہ تھا۔ میز کے کپڑے کو ہم نے اخباروں سے ڈھانپ دیا۔ پیر زادہ صاحب نے اپنی جیکٹ کرسی کی پشت پہ پھیلا دی، عقیق کے پتھر جڑے اپنے کف لنکس اتارے اور کف لگی شرٹ کی آستینیں کھینچ کر اوپر کر دیں۔

"پہلے اوپر والے حصے کو ایسے کاٹیں۔" میں نے اپنے ہاتھ کی انگلی سے گول نشان بناتے ہوئے انہیں ہدایت دی۔ انہوں نے پہلے ایک چھوٹا سا چیر لگایا پھر چاقو کو گول دائرے میں پمپکن کے اوپری حصے پہ گھمایا۔ جب وہ دائرہ مکمل کر چکے تو انہوں نے اس کٹے ہوئے حصے کو اس کی ڈنڈی سے اٹھالیا۔ یہ حصہ بڑی آسانی سے الگ ہو گیا۔ پیر زادہ صاحب نے ایک لمحے کے لیے پمپکن کے اوپر جھک کر اس کے اندر جائزہ لیا۔ امی نے انہیں ایک لمبا سا چچ پکڑایا جس کی مدد سے انہوں نے اندر موجود بیج اور ریشے نکال دیے۔ اسی اثنا میں ابو نے گودے سے بیج الگ کر کے انہیں بسکٹ رکھنے والی ٹرے میں سوکھنے کے لیے رکھ دیا تاکہ ہم بعد میں انہیں بھون سکیں۔ میں نے پمپکن کی بیرونی سخت سطح پر آنکھوں اور ناک کے لیے تین ٹکونیں کھینچیں اور پیر زادہ صاحب نے ٹھیک ٹھیک انہیں نشانات پر چاقو سے کھود کر آنکھیں اور ناک بنادی۔ اب مونہ کے بنانے کا مرحلہ باقی تھا بالخصوص یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ دانت کیسے بنائے جائیں۔ میں تھوڑا ہچکچائی۔ پھر پیر زادہ صاحب سے پوچھا:

"مسکراتے دانت بناؤں یا غصے سے کچکچاتے؟"

"تمہاری مرضی۔" پیر زادہ صاحب نے جواب دیا۔

میں نے درمیانی رستہ نکالا۔ سیدھی لائن کھینچ کر ایسے دانت بنادیے جو نہ جارحانہ تھے اور نہ ہی دوستانہ۔ پیر زادہ

صاحب نے میری کھنچی ہوئی لائنوں پر بغیر ہچکچائے یوں دانت بنانے شروع کر دیے جیسے وہ پمپکن کو کھود کر لائین بنانے کا کام ساری زندگی کرتے رہے ہوں۔ پیرزادہ صاحب ابھی یہ کام ختم کرنے ہی والے تھے کہ ٹیلی ویژن پہ بین الاقوامی خبریں چلنے لگیں۔ جب ڈھا کہ کانام لیا گیا تو ہم سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نامہ نگار ایک بھارتی عہدیدار کے حوالے سے بتا رہا تھا کہ اگر دنیا نے بھارتی سرحد پر مشرقی پاکستان سے آنے والے مہاجرین کے بوجھ کو کم کرنے کے کوئی اقدامات نہ اٹھائے تو بھارت کو پاکستان کے خلاف اعلان جنگ کرنا پڑے گا۔ یہ خبر دیتے ہوئے اس کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ ٹائی اور جیکٹ سے مبرا اس نے ایسا لباس پہن رکھا تھا جیسے وہ ابھی خود جنگ لڑنے جا رہا ہو۔ وہ اپنے دھوپ سے جھلسے ہوئے چہرے پہ ہاتھ کا چھبنا بنائے تقریباً چہینتے ہوئے یہ رپورٹ کیمرے کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

جنگ کا ذکر سنتے ہی پیرزادہ صاحب کے ہاتھوں سے چاقو پھسل کر یوں گرا کہ پمپکن کو نیچے تک کاٹا چلا گیا۔ "اوہ! سوری!" انہوں نے ایک ہاتھ یوں اپنے چہرے کی طرف بلند کیا جیسے کسی نے ان کے گال پہ تھپڑ جڑ دیا ہو۔ "میں۔۔۔ اوہ کتنی گڑبڑ ہو گئی۔ میں اس کی جگہ ایک اور پمپکن خرید لاؤں گا۔ ہم دوبارہ کوشش کریں گے۔" بالکل بھی نہیں۔ آپ کسی صورت کچھ بھی خرید کر نہیں لائیں گے۔ "میرے ابو جلدی سے بولے۔ انہوں نے پیرزادہ صاحب کے ہاتھ سے چاقو لے لیا اور جہاں چاقو نے گر کر گھاؤ سا بنا دیا تھا اس کے ارد گرد کا حصہ کاٹ کر اسے بھی دہانے کا حصہ بنا دیا۔ یوں مار کر سے میرے بنائے گئے دانت بالکل غائب ہو گئے اور ان کی جگہ ایک بڑا سا، لگ بھگ لیموں کے جتنا، چھید بن گیا۔ اب ہماری جیک کی لائین کی شکل پہ ایک پرسکون سا استعجاب طاری ہو گیا تھا۔ بھنویں اب غصیلی کی بجائے کسی ٹھٹھری ہوئی حیرت میں ڈولتی محسوس ہو رہی تھیں اور ان کے نیچے آنکھوں کی خالی مثلثیں جیسے ٹکلی باندھے ہمیں گھور رہی تھیں۔

ہالووین^{۲۴} کی رات میں نے چڑیل کا روپ دھار رکھا تھا اور ٹرک یا ٹریٹ^{۲۵} کی میری ساتھی ڈورا بھی چڑیل بنی ہوئی تھی۔ ہم نے سیاہ رنگ کے چونے پہن رکھے تھے جو سرہانے کے غلافوں کو رنگ کر بنائے گئے تھے اور سروں پہ کالے رنگ کی لمبی، مخروطی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں جن کے چوڑے چکے چھبے گتے سے بنے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے اپنے چہروں کو ڈورا کی امی سے ملنے والی ایک پرانی آئی شیڈ سے سبز رنگ میں رنگ لیا تھا۔ میری امی نے ہمیں چاولوں کے خالی دو بوری نما تھیلے دیے تاکہ ہم ان میں لوگوں سے ملنے والی ٹافیاں اور چاکلیٹیں ڈال سکیں۔ اس سال پہلی دفعہ ہمارے والدین نے ہمیں آس پڑوس میں اکیلے گھومنے کی اجازت دی تھی اس لیے ہم بہت پر جوش تھے۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ ہم دونوں میرے گھر سے ڈورا کے گھر جائیں گے جہاں پہنچ کے میں اپنے گھر فون کر کے بحفاظت

پہنچنے کی اطلاع دوں گی۔ پھر ڈور کی امی ہم دونوں کو اپنے ساتھ گاڑی میں واپس میرے گھر تک لائیں گی۔ میرے ابو نے ہم دونوں کو ایک ایک ٹارچ دی اور میری گھڑی کے وقت کو اپنی گھڑی سے ملایا۔ ہمیں ہر صورت نو بجے سے پہلے لوٹ کر آنا تھا۔

اس شام پیر زادہ صاحب جب ہمارے گھر تشریف لائے تو انہوں نے مجھے گلے کو ٹھنڈا رکھنے والی ٹافیوں کا ایک ڈبا تحفے میں دیا۔ ان ٹافیوں پہ چاکلیٹ کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔

"اس میں ڈالیں۔" میں نے اپنے تھیلے کا مونہ کھولتے ہوئے کہا۔ "ٹرک یا ٹریٹ!"

"مجھے لگ رہا ہے تمہیں آج کی شام میری کینڈی کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔" تھیلے میں ٹافیوں کا ڈبا ڈالتے ہوئے وہ بولے۔ انہوں نے پہلے میرے سبز رنگے چہرے کو غور سے دیکھا اور میری مخروطی ٹوپی پر نگاہ دوڑائی جس کو سر پہ بٹھائے رکھنے کے لیے میں نے اس کی ڈور ٹھوڑی کے نیچے باندھ رکھی تھی۔ پھر بڑے مہربان انداز میں انہوں نے میرے چوغے کے سنچاف کو اٹھا کر دیکھا۔ میں نے چوغے کے نیچے سویٹر اور زپ والی اوئی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ "ٹھنڈ تو نہیں لگے گی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا جس سے میری ٹوپی قدرے ٹیڑھی ہو گئی۔ پیر زادہ صاحب نے اسے ٹھیک کیا اور بولے: "اسے پہن کر سیدھے کھڑے رہنا ہی ٹھیک ہے۔"

ہماری سیڑھیوں کا نچلا حصہ اس شام ٹافیوں اور چاکلیٹوں کی ٹوکریوں سے سجا ہوا تھا اس لیے پیر زادہ صاحب نے اپنے معمول کے مطابق یہاں جوتے اتار کر رکھنے کی بجائے انہیں الماری میں رکھ دیا۔ انہوں نے اپنے اوور کوٹ کے بٹن کھولنے شروع کیے اور میں اس انتظار میں تھی کہ ان سے کوٹ لے کر ٹانگ دوں مگر اسی دوران ڈور نے مجھے واش روم سے آواز دی۔ اسے اپنی ٹھوڑی پر ایک تل بنانے کے لیے میری مدد کی ضرورت تھی۔ بالآخر جب ہم مکمل تیار ہو گئے تو امی نے مجھے اور ڈور کو آتش دان کے سامنے کھڑا کر کے ہماری تصویر اتاری اور ہم بیرونی دروازہ کھول کر روانگی کے لیے نکل پڑے۔ پیر زادہ صاحب اور میرے ابو جو آج لوگ روم نہیں گئے تھے دہلیز پہ آکھڑے ہوئے۔ باہر اندھیرا ہو چکا تھا۔ ہوا میں گیلے پتوں کی خوشبو رچی بسی تھی اور دروازے کے ایک طرف رکھی ہماری بنائی ہوئی جیک کی لائین بڑے جاندار انداز میں ٹمٹارہی تھی۔ دور سے تیز تیز دوڑتے قدموں، بڑے لڑکوں کی جانوروں جیسی چیخوں اور چھوٹے بچوں کے نمائشی لباسوں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ بڑی عمر کے لڑکے ہالوین کا لباس پہننے کی بجائے صرف چہرے پہ ربڑ سے بنے ماسک چڑھا کر لوگوں کو ڈرایا کرتے تھے۔ چھوٹے بچوں میں سے کچھ اتنے چھوٹے تھے کہ ان کے ماں باپ ان کو اٹھائے اٹھائے گھر گھر پھرتے۔

"کسی ایسے گھر نہیں جانا جس کے رہنے والوں سے آپ واقف نہ ہو۔" ابو نے ہمیں تنبیہ کی۔
 پیرزادہ صاحب کی بھنویں کھنچ گئیں۔ "کیا کوئی خطرہ بھی ہے؟"

"نہیں، نہیں۔" میری امی نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "سب گھروں کے بچے آج باہر ہوں گے۔ یہ یہاں کی ریت ہے۔"

"شاید مجھے بچوں کے ساتھ جانا چاہیے؟" پیرزادہ صاحب نے تجویز دی۔ وہ اچانک جیسے بہت تھکے تھکے اور بہت منحنی سے دکھائی دینے لگے تھے۔ دہلیز میں کھڑے ہوئے وہ اچانک جیسے بدل سے گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک ایسا خوف تھا جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سردی کے باوجود مجھے اپنے چونے کے نیچے پسینا آنے لگا۔
 "پیرزادہ صاحب لیلیا اپنی دوست کے ساتھ ہے، یہ دونوں بالکل محفوظ رہیں گی۔" میری امی بولیں۔
 "لیکن اگر بارش شروع ہو گئی؟ اگر یہ دونوں گھر کا رستہ بھول گئیں؟"

"آپ پریشان نہ ہوں۔" میں نے پیرزادہ صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ میں نے یہ الفاظ پہلی دفعہ پیرزادہ صاحب کو کہے تھے۔ یہ سادہ سے الفاظ ان کو کہنے کے لیے میں نے کئی ہفتوں کوشش کی تھی لیکن ناکام رہی تھی۔ اس لیے میں ان کے لیے اپنی دعاؤں میں ہی یہ الفاظ چپکے چپکے ادا کرتی رہتی تھی۔ پیرزادہ صاحب کے سامنے مجھے یہ سوچ کر شرمندگی ہو رہی تھی کہ اب میں نے ان کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے یہ الفاظ کہے ہیں۔

انہوں نے اپنی چھوٹی سی مضبوط انگلی سے میرے گال کو چھوا اور پھر انگلی پہ لگ جانے والے سبز رنگ کو اپنے دوسرے ہاتھ کی پشت پہ رگڑ دیا۔ "اگر یہ چھوٹی سی لیڈی اصرار کرتی ہے تو ٹھیک ہے!" انہوں نے اپنے سر کو روایتی انداز میں تھوڑا سا جھکاتے ہوئے کہا۔

ہم گھر سے روانہ ہوئے تو پاؤں میں چیریٹی اسٹور سے خریدے گئے سستے، نوکدار جوتوں کے سبب کسی قدر لڑکھڑاہے تھے۔ داخلی رستے سے جب ہم گلی کی طرف مڑنے لگے تو ہم نے الوداع کہنے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیرزادہ صاحب اور میرے امی ابو دروازے میں کھڑے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ امی ابو کے درمیان کھڑے پیرزادہ صاحب کا قد کچھ چھوٹا لگ رہا تھا۔

"یہ آدمی ہمارے ساتھ کیوں آنا چاہتا تھا؟" ڈورانے پوچھا۔

"ان کی بیٹیاں گم ہو گئی ہیں۔" میں نے بے خیالی میں جواب دیا لیکن مجھے فوراً احساس ہوا کہ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ مجھے لگا کہ میرے یوں کہنے سے ان کی بیٹیاں سچ مچ گم ہو جائیں گی، وہ سچ مچ کبھی اپنی بیٹیوں کو دوبارہ نہیں دیکھ پائیں گے۔

"تمہارا مطلب ہے ان کی بیٹیاں اغوا ہو گئی ہیں۔" ڈورانے وضاحت چاہی۔ "کسی پارک وغیرہ سے اٹھالی گئی ہیں؟"

"نہیں، میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ کہیں گم ہو گئی ہیں۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ پیر زادہ صاحب اپنی بیٹیوں کو بہت یاد کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے ملک میں رہتی ہیں اور پیر زادہ صاحب نے کافی عرصے سے انہیں نہیں دیکھا۔ میں بس یہ کہنا چاہتی تھی۔"

گھروں کے درمیان بنے چھوٹے چھوٹے رستوں پہ چلتے ہوئے ہم ایک ایک گھر کی گھنٹی بجاتے آگے بڑھتے رہے۔ کچھ لوگوں نے اپنے گھروں کی ساری بتیاں گل کر کے ایک پراسرار ماحول تخلیق کرنے کی کوشش کی تھی اور کچھ گھروں کی کھڑکیوں میں ربڑ کی بنی ہوئی چمگادڑیں لٹکی ہوئی تھیں۔ میک انٹرنیشنل کے دروازے پہ اک تابوت پڑا تھا۔ جیسے ہی ہم اس کے قریب پہنچے مسٹر میک انٹرنیشنل میں سے اٹھ کر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پہ چاک ملا ہوا تھا اور وہ کسی مردے کا بہروپ بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمارے تھیلے میں مٹھی بھر کینڈیاں ڈال دیں اور ہم آگے بڑھ گئے۔ بہت سے لوگوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے پہلی دفعہ کوئی ہندوستانی چڑیل دیکھی تھی جبکہ زیادہ تر نے خاموشی کے ساتھ ہمارے تھیلوں میں کینڈیاں ڈال دیں۔ رستوں پہ اپنی ٹارچوں کی متوازی روشنیوں کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ سڑک کے درمیان ٹوٹے ہوئے انڈے بکھرے پڑے تھے، کاروں پہ شیونگ کریم کا سپرے کیا گیا تھا اور درختوں کی شاخوں پہ جابجا ٹوائٹلٹ پیپر لٹکے ہوئے تھے۔

ڈورا کے گھر تک پہنچتے پہنچتے چیزوں سے بھرے بھاری بھر کم تھیلے اٹھانے کے سبب ہمارے ہاتھ تھک کر چور ہو چکے تھے اور پاؤں سوج کر درد کرنے لگے تھے۔ ڈورا کی امی نے چھالوں پر باندھنے کے لیے ہمیں پٹیاں دیں اور سیب کے جوس اور شکر والی مکئی سے ہماری تواضع کی۔ انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ میں نے اپنے گھر فون کر کے اپنی خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دینی ہے۔ جب میں نے فون کیا تو پس منظر سے ٹیلی ویژن کی آوازیں آرہی تھیں۔ امی نے میری خیریت سے پہنچنے کی اطلاع پر کسی خاص طمانیت کا اظہار نہیں کیا۔ جب میں نے ریسپور واپس رکھا تو مجھے احساس ہوا کہ ڈورا کے گھر میں تو ٹیلی ویژن بند پڑا تھا۔ ڈورا کے ابو کا ڈیوڑھی پر دراز کوئی میگزین پڑھ رہے تھے اور ان کے پاس ہی کافی کی میز پر وائن کا ایک گلاس دھرا تھا۔ ٹیپ پہ سیکسوفون ریکارڈ بج رہا تھا۔

جب میں اور ڈورا اپنی اپنی شام بھر کی کمائی کو ترتیب سے کر کے ایک ایک چیز گن چکے اور ایک دوسرے سے چیزوں کا تبادلہ کر کے مطمئن ہو چکے تو ڈورا کی امی مجھے گاڑی میں گھر چھوڑنے آئیں جس پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ ہمارے گھر کے داخلی رستے پر اس وقت تک رکی رہیں جب تک میں دروازے تک نہیں پہنچ گئی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں میں نے دیکھا کہ ہمارے پمپکن کو کسی نے چکنا چور کر دیا تھا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جابجا

گھاس میں بکھرے پڑے تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے محسوس ہوئے اور گلے میں اچانک جیسے پھانس سی لگ گئی۔ یوں جیسے کسی نے میرے گلے میں وہ چھوٹے چھوٹے کنکر بھر دیئے ہوں جو میرے ہر اٹھتے قدم کے ساتھ میرے دکھتے پیروں تلے چرچرا رہے تھے۔ میں نے اس توقع کے ساتھ گھر کا دروازہ کھولا کہ اندر وہ تینوں میرے استقبال کے لیے اسی طرح کھڑے ہوں گے جیسے انہوں نے ہمیں رخصت کیا تھا اور میں ان کے ساتھ مل کر اپنے پمپکن کی بربادی کا ماتم کروں گی لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ لونگ روم میں میری امی، ابو اور پیر زادہ صاحب صوفے پہ ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ٹیلی ویژن بند تھا اور پیر زادہ صاحب نے اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں پہ جھکا رکھا تھا۔

اس شام انہوں نے یہ سنا تھا کہ انڈیا اور پاکستان جنگ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہر گزرتی شام یہ خبریں لاتی کہ دونوں ملکوں کی فوجیں سرحدوں پہ آمنے سامنے کھڑی ہیں اور ڈھاکہ والے آزادی سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہیں۔ جنگ مشرقی پاکستان کی سرزمین پر لڑی جانی تھی۔ امریکا پاکستان کا ہمنوا تھا جبکہ سوویت یونین انڈیا کے ساتھ کھڑا تھا۔ جنگ کا سرکاری طور پر چار دسمبر کو اعلان کیا گیا اور اس کے ٹھیک بارہ دن بعد پاکستانی فوج نے، جو اپنی بنیادی سپلائی کے ذرائع سے تین ہزار میل دور لڑنے کے سبب کمزور پڑ چکی تھی، ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال دیے۔ مجھے یہ ساری تفصیلات اس لیے پتہ ہیں کہ میں نے اپنی تاریخ کی کتابوں میں یہ سب کچھ پڑھا ہے لیکن اس زمانے میں یہ سب کچھ میرے لیے کسی انوکھے معمے سے کم نہ تھا جس کی گتھیاں میں چند بکھری ہوئی خبروں سے سلجھانے کی کوشش کرتی تھی۔

جنگ کے ان بارہ دنوں میں مجھے یاد ہے کہ میرے ابو نے مجھے ساتھ بیٹھ کر خبریں دیکھنے کے لیے کہنا بند کر دیا تھا، پیر زادہ صاحب نے میرے لیے کینڈی لانے کی رسم منقطع کر دی تھی اور میری امی سوائے چاولوں اور ابلے انڈوں کے شام کے کھانے کے لیے کچھ اور بنانے کے لیے تیار نہ ہوتی تھیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کچھ راتوں میں جب پیر زادہ صاحب ہمارے ہاں ہی ٹھہر جاتے تو میں امی کے ساتھ مل کر ان کے لیے کاؤچ پہ چادر اور کمبل رکھ آتی۔ رات کے پچھلے پہر جب میرے امی ابو ملکتے میں اپنے رشتہ داروں کو جنگ کی تازہ ترین صورت حال جاننے کے لیے فون کرتے تو مجھے ان کے زور زور سے بولنے اور چلانے کی آوازیں آتیں۔ سب سے اہم یاد جو میرے دماغ کے پردے پر نقش ہے وہ یہ ہے کہ ان دنوں یہ تینوں ایسے لگتے تھے جیسے کہ ایک ہی فرد ہوں، جیسے وہ ایک ہی جسم ہوں، جیسے وہ ایک ہی خاموشی، ایک ہی ڈر تلے جی رہے ہوں۔

جنوری میں پیر زادہ صاحب ڈھاکہ لوٹ گئے۔ انہیں یہ دیکھنا تھا کہ ان کا تین منزلہ مکان جنگ کی ہولناکیوں سے کتنا محفوظ رہا تھا اور ان کے بیوی بچے کس حال میں تھے۔ دسمبر کے آخری عشرے میں ہمارا پیر زادہ صاحب سے رابطہ کم ہی رہا تھا کیونکہ وہ اپنی کتاب کا مسودہ مکمل کرنے میں مگن تھے اور ہم لوگ کرسمس منانے فلاڈیلفیا چلے گئے تھے

جہاں میرے امی ابو کے دوست رہتے تھے۔ جس طرح میرے دماغ کے پردے پر پیر زادہ صاحب کے ہمارے گھر پہلی دفعہ آنے کی کوئی یاد موجود نہیں اسی طرح ان کی آخری ملاقات کی بھی کوئی یاد میرے حافظے میں محفوظ نہیں۔ مجھے بس اتنا پتہ ہے کہ ایک دوپہر جب میں ابھی اسکول میں ہی تھی تو ابو پیر زادہ صاحب کو اپنی گاڑی میں ایئر پورٹ چھوڑ آئے تھے۔ اس کے بعد طویل عرصے تک ہمیں ان کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔

ہماری شا میں اسی طرح معمول کے مطابق گزرتی رہیں۔ بس فرق اتنا تھا کہ اب ان شاموں میں پیر زادہ صاحب اور ان کی جیبی گھڑی موجود نہ ہوتے۔ خبروں سے ہمیں پتہ چل رہا تھا کہ ڈھاکہ میں ایک پارلیمانی نظام حکومت قائم ہو چکا تھا اور یہ شہر اپنے زخموں کو مندمل کرنے کی کادشوں میں لگ گیا تھا۔ نئی بننے والی حکومت کے لیڈر شیخ مجیب الرحمن تھے جو حال ہی میں جیل سے رہا ہوئے تھے۔ انہوں نے اقوام عالم سے التجا کی تھی کہ وہ خانہ جنگی کے دوران تباہ ہونے والے دس لاکھ گھر دوبارہ بنانے کے لیے تعمیراتی سامان کے ذریعے بنگلہ دیش کی مدد کریں۔ بے روزگاری اور غذائی قلت کا خوف ان لاکھوں مہاجرین کا استقبال کر رہے تھے جو انڈیا سے لوٹ کر واپس اپنے گھروں کو آرہے تھے۔ میں اکثر اوقات ابو کی میز پر لگے نقشے پہ غور کرتی اور اس پیلے رنگ کے چھوٹے سے حصے میں، چشم تصور سے، پیر زادہ صاحب کو سوٹ پہنے پسینے میں شرابور اپنے خاندان کو تلاش کرتے ہوئے دیکھتی۔ یہ نقشہ اب یقیناً پرانا ہو چکا تھا کیونکہ اس کا پیلا سا چھوٹا حصہ اب ایک نیا ملک بن چکا تھا۔

کئی ماہ بعد ہمیں بالآخر پیر زادہ صاحب کی طرف سے نئے اسلامی سال کا ایک کارڈ اور مختصر سا خط ملا۔ ان کے بیوی بچے انہیں بخیریت مل گئے تھے۔ سب ٹھیک تھے اور ابتلا کا یہ پچھلا سال انہوں نے پیر زادہ صاحب کی بیوی کے ددھیال کے ہاں شیلانگ میں گزارا تھا جو ایک پہاڑی مقام تھا۔ ان کی ساتویں بیٹیاں اب کچھ اور لمبی ہو چکی تھیں لیکن انہیں ابھی بھی ان کے ناموں کی ترتیب یاد نہیں رہتی تھی۔ خط کے اختتام پہ انہوں نے ہماری میزبانی کا شکریہ ادا کیا تھا اور لکھا تھا کہ اب انہیں لفظ "شکریہ" کے معانی ٹھیک ٹھیک سمجھ آ گئے تھے لیکن وہ اب بھی یہ سمجھتے تھے کہ یہ لفظ ہمارے لیے ان کی ممنونیت کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی نہیں کر سکتا۔

خوشی کی اس خبر کا جشن منانے کے لیے امی نے اس شام خصوصی کھانے کا اہتمام کیا۔ جب ہم کافی کی میز کے ارد گرد کھانے کے لیے بیٹھ گئے تو ہم نے اظہارِ مسرت کے لیے اپنے اپنے پانی کے گلاس ہوا میں بلند کر کے ایک دوسرے سے ٹکرائے لیکن میں احساسِ مسرت کی اس کیفیت سے عاری تھی جس کی مجھے توقع تھی۔ اگرچہ میں نے پیر زادہ صاحب کو کئی مہینوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن آج مجھے پہلی دفعہ ان کی عدم موجودگی کا شدت سے احساس ہوا۔ اس وقت پیر زادہ صاحب کے نام پہ گلاس ہوا میں بلند کرتے ہوئے مجھ پہ منکشف ہوا کہ ہزاروں میل دور بیٹھے اپنوں کو یاد

کرنے کا احساس کیا چیز ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں پیر زادہ صاحب کے، ان کی بیوی اور بیٹیوں سے مہینوں دوری کے، دکھ کو پوری طرح محسوس کر رہی ہوں۔ ہمیں پتہ تھا کہ اب پیر زادہ صاحب کبھی ہمارے پاس لوٹ کر امریکا نہیں آئیں گے اور میرے امی ابو کا یہ خیال درست تھا کہ ہم زندگی میں کبھی دوبارہ ان سے نہیں مل پائیں گے۔ جنوری سے میرا معمول تھا کہ ہالووین پہ میں نے جو کینڈیاں اکٹھی کی تھیں میں ہر رات ان میں سے ایک کینڈی پیر زادہ صاحب کے بیوی بچوں کے بخیریت ہونے کی دعا کے ساتھ کھاتی تھی۔ اس رات اس رسم کی ضرورت باقی نہ رہی تھی اس لیے میں نے باقی کینڈیاں اٹھا کر پھینک دیں۔

دکھوں کا ترجمان

چائے کے اسٹال پہ مسٹر اور مسز داس میں اس بات پہ تکرار جاری تھی کہ ٹینا کو ٹائلٹ کون لے کر جائے گا۔ آخر کار جب مسٹر داس نے یاد دلایا کہ اس نے لڑکی کو پچھلی رات نہلایا بھی تھا تو مسز داس نے گویا ہار مان لی۔ اپنی سفید ایمبیسڈر کار کے عقبی آئینے میں کاپاسی نے بیگم داس کو سست روی سے گاڑی کی پچھلی سیٹ سے اترتے ہوئے دیکھا۔ مسز داس کی مونڈی ہوئی ٹانگوں کا غالب حصہ برہنہ تھا۔ بیٹی کو واش روم کی طرف لے کر جاتے ہوئے اس نے بیٹی کا ہاتھ تھامنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

یہ لوگ سو ریامندر کا درشن کرنے کو نارک^{۲۶} جا رہے تھے۔ ہفتے کا دن تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا لیکن وسط جولائی کی حدت کو سمندر کی خنک ہواؤں نے کسی قدر معتدل کر دیا تھا اس لیے گھومنے پھرنے کے لیے یہ ایک بہترین موسم تھا۔ عام طور پر کاپاسی اپنا سفر شروع کرنے کے بعد اتنی جلدی کہیں نہیں رکھتا تھا لیکن اس روز ہوٹل سینڈی ولا سے اس خاندان کو لے کر چلے ابھی پانچ منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ لڑکی نے واش روم جانے کی حاجت کا اظہار کر دیا تھا۔ کاپاسی نے جب پہلی دفعہ مسٹر داس اور ان کی بیگم کو ہوٹل کے دروازے پہ بچوں کے ساتھ کھڑے دیکھا تو اس کے دل میں جو پہلا خیال اٹھا وہ یہ تھا کہ یہ جوڑا بہت کم عمر ہے۔ شاید یہ دونوں ابھی تیس کے بھی نہیں ہوں گے۔ ٹینا کے علاوہ ان کے دو بیٹے رونی اور بوبی تھے جن کی عمریں ایک دوسرے کے بہت قریب قریب تھیں۔ دونوں لڑکوں کے دانتوں پہ تانبے کی تاروں کی قطار سی جڑی تھی۔ یہ لوگ شکل و شبہات سے تو ہندوستانی لگتے تھے تاہم ان کی وضع قطع غیر ملکیوں جیسی تھی۔ بچوں نے اکڑے ہوئے شوخ رنگ کے انگریزی لباس پہن رکھے تھے اور ان کی ٹوپوں کے نمائشی چھجے نیم شفاف تھے۔ کاپاسی غیر ملکی سیاحوں کا عادی تھا۔ انگریزی جاننے کے سبب اس کو اکثر غیر ملکی سیاحوں کو گھمانے بھیجا جاتا تھا۔ ابھی اگلے روز ہی اس نے سکاٹ لینڈ سے آئے ایک بوڑھے جوڑے کو شہر کی سیر کروائی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کے چہروں پہ چھوٹے چھوٹے داغ تھے اور ان کے سروں پہ سفید بال روئی کے گالوں کی طرح دکھتے تھے اور یہ بال اتنے چھدرے تھے کہ سورج کی حدت سے جھلسی ہوئی ان کے سر کی جلد صاف دکھائی دیتی تھی۔ اُس روکھے پھیکے جوڑے کے مقابلے میں مسٹر داس اور ان کی بیگم کے سنولائے ہوئے چہرے زیادہ دلکش لگ رہے تھے۔ اپنا تعارف کروانے کے بعد کاپاسی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر انہیں نمستے کہا لیکن مسٹر داس نے کسی امریکی کی طرح اس سے ہاتھ ملایا اور اس زور سے دبایا کہ کاپاسی کی کہنی تک جھنجھنا اٹھی۔ مسز داس نے ہاتھ ملانے کی بجائے محض رسمی مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔ اس کے چہرے پہ گرمجوشی کا کوئی تاثر نہ

تھا۔

چائے کے اسٹال کے سامنے انتظار کرتے ہوئے اچانک رونی، جو دونوں لڑکوں میں سے کچھ بڑا لگتا تھا، اچھل کر گاڑی کی پچھلی سیٹ سے اتر۔ اس کی توجہ قریب ہی کھوٹے سے بندھی ایک بکری نے اپنی طرف کھینچ لی تھی۔

"اسے ہاتھ نہ لگانا۔" مسٹر داس نے آواز لگائی اور کاغذی جلد والی سیاحتی کتاب سے نگاہ اٹھا کر رونی کو دیکھا۔ کتاب پہ بڑے بڑے پیلے حروف میں "انڈیا" لکھ ہوا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی چھپائی مقامی نہ ہو۔ مسٹر داس کی آواز میں ایک طرح کا تذبذب اور کچھ نسوانیت سی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی آواز میں ابھی مکمل طور پر مردانہ بختگی نہیں آئی۔

"میں اسے ایک چپو نگم دینا چاہتا ہوں۔" لڑکے نے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

مسٹر داس اپنی کار سے نکلا اور ایک لمحے کے لیے بیٹھک سی لگا کر اپنی ٹانگوں کو سیدھا کیا۔ اس کی داڑھی اور مونچھیں منڈی ہوئی تھیں اور وہ ہو بہو رونی کا ہی ایک بڑا اور ژن لگ رہا تھا۔ اس کی ٹوپی کا چھباجوشخ نیلے رنگ کا تھا اور اس نے نکر، ٹی شرٹ اور نرم جوتے پہن رکھے تھے۔ گلے میں لٹکا ہوا کیمرہ اور اس کا لمبا چوڑا عدسہ اور اس عدسے پہ بنے نشانات ہی وہ واحد پیچیدہ چیز تھے جو اس کے جسم پہ موجود تھے۔ بکری کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے رونی کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے لیکن اسے روکنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ "بو بی! دیکھو تمہارا بھائی کچھ الٹا سیدھا نہ کر دے۔"

"کچھ نہیں کرے گا۔" بو بی نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ وہ کاپاسی کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان تھا اور اپنے سامنے لگی گینش دیوتا کی تصویر کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔

"پریشان نہ ہوں۔ یہ پالتو بکریاں ہیں کچھ نہیں کہتیں۔" کاپاسی نے مسٹر داس کو تسلی دی۔ کاپاسی کی عمر چھیالیس سال تھی اور اس کے سر کے بال کچھ تو جھڑ چکے تھے اور جو باقی تھے ان میں بھی چاندی اتری ہوئی تھی لیکن اس کی گندمی رنگت اور بے شکن پیشانی سے، جس کا وہ فرصت کے لمحات میں کنول کے پھولوں سے کشید کیے گئے تیل والے بام سے مساج کیا کرتا تھا، یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ نوجوانی میں کیسا لگتا ہو گا۔ اس نے خاکستری رنگ کی پتلون اور اسی کی ہم رنگ بوشرٹ پہن رکھی تھی جس کی آستینیں آدھی اور کالر کچھ زیادہ لمبے تھے۔ کسی جیکٹ کے اسٹائل میں بنی یہ بوشرٹ کمر تک جا کر کچھ تنگ ہو گئی تھی۔ اس یونیفارم کے لیے کپڑے اور سلائی کے انتخاب میں اس نے خاص احتیاط برتی تھی کیونکہ اسے ڈرائیونگ کرتے ہوئے گھنٹوں یہی لباس پہننا پڑتا تھا۔ اس کپڑے کی خاص بات یہ تھی کہ تادیر پہنے رکھنے کے باوجود اس پہ سلوٹیں نہیں پڑتی تھیں اور نہ اس کی استری ٹوٹتی تھی۔ کاپاسی نے ونڈ شیلڈ سے

رونی کو بکری کے گرد دائرے میں گھومتے ہوئے دیکھا۔ رونی نے گھومتے گھومتے بکری کو ایک طرف سے چھو اور پھر گاڑی کی طرف واپس بھاگا۔

"آپ چھوٹی عمر میں انڈیا سے گئے تھے؟" جب مسٹر داس گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ دوبارہ بیٹھ چکے تو کاپاسی نے سوال کیا۔ "نہیں نہیں۔ میں اور مینا دونوں امریکا میں ہی پیدا ہوئے۔" مسٹر داس نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں اچانک ایک اعتماد سا بھر گیا تھا۔ "ہم دونوں وہیں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ ہمارے والدین اب یہاں رہتے ہیں، آسن سول^۲ میں۔ یہ اب ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم ہر دو سال بعد ان سے ملنے ہندوستان آتے ہیں۔" اس نے مڑ کر لڑکی کو دیکھا جو دوڑتے ہوئے گاڑی کی طرف آرہی تھی۔ اس کے فراق کے ارغوانی ربن اس کے پتلے پتلے گندمی کندھوں پہ بے طرح جھول رہے تھے۔ اس نے اپنے کندھے سے ایک گڑیا چپکار کھی تھی جس کے سنہری بال ایسے لگتے تھے جیسے کسی نے کند قینچی سے بطور سزا کاٹ ڈالے ہوں۔

"ٹینا پہلی دفعہ انڈیا آئی ہے، ہے نا ٹینا؟"

"میں نے اب واش روم نہیں جانا۔" ٹینا نے گویا اعلان کیا۔

"مینا کہاں ہے؟" مسٹر داس نے اس سے پوچھا۔

کاپاسی کو یہ بات بڑی عجیب لگی کہ ٹینا سے بات کرتے ہوئے مسٹر داس نے اپنی بیوی کو اس کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ ٹینا نے چائے کے اسٹال کی طرف اشارہ کیا جہاں مسز داس اس آدمی سے کچھ خرید رہی تھی جس نے بدن پہ محض جاناگیا پہن رکھا تھا۔ جب مسز داس واپس گاڑی کی طرف آنے لگی تو چائے کے اسٹال پہ ایسے ہی ننگ دھڑنگوں میں سے کوئی دل جلا ہندی فلم کا ایک گانا گانے لگا لیکن مسز داس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ غصے یا الجھن کی کوئی رمت اس کے بشرے سے عیاں نہ تھی۔ شاید وہ گانے کے بول سمجھ ہی نہیں پائی تھی۔

کاپاسی نے گاڑی کی طرف بڑھتی ہوئی مسز داس کو غور سے دیکھا۔ اس نے سرخ اور سفید خانوں والی اسکرٹ پہن رکھی تھی جو اس کے گھٹنوں سے اوپر ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے تنگ بلاؤز کی وضع قطع ایسی تھی جیسی کسی مرد کی بنیان ہو اور اس پہ عین چھاتی پہ سٹرابری کی شکل کا ڈیزائن کڑھا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں میں لکڑی کی چوکور ایڑی والی کھڑی جوتی تھی۔ مسز داس کا قد ناٹا اور جسم فرہی مائل تھا اور اس کے ہاتھ ایسے لگ رہے تھے جیسے چھوٹے چھوٹے نرم پنچے ہوں۔ اس نے اپنے ناخنوں کی گلابی پالش کو ہونٹوں کی گلابی لپ اسٹک سے میچ کر رکھا تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کی جھلک اس بڑے سے گہرے بھورے رنگ کے چشمے میں بھی موجود تھی جو اس نے اپنی آنکھوں پہ سجا رکھا تھا۔ اس کے ترشے ہوئے بال جو سر کے ایک طرف گرے ہوئے تھے اس کے شوہر کے بالوں سے کچھ ہی لمبے تھے۔ اس کے

کندھے پہ جھولتا بیگ کسی ٹوکری کے انداز میں ڈیزائن کیا گیا تھا اور یہ اس کے دھڑکتا ہی بڑا تھا اور اس میں سے پانی کی ایک بوتل کا سراہا باہر جھانک رہا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ گاڑی کے پاس پہنچی۔ اس کے ہاتھ میں اخباری کاغذ سے بنا ہوا الفافہ تھا جس میں نمکین مونگ پھلی اور مرمڑے بھرے ہوئے تھے۔

کاپاسی مسٹر داس کی طرف پیچھے مڑا۔ "امریکا میں آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"ہم نیو جرسی میں نیو برنزوک شہر میں رہتے ہیں۔"

"یہ نیویارک کے ساتھ ہی ہے؟"

"ہاں بالکل! میں وہاں ایک مڈل اسکول میں پڑھاتا ہوں۔"

"کون سا مضمون؟"

"سائنس۔ میں اپنے اسکول کے بچوں کو ہر سال نیویارک میں نیچرل ہسٹری میوزیم دکھانے لے جاتا ہوں۔ آپ کہہ سکتے ہو کہ دونوں شہروں میں کافی مماثلت ہے۔ جیسے آپ میں اور مجھ میں ہے! ویسے آپ کتنے عرصے سے یہ سیاحتی گائیڈ کا کام کر رہے ہو؟"

"پانچ سال سے۔"

"مندرجہ ذیل میں ابھی اور کتنی دیر لگے گی؟" مسٹر داس نے گاڑی میں بیٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے سوال کیا۔

"تقریباً اڑھائی گھنٹے۔" کاپاسی نے جواب دیا۔

یہ سن کر مسٹر داس نے بے زاری سے آہ بھری یوں جیسے وہ اپنی ساری زندگی سفر پر رہی ہو اور اسے ایک پل سستانے کا موقع بھی نہ ملا ہو۔ وہ بمبئی کے ایک انگریزی زبان میں چھپے فلمی میگزین کو تہہ کر کے خود کو ہوا دینے لگیں۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ سوریا مندر پوری^{۲۸} سے شمال کی طرف صرف اٹھارہ میل دور ہے۔" مسٹر داس نے سیاحتی کتابچے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"کونارک کی طرف جانے والی سڑکیں خستہ حال ہیں اور یہ فاصلہ بھی دراصل باون میل ہے۔" کاپاسی نے وضاحت کی۔

مسٹر داس نے اس کی بات سن کر سر ہلایا اور اپنے کیمرے کی پٹی کو گلے میں اس جگہ سے ٹھیک کیا جہاں رگڑ کھانے کے سبب اس نے سرخ نشان چھوڑ دیا تھا۔

گاڑی کا اگنیشن آن کرنے سے پہلے کاپاسی نے ہاتھ بڑھا کر پچھلے دونوں دروازوں کے لاک ہونے کی تسلی کی۔ جیسے ہی گاڑی روانہ ہوئی چھوٹی لڑکی نے اپنی طرف والے دروازے کے لاک ہینڈل کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ وہ کبھی

اسے اوپر کی طرف کھینچتی اور کبھی نیچے کی طرف دبا دیتی لیکن مسز داس نے اسے منع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ پچھلی سیٹ میں ایک کونے کی طرف ڈھیلی ڈھالی بیٹھی تھی اور اس نے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے مَر مَرے بھی کسی اور کو پیش نہیں کیے تھے۔ مسز داس کے دائیں بائیں رونی اور ٹینا بیٹھے اپنی اپنی بل گم پھلارہے تھے۔

"اُدھر دیکھو!" گاڑی کی رفتار جیسے ہی کچھ سبک ہوئی بوبی پکارا۔ اس نے سڑک کنارے لمبے درختوں کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "دیکھو، دیکھو!"

"بندر!" رونی نے خوشی سے چلاتے ہوئے نعرہ مارا۔ "واؤ!"

بندر درختوں کی ٹہنیوں اور شاخوں پہ غول در غول بیٹھے تھے۔ ان کے بدن روپہلے اور چہرے مکمل سیاہ تھے۔ ان کی بھنویں یوں آپس میں مدغم تھیں کہ آنکھوں پہ بالوں کی ایک ہی متوازی قطاری دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے سر کے بال کھڑے تھے اور لمبی سرمئی دھندلی شاخوں سے رسیوں کی طرح لٹک رہی تھیں۔ کچھ بندر اپنے سخت، کھر درے ہاتھوں سے اپنے بدن کھجانے میں مشغول تھے جب کہ کچھ دوسرے شاخوں سے بے مقصد جھول رہے تھے۔ ان کی نگاہیں سڑک سے گزرتی کار پر تھیں۔

"ہم انہیں ہنومان جی کہتے ہیں۔" کاپاسی نے بچوں کی معلومات میں اضافہ کیا۔ "اس علاقے میں یہ بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔"

کاپاسی کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ایک بندر اچھل کر سڑک کے درمیان آکھڑا ہوا۔ کاپاسی نے زور سے بریک لگائی۔ ایک دوسرا بندر اچھلتا ہوا کار کے بونٹ پہ آبراجمان ہوا پھر قلابازی کھاتا ہوا نیچے اتر گیا۔ کاپاسی نے زور سے گاڑی کا ہارن بجایا۔ بچے اس منظر کو دم بخود ہو کر دیکھ رہے تھے۔ مارے اشتیاق کے انہوں نے اپنے آدھے چہرے اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیے تھے۔ مسٹر داس نے ان کے اس جوش کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے چڑیا گھر کے علاوہ کبھی کہیں بندر نہیں دیکھے۔ انہوں نے کاپاسی کو گاڑی روکنے کے لیے کہا تا کہ وہ تصویر لے سکیں۔ جب مسٹر داس اپنے کیمرے کے لینس کو تصویر کے لیے تیار کر رہے تھے تو مسز داس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے بیگ میں سے نیل پالش کی ایک بے رنگ بوتل نکال لی اور اپنی انگشت شہادت پہ پالش لگانے لگی۔ چھوٹی لڑکی نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا:

"مئی مجھے بھی لگانی ہے۔ میرے ہاتھوں پہ بھی پالش لگاؤ۔"

"ہٹ جاؤ پرے!" مسز داس اپنے ناخن پہ پھونک مارتے ہوئے بولی۔ اس نے اپنے جسم کو تھوڑا سا موڑا۔ "تم میری ساری پالش کا ستیاناس کروادو گی۔"

لڑکی فرمائش کے بعد اب اپنی پلاسٹک کی گڑیا کے فراک کے بٹن کھولنے اور بند کرنے میں مصروف ہو گئی تھی۔
 "چلو!" مسٹر داس نے اپنے کیمرے کا لینس کو بند کرتے ہوئے کہا۔

گرد آلود رستے پہ جب کار نے رفتار پکڑی تو اس کا شور اور جھٹکے انہیں بعض دفعہ اپنی سیٹوں سے اچھال کر آگے کی طرف جھک جانے پہ مجبور کر دیتے لیکن مسز داس اس کے باوجود اپنی پالش میں مگن رہیں۔ جب جھٹکے زیادہ بڑھنے لگے تو کاپاسی نے ایکسپریٹ پہ پاؤں ہلکا کر دیا تاکہ گاڑی کی کم رفتار سے جھٹکوں میں کمی آجائے۔ جب اس نے گئیر بدلنے کے لیے گئیر شفٹ پہ ہاتھ رکھا تو اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے اپنے گھٹنوں کو سمیٹ کر ایک طرف کیا تاکہ وہ آسانی سے گئیر لگا سکے۔ کاپاسی نے نوٹ کیا کہ اس لڑکے کا رنگ باقی دونوں بچوں سے کچھ زیادہ صاف تھا۔ "ڈیڈی! اس گاڑی کا ڈرائیور بھی غلط سمت بیٹھ کے ڈرائیونگ کیوں کر رہا ہے؟" لڑکے نے سوال کیا۔

"ارے غبی! یہاں سب اسی طرف بیٹھ کر ڈرائیونگ کرتے ہیں۔" رونی بولا۔

"اپنے بھائی کو غبی مت بولو!" مسٹر داس نے اسے تنبیہ کی۔ پھر کاپاسی کی طرف دیکھ کر بولے: "امریکا میں آپ جانتے ہی ہو ڈرائیونگ۔۔۔۔۔ یہاں یہ چیز انہیں الجھن میں ڈال دیتی ہے۔"

"جی ہاں! میں اچھی طرح واقف ہوں!" کاپاسی نے جواب دیا۔ اس نے آہستگی سے گئیر بدلا اور سٹرک پہ سامنے چڑھائی کو دیکھتے ہوئے گاڑی کی رفتار قدرے تیز کر دی۔

"میں نے اسے ڈیلیس^{۳۰} پہ دیکھا تھا۔ امریکا میں اسٹرنگ وہیل گاڑی کے بائیں طرف ہوتا ہے۔"

"ڈیلیس کیا ہے؟" ٹینا نے اپنی گڑیا کو، جس کے کپڑے اب وہ اتار چکی تھی، کاپاسی کی سیٹ کی پشت پہ مارتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ ایک ٹیلی ویژن شو تھا۔" مسٹر داس نے وضاحت کی۔ "اب یہ نشر نہیں ہوتا۔"

جب گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں دواں کھجور کے درختوں کی ایک طویل قطار کے پاس سے گزر رہی تھی تو کاپاسی سوچ رہا تھا کہ یہ خاندان بہن بھائیوں کی طرح لگتا ہے۔ مسٹر داس اور ان کی بیگم کاپچوں کے ساتھ برتاؤ والدین سے زیادہ بڑے بہن بھائی جیسا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان دونوں کو صرف آج کے دن عارضی طور پر بچوں کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ یہ تصور کرنا محال تھا کہ یہ دونوں اپنی ذات کے سوا کسی اور کی ذمہ داری مستقل طور پر اٹھا سکتے ہوں گے۔ مسٹر داس اس وقت بھی اپنے کیمرہ لینس کے کور پہ انگلی بجا رہا تھا اور وقتاً فوقتاً وہ اپنے سیاہی کتا بچے کے صفحوں پہ انگوٹھے کے ناخن کو یوں رگڑ رہا تھا کہ کھرچنے کی آواز پیدا ہوتی۔ مسز داس بدستور اپنے ناخنوں پہ پالش لگانے میں مگن تھی۔ اس نے ابھی تک دھوپ سے بچاؤ کا چشمہ نہیں اتارا تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد ٹینا التجا کرتی کہ اسے بھی نیل

پالش لگوانی ہے۔ بالآخر مسز داس نے اپنے کام سے فراغت کے بعد ٹینا کے ایک ناخن پر بھی پالش چڑکادی اور بوتل کو واپس اپنے دستی بیگ میں رکھ لیا۔

"کیا یہ کار ایئر کنڈیشنڈ نہیں ہے؟" مسز داس نے اپنے ناخنوں پہ لگی پالش کو خشک کرنے کے لیے ان پہ پھونکیں مارتے ہوئے سوال کیا۔ ٹینا کے طرف والی کھڑکی کا شیشہ خراب تھا اس لیے اسے نیچے نہیں کیا جاسکتا تھا۔

"ہر وقت شکایتی نہ بنی رہا کرو۔" مسٹر داس گویا ہوئے۔ "اب اتنی بھی گرمی نہیں ہے۔"

"میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ ایئر کنڈیشنڈ گاڑی بک کرنا۔" مسز داس جاری رہی۔ "تم ہمیشہ ایسا کیوں کرتے ہو راج، صرف چند بے کار روپے بچانے کے لیے! اس میں تم نے کتنی بچت کر لی ہوگی؟ پچاس سینٹ؟

ان دونوں کا انگریزی لب و لہجہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ پاسی امریکی ٹی وی پروگراموں میں سنتا رہا تھا۔ اگرچہ یہ ڈیلیس" والے شو سے کسی قدر مختلف تھا۔

"کیا لوگوں کو ایک ہی جیسی جگہیں ہر روز دکھانا آپ کے لیے اکتا دینے والا کام نہیں ہے کاپاسی؟" مسٹر داس نے اپنی طرف والی کھڑکی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے سوال کیا۔ "ذرا ایک منٹ کے لیے رکنا میں اس آدمی کی تصویر اتار لوں۔"

کاپاسی نے سٹرک کے کنارے گاڑی روک دی۔ مسٹر داس نے ایک بیل گاڑی پہ بیٹھے برہنہ پا آدمی کی تصویر لی جس کے سر پہ میلی کچیلی پگڑی تھی۔ اس نے بیل گاڑی میں گندم کی بوریاں لد رکھی تھیں اور خود ان کے اوپر براجمان تھا۔ دونوں بیل اور گاڑی بان بے حد لاغر تھے۔ مسز داس پچھلی نشست کی دوسری کھڑکی سے باہر آسمان کو گھور رہی تھی جہاں شفاف بادل ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے پھر رہے تھے۔

"میں اکتانے کی بجائے اس وقت کا بڑے شوق سے انتظار کرتا ہوں۔" جب گاڑی دوبارہ سٹرک پہ رواں ہوئی تو کاپاسی بولا۔ "سوریا مندر میری پسندیدہ جگہوں میں سے ایک ہے۔ اس کے درشن کے لیے سیاحوں کو لے جانا میرے لیے ایک طرح کا انعام ہے۔ میں صرف جمعے اور ہفتے والے دن سیاحوں کو گھمانے لے جاتا ہوں۔ باقی دنوں میں میں ایک اور نوکری کرتا ہوں۔"

"اچھا! کہاں؟" مسٹر داس نے سوال کیا۔

"میں ایک ڈاکٹر کے کلینک میں کام کرتا ہوں۔"

"تم ڈاکٹر ہو؟"

"نہیں میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ میں ایک ڈاکٹر کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ بطور ترجمان!"

"ہائیں؟ ڈاکٹر کو بھلا کس کام کے لیے ترجمان کی ضرورت ہوتی ہے؟"

"ڈاکٹر کے پاس آنے والے بہت سے مریض گجراتی ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب اس علاقے کے دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح گجراتی زبان نہیں جانتے۔ میرے والد گجراتی تھے اس لیے میں یہ زبان جانتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اس لیے اپنے دفتر میں ساتھ رکھا ہوا ہے تاکہ میں ان کے پاس آنے والے ان مریضوں کی ترجمانی کروں۔"

"یہ تو بہت دلچسپ کام ہے! میں نے آج سے قبل اس طرح کے کسی کام کے بارے میں نہیں سنا۔" مسٹر داس بولے۔

"باقی نوکریوں کی طرح یہ بھی ایک نوکری ہے۔" کندھے اچکاتے ہوئے کاپاسی نے جواب دیا۔

"لیکن بڑی رومانوی ہے یہ نوکری!" مسز داس نے خوابیدہ سے لہجے میں پہلی دفعہ اپنی خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے دھوپ کے چشمے کو آنکھوں سے ہٹا کر سر پہ کسی تاج کی طرح سجایا اور پہلی دفعہ عقبی آئینے میں اس کی نظریں کاپاسی کی نظروں سے ملیں۔ مسز داس کی آنکھیں کس قدر چھوٹی تھیں اور ان میں پیلاہٹ نمایاں تھی۔ وہ بغیر پلک جھپکائے دیکھ رہی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں غنودگی سی جھلک رہی تھی۔

مسٹر داس نے گردن کھینچ کر بیگم کی طرف دیکھا۔ "اس میں بھلا کیا رومانویت ہے؟"

"پتہ نہیں! لیکن کچھ ایسا ہے۔" اس نے بھنویں سیٹرتے ہوئے اپنے کندھے اچکائے۔ "آپ بیل گم کھائیں گے کاپاسی صاحب؟" چمکتے ہوئے اس نے کاپاسی سے سوال کیا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اپنے دستی بیگ میں سے ایک سبز اور سفید دھاریوں والے کاغذ میں لپٹی چو کور بیل گم نکالی اور کاپاسی کو دے دی۔ کاپاسی نے جیسے ہی یہ گم مونہ میں رکھی اس میں سے ایک گاڑھا، میٹھا سیال کاپاسی کی ساری زبان پر پھیلتا چلا گیا۔

"ہمیں اپنے اس کام کے بارے میں کچھ اور بتائیں۔" مسز داس بولی۔

"آپ کیا جاننا چاہتی ہیں میڈم؟"

"مجھے نہیں پتہ۔" اس نے کندھے اچکائے۔ وہ اس وقت مُر مُرے پھانکنے میں مصروف تھی۔ "ہمیں کوئی روزمرہ پیش آنے والی صورت حال بتائیں۔" اپنی نشست کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ کھڑکی سے سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ "میں یہ تصور کرنا چاہتی ہوں کہ کیا ہوتا ہو گا۔"

"سمجھ گیا! میں آپ کو بتاؤں کہ ابھی پچھلے دن ایک آدمی ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا جس کے گلے میں درد تھا۔"

"اچھا۔ کیا وہ سگریٹ پیتا تھا؟"

"نہیں، بڑا عجیب سا مسئلہ تھا اس کا۔ وہ شکایت کر رہا تھا کہ اسے گلے میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بھوسا بھر گیا ہو۔ اسے گلے میں تنکے چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ جب میں نے ڈاکٹر صاحب کو یہ بتایا تو انہوں نے اسے اس مسئلے

کی دوا لکھ دی۔"

"زبردست کام کیا آپ نے!"

"ہاں شاید!" ایک توقف کے بعد کاپاسی نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"اس لحاظ سے یہ سارے مریض آپ پر مکمل طور پر انحصار کرتے ہیں۔" مسز داس نے کہا۔ وہ یوں خواب آلود لہجے

میں بول رہی تھی جیسے کسی سوچ میں گم ہو۔ "ایک طرح سے وہ ڈاکٹر سے زیادہ آپ پر انحصار کرتے ہیں۔"

"جی کیا مطلب؟ وہ ڈاکٹر صاحب سے زیادہ مجھ پہ کیسے انحصار کر سکتے ہیں؟"

"دیکھو! مثال کے طور پر اسی مریض کے بارے میں اگر آپ ڈاکٹر کو بتاتے کہ اس کے گلے میں جلن ہو رہی ہے اور

تینکے چھنے والی کیفیت کا ذکر نہ کرتے تو مریض بھلا کیسے جان سکتا کہ آپ نے ڈاکٹر کو کیا بتایا ہے اور ڈاکٹر بھی کبھی نہ

جان پاتا کہ آپ نے مریض کی غلط ترجمانی کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک بڑی اہم ذمہ داری ہے۔"

"ہاں! اس طرح تو واقعی آپ کی ذمہ داری بڑی اہم ہے کاپاسی۔" مسٹر داس نے بیگم کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے

کہا۔

کاپاسی نے کبھی اپنے کام کے بارے میں اتنی داد و تحسین کا سوچا بھی نہ تھا۔ اس کے خیال میں اس کا پیشہ کسی کی نگاہ میں

قابل ستائش نہ ہو سکتا تھا۔ لوگوں کے روگوں کی ترجمانی: سوجی ہوئی ہڈیوں، پیٹوں اور انتڑیوں میں اٹھنے والے

مروڑوں اور ہتھیلیوں پہ ہر حجم اور ہر رنگ و روپ کے پھوڑوں کی علامتوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ ترجمہ کر کے

ڈاکٹر صاحب کو بتانا اس کے خیال میں کوئی ایسا کام نہ تھا جس کو کوئی بہ نظر تحسین دیکھتا ہو۔ ڈاکٹر جس کو چوڑی موری

والی پتلونیں پہننے کا شوق تھا اور جو کانگریس کے بارے میں پھسپھسے لطیفے سناتا رہتا تھا کاپاسی سے آدھی عمر کا تھا۔ یہ

دونوں ایک چھوٹی سی پرانی ڈسپنسری میں بیٹھتے تھے اور اگرچہ گرمی میں ان کے سروں پہ چھت کا پنکھا، جس کے پر

مکمل طور پر سیاہ ہو چکے تھے، بڑی شد و مد سے چلتا رہتا لیکن اس کے باوجود کاپاسی کے بڑی نفاست سے سلے ہوئے

سوٹ پسینے کے سبب اس کے جسم سے چپکے رہتے تھے۔

مریضوں کی ترجمانی کا یہ کام کاپاسی کی تمام عمر ناکامیوں سے کام لینے کا گویا ایک ثبوت تھا۔ جوانی میں وہ بدیلی زبانوں کا

بڑا سرگرم سکالر تھا اور اس کے پاس مختلف زبانوں کی لغات کا ایک شاندار ذخیرہ موجود تھا۔ اس کا خواب تھا کہ وہ ان

حکومتی عہدیداروں اور سفارت کاروں کا ترجمان بنے جو افراد اور اقوام کے مسئلے سلجھاتے ہیں۔ اس کی خواہش تھی

کہ وہ ان مسئلوں کی گتھیاں سلجھانے میں اپنا کردار ادا کرے جہاں دونوں پارٹیوں کی زبان صرف وہی سمجھ سکتا

ہو۔ کاپاسی نے ساری عمر خود آموزی کی تھی۔ شادی طے ہونے سے پہلے تک وہ ہر شام اپنی کاپیوں میں الفاظ کی اصل

بنیادیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر ان کی فہرستیں بناتا رہتا تھا۔ زندگی میں ایک مرحلے پر تو اسے خود پہ اتنا اعتماد آ گیا تھا کہ وہ ہندوستانی زبانوں ہندی، بنگالی، اڑیسی اور گجراتی کا تو ذکر ہی کیا انگریزی، فرانسیسی، روسی، پرتگالی اور اطالوی زبانوں میں بھی اظہار خیال کرنے پر خود کو قادر سمجھتا تھا۔ اب اس کی یاد کے نہاں خانوں میں یورپی زبانوں کے محض چند الفاظ اور تراکیب ہی باقی بچے تھے۔ اب وہ چند بکھرے ہوئے الفاظ جیسے پرچ، پیالی اور کرسی وغیرہ ہی ادا کر سکتا تھا۔ یورپی زبانوں میں سے محض ایک انگریزی ہی وہ زبان بچی تھی جو وہ اب بھی بڑی روانی سے بول لیتا تھا۔ کاپاسی جانتا تھا کہ صرف انگریزی بولنا کوئی بڑا کام نہیں۔ بعض اوقات تو اسے ایسا لگتا جیسے اس کے بچے صرف ٹیلی ویژن دیکھ دیکھ کر اس سے اچھی انگریزی بول لیتے ہیں۔ بحر حال جو کچھ بھی ہو سیاحوں کو گھماتے ہوئے انگریزی کاپاسی کے بڑے کام آتی تھی۔

کاپاسی کی بطور مترجم نوکری کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب وہ ٹائیفائیڈ کے شکار اپنے سات سالہ بیٹے کو ڈاکٹر کے کلینک لے کر گیا تھا اور اس کی ڈاکٹر سے پہلی دفعہ علیک سلیم ہوئی تھی۔ اس زمانے میں کاپاسی ایک گرائمر سکول میں انگریزی پڑھاتا تھا۔ اس نے بیٹے کے علاج پر اٹھنے والے اخراجات پورے کرنے کے لیے ڈاکٹر کے ہاں بطور مترجم کام کرنا شروع کیا۔ علاج کے باوجود لڑکا ایک شام بخار سے پھٹکتے پھٹکتے اپنی ماں کی بانہوں میں دم توڑ گیا تھا۔ لیکن بیٹے کے کریا کرم کے اخراجات سے لے کر، نئے پیدا ہونے والے بچوں، نئے اور بڑے گھر، بچوں کے اچھے اسکولوں اور ٹیوشن کے لیے، اچھے جوتوں، ٹیلی ویژن اور بے شمار دوسرے اخراجات کے لیے جو وہ رات رات بھر بیٹے کی یاد میں سسکتی اپنی بیوی کی تسلی کے لیے کرتا تھا اسے زائد پیسوں کی ضرورت تھی اس لیے جب ڈاکٹر نے اسے گرائمر اسکول سے ملنے والی تنخواہ سے دو گنی تنخواہ کی پیشکش کی تو وہ مستقل اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

کاپاسی کو علم تھا کہ مترجم کی اس نوکری کو اس کی بیوی کچھ زیادہ اچھا نہیں سمجھتی کیونکہ یہ اسے اس کے مرحوم بیٹے کی یاد دلاتی تھی۔ شاید اسے یہ دکھ بے چین رکھتا تھا کہ اپنی ترجمانی سے دوسروں کی زندگیاں بچانے میں اپنا کردار ادا کرنے والا کاپاسی اپنے بیٹے کو بچانے میں کوئی کردار نہیں ادا کر پایا تھا۔ جب کبھی وہ کاپاسی کی نوکری کا ذکر کرتی تو اسے ڈاکٹر کے ترجمان کی بجائے کمپاؤنڈر کہتی۔ یوں جیسے ترجمانی کا کام لوگوں کے جسمانی درجہ حرارت ماپنے یا مریضوں کے بول و براز سے بھرے برتن تبدیل کرنے جیسا ہو۔ اس نے کبھی کاپاسی سے مریضوں کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی کبھی اس نے یہ کہا تھا کہ کاپاسی کا کام بڑی ذمہ داری والا ہے۔

اس لیے اب مسز داس کو اپنے کام کے بارے میں اس قدر متجسس پا کر کاپاسی پھولے نہیں سمارہا تھا۔ بیوی کے برعکس جو کاپاسی کے کام کو کارِ بے کار گردانتی تھی مسز داس نے اسے احساس دلایا تھا کہ اس کے کام میں کس قدر دماغی توانائی

کی ضرورت ہے۔ اس نے "رومانوی" کا لفظ بھی استعمال کیا تھا۔ اپنے شوہر کی طرف اس کا رویہ بالکل بھی رومانوی نہ تھا لیکن کاپاسی کے کام کے لیے اُس نے یہ لفظ استعمال کیا تھا۔ کاپاسی سوچ رہا تھا کہ کیا مسٹر اور مسز اس اسی طرح بے جوڑ تھے جس طرح وہ اور اس کی بیوی بے جوڑ تھے! شاید ان کے درمیان بھی تین بچوں اور ایک دہائی پر محیط شادی کے سوا کچھ مشترک نہ تھا۔ کاپاسی نے اپنی شادی شدہ زندگی کی سب تلخ نشانیاں اس جوڑے کے درمیان بھی دیکھ لی تھیں۔ معمولی باتوں پر بک بک جھک جھک، ایک دوسرے سے بے اعتنائی اور طویل ہوتی ہوئی بے معنی خاموشیاں سب یہاں بھی موجود تھیں۔ مسز اس کی اچانک کاپاسی میں دلچسپی، وہ دلچسپی جس کا اظہار اس نے اپنے شوہر اور بچوں کی طرف نہیں کیا تھا، کاپاسی کو کسی قدر مخمور کر رہی تھی۔ جب کاپاسی نے دوبارہ سوچا کہ کیسے مسز اس نے اس کے لیے "رومانوی" کا لفظ استعمال کیا تھا تو اس کا احساسِ خمار بڑھتا چلا گیا۔

گاڑی چلاتے ہوئے اس نے عقبی آئینے میں گھڑی گھڑی اپنا عکس دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ آج صبح اس نے پہننے کے لیے اس خاکستری سوٹ کا انتخاب کیا تھا ورنہ وہ بھورے رنگ کا دوسرا سوٹ پہنتا جو قدامت کے باعث کچھ ڈھیلا ڈھالا اور بد وضع ہو چکا تھا۔ خود کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ عقبی آئینے سے مسز اس کا بھی گاہے گاہے جائزہ لے رہا تھا۔ مسز اس کے چہرے کے علاوہ کاپاسی کی نظریں ان کی چھاتی پہ بنی سٹرابری اور ان کے گلے کے سنہری مائل بھورے رنگ کے گڑھے کا طواف کر رہی تھیں۔ اس نے مسز اس کو کچھ اور مریضوں کی داستان سنانے کا فیصلہ کیا۔ کاپاسی نے اس نوجوان عورت کے بارے میں بتایا جسے ریڑھ کی ہڈی میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بارش کی بوندیں ٹپک رہی ہوں۔ اس نے اس شریف النفس مرد کا قصہ سنایا جس کے پیدا نشی نشان پر بال پھوٹنا شروع ہو گئے تھے اور وہ بہت پریشان تھا۔ مسز اس اپنے بالوں کو پلاسٹک کے ایک چھوٹے سے بیضوی برش سے سہلاتے ہوئے اس کی باتیں غور سے سن رہی تھیں اور اس سے بچ بچ میں سوال کرتی جاتیں۔ بچے خاموش بیٹھے کھڑکیوں سے باہر مزید بندروں کی تلاش میں نظریں جمائے ہوئے تھے اور مسٹر اس اپنے سیاحتی کتا بچے میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے کاپاسی اور مسز اس کی گفتگو ایک طرح سے ان کی نجی گپ شپ محسوس ہو رہی تھی۔

اسی عالم میں آدھا گھنٹہ بیت گیا اور جب وہ دن کے کھانے کے لیے ایک سڑک کنارے بنے ریسٹورانٹ کے سامنے رکے جہاں پکوڑے اور آملیٹ سینڈویچ ملتے تھے تو کاپاسی کو یہ رکنا بالکل بھی اچھا نہ لگا۔ اس سے قبل جب بھی وہ سیاحوں کو لے کر نکلتا تو اس مقام پر تھوڑی دیر رکنے کا شدت سے منتظر رہتا تھا تا کہ تنہائی میں گرما گرما چائے سے لطف اندوز ہو سکے لیکن آج اسے اس مختصر قیام کے خیال نے مغموم کر دیا تھا۔ جب اس فیملی ارغوانی رنگ کی ایک سفید اور نارنجی جھالروں سے سچی چھتری تلے بیٹھ چکی اور جب وہ ٹکونی ٹوپیاں پہنے بیروں میں سے ایک کو بلا کر کھانے کا

آرڈر دے چکے تو کاپاسی جھپکتے قدموں سے ایک قریبی میز کی طرف بڑھا۔

"کاپاسی صاحب ٹھہریئے! یہاں جگہ ہے۔" مسز داس نے ٹینا کو اپنی گود میں کرتے ہوئے کاپاسی کو اپنے ساتھ ہی بیٹھنے کی دعوت دی۔ کچھ اصرار کے بعد کاپاسی وہیں بیٹھ گیا۔ ان لوگوں نے آم کے جوس، سینڈوچز اور تلے ہوئے پکڑوں پہ خوب خوب ہاتھ صاف کیے۔ جب مسٹر داس دو آملیٹ سینڈوچ سے انصاف کر چکے تو وہ فیملی کی تصویریں لینے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اور کتنا دور ہے؟" مسٹر داس نے اپنے کیمرے کی فلم تبدیل کرتے ہوئے کاپاسی سے سوال کیا۔

"تقریباً آدھا گھنٹہ اور لگے گا۔"

اب بچے قریبی درختوں پہ ٹنگے بندر دیکھنے میز سے اٹھ چکے تھے اس لیے مسز داس اور کاپاسی کے درمیان خالی کرسی کا فاصلہ کچھ زیادہ لگ رہا تھا۔ مسٹر داس نے ان کی تصویر بنانے کے لیے کیمرہ درست کر کے اپنی ایک آنکھ میچ لی۔ تصویر بناتے ہوئے اس کی زبان مونہ کے ایک کونے سے غیر محسوس طور پر باہر جھانکنے لگی تھی۔

"بڑی مضحکہ خیز سی تصویر بن رہی ہے مینا! تم کاپاسی صاحب کی طرف تھوڑا جھک جاؤ۔"

مسز داس نے ایسا ہی کیا۔ کاپاسی اس کے بدن سے اٹھنے والی خوشبو اپنے رگ و پے میں اترتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا۔ یہ خوشبو ایسی تھی جیسے وہسکی اور عرق گلاب کو ملا دیا گیا ہو۔ اچانک کاپاسی کو اس خیال نے پریشان کر دیا کہ مسز داس کہیں اس کے پسینے کی بو محسوس نہ کر لیں جو اس کی موٹے کپڑے سے بنی شرٹ تلے جمع ہوتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے آم کے جوس کو ایک ہی بڑے سے گھونٹ سے ختم کیا اور بالوں کی مانگ درست کرنے کے لیے ان پہ ہاتھ پھیرا۔ پھر اس نے جلدی سے جوس کے اس قطرے کو صاف کیا جو اس کی ٹھوڑی پر آگرا تھا۔ یہ خیال بھی اسے پریشان کر رہا تھا کہ کہیں مسز داس نے یہ دیکھا تو نہیں!

لیکن مسز داس نے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ "کاپاسی صاحب! آپ کا پتہ کیا ہے؟" اپنے دستی بیگ میں سے کچھ ٹٹولتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"آپ میرے گھر کا پتہ جاننا چاہتی ہیں؟"

"جی ہاں! تاکہ آپ کو ان تصویروں کی ایک کاپی بھیج سکوں۔" اپنے فلمی میگزین سے جلدی سے ایک چھوٹی سی پرچی پھاڑ کر کاپاسی کو دیتے ہوئے وہ بولی۔ اس پرچی کے غالب حصے پہ کچھ لکھائی اور کونے پہ ایک ہیر و اور ہیر وئن کی تصویر تھی جو سفیدے کے درخت تلے ہم آغوش تھے۔ اس لیے اس پہ لکھنے کے جگہ کم ہی خالی تھی۔ بحر حال کاپاسی نے جیسے تیسے اسی پہ بہت واضح اور صاف لکھائی میں اپنا پتہ لکھنا شروع کیا۔ اس کا قلم پتہ لکھ رہا تھا اور اس کے دماغ میں

آرزوؤں کی آنکھ مچولی جاری تھی۔ مسز داس اسے خط لکھ کر ڈاکٹر کے دفتر میں اس کے کام کے بارے میں پوچھیں گی اور وہ بہت دلکش انداز میں انہیں صرف ان مریضوں کے واقعات لکھا کرے گا جو سب سے زیادہ دلچسپ ہوں گے۔ وہ قصے جنہیں سن کر مسز داس نیوجرسی کے اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے کھل کھلا اٹھیں گی۔ اسی خط و کتابت میں کبھی وہ شادی سے اپنی توقعات کے کرچی کرچی ہونے کا انکشاف کریں گی اور وہ جواب میں اپنی شادی کے دکھڑے انہیں سنائے گا۔ یوں ان کی دوستی کا پودا بڑھتا اور پھلتا پھولتا جائے گا۔ وہ ارغوانی چھتری تلے بیٹھے پکوڑے کھاتے ان دونوں کی اس تصویر کو ہمیشہ اپنے پاس محفوظ رکھے گا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ یہ تصویر اس کی روسی گرائمر کی کتاب کے صفحوں میں گھر والوں کی نظروں سے محفوظ رہے گی۔

جب کا پاسی کا دماغ مستقبل کی یہ تصویریں بنتا چلا جا رہا تھا تو اس کو ایک لطیف اور خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ یہ احساس بالکل ویسا ہی تھا جیسا ماضی میں وہ کسی غیر ملکی زبان کے پیراگراف کا کامیابی سے ترجمہ کر لینے کے بعد محسوس کیا کرتا تھا۔ کسی فرانسیسی ناول کے اقتباس یا اطالوی نظم کے کچھ بند جب وہ لغتوں کی مدد سے مہینوں کی عرق ریزی کے بعد ترجمہ کر کے پڑھتا تو اسے عجیب سی فرحت کا احساس ہوتا تھا۔ ایسے لمحوں میں اسے لگتا کہ دنیا میں کچھ بھی برا نہیں ہے، جیسے ہر کوشش کا صلہ ملتا ہے، جیسے زیست کی سب غلطیاں کسی نہ کسی اچھے کے لیے ہوتی ہیں۔ مسز داس سے خط و کتابت کے خیال نے اس کے دماغ کو دوبارہ اسی انبساط سے بھر دیا تھا۔

جیسے ہی کا پاسی نے اپنا پتہ لکھ کر پرچی مسز داس کو پکڑائی اس کے دماغ کو اس وہم نے جکڑ لیا کہ کہیں اس نے اپنے نام کے جے غلط تو نہیں لکھ دیے، کہیں اس نے بے دھیانی میں اپنے پوسٹل کوڈ کے نمبروں کی ترتیب تو گڑبڑ نہیں کر دی۔ اس کے دماغ میں یہ خوف ریگنے لگا کہ مبادا کہیں مسز داس کا لکھا ہوا خط اس تک پہنچ ہی نہ پائے، تصویر کی کاپی کہیں رستے میں ہی کھو جائے یا اس کے شہر اڑیسا تک پہنچ کر بھی اسے نہ مل پائے۔ اس نے سوچا کہ وہ مسز داس سے یہ پرچی واپس لے کر اپنے پتے کے درست ہونے کی تصدیق کر لے لیکن مسز داس اس سے پہلے ہی اسے اپنے دستی بیگ میں رکھ چکی تھی جہاں چیزیں پہلے ہی آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

یہ لوگ اڑھائی بجے کو ناراک پہنچ گئے۔ بھر بھرے پتھر سے بنا ہوا مندر اہرام کی طرز کی ایک بھاری بھر کم عمارت تھی جس کی شکل کسی رتھ کے جیسی تھی۔ یہ مندر جیون کے سوامی سورج کی پوجا کے لیے مختص تھا جو ہر روز آسمان پہ اپنے سفر میں اس قوی ہیکل عمارت کے تین اطراف کو اپنی روشنی سے منور کرتا تھا۔ تختہ سنگ کے شمالی اور جنوبی سمتوں میں چوبیس دیو قامت پھیرے تراشے گئے تھے اور اس آسمانی رتھ کو سات گھوڑے کھینچ رہے تھے جن کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان کی وسعتوں میں محو پرواز ہوں۔ جب یہ سب مندر کے داخلے تک پہنچ چکے تو کا پاسی نے اس

کی تاریخ پہ روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ یہ مندر بارہ سو تینتالیس عیسوی سے لے کر بارہ سو پچپن عیسوی کے درمیان گنگا شاہی خاندان کے عظیم حکمران نر سہادیو اول نے مسلمان فوج کے خلاف اپنی فتح کی یاد میں تعمیر کروایا تھا۔ اس مندر کی تعمیر میں بارہ سو کاریگروں نے حصہ لیا تھا۔

"اس میں لکھا ہے کہ یہ مندر لگ بھگ ایک سو ستر ایکڑ پر محیط ہے۔" مسٹر داس نے اپنے سیاہی کتا بچے سے پڑھتے ہوئے کہا۔

"یہ کسی صحرا کی طرح ہے۔" مندر کے چاروں طرف پھیلی ریت پہ نظریں پھراتے ہوئے رونی بولا۔
 "کبھی دریائے چندرا بھاگا یہاں سے ایک میل دور شمال کی طرف بہتا تھا لیکن اب یہ خشک ہو چکا ہے۔" گاڑی کا انجن بند کرتے ہوئے کاپاسی نے کہا۔

گاڑی سے اتر کر یہ لوگ مندر کی طرف بڑھے اور پہلے مندر کی سیڑھیوں کے دونوں طرف ایستادہ شیر کے مجسموں کے سامنے کھڑے ہو کر تصویریں بنوائیں پھر کاپاسی انہیں رتھ کے دیو قامت پہیوں میں سے ایک کے سامنے لے گیا۔ یہ پیپے انسانی قد سے بڑے تھے اور ان کا قطر نو فٹ تھا۔

"ان پہیوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ زندگی کے گول چکر کا علامتی اظہار ہیں۔" مسٹر داس نے اپنی کتاب میں سے پڑھنا شروع کر دیا۔ "یہ تخلیق، رکھشا اور گیان کے چکروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ واہ! بہت عمدہ!" اس نے کتاب کا ایک اور صفحہ پلٹا۔

"ہر پیپے میں آٹھ موٹے اور آٹھ ہی پتلے ڈنڈے ہیں جو دن کو آٹھ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہیوں کے کناروں پہ جانوروں اور پرندوں کی شبیہوں سے نقش و نگار بنائے گئے ہیں جبکہ موٹے ڈنڈوں کے درمیان میں شاندار لباس میں ملبوس عورتوں کو دکھایا گیا ہے جن میں سے زیادہ تر کے انداز شہوت انگیز ہیں۔"

مسٹر داس کی کتاب میں جس شہوت انگیزی کا ذکر کیا گیا تھا وہ دراصل پہیوں میں کندہ کیے گئے ایسے بے شمار آرائشی حاشیے تھے جن میں کہیں نیم برہنہ انسانی جسموں کو ایک دوسرے میں گتھم گتھا دکھایا گیا تھا، کہیں مرد و عورت کے جنسی حظ اٹھانے کی مختلف حالتیں تھیں اور کہیں عورتوں کو مردوں کی گردنوں سے چمٹے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ ان عورتوں کے گھٹنے اپنے عاشقوں کی رانوں کے گرد گویا ابدی طور پر لپٹے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ روزمرہ زندگی کی نقاشی بھی کی گئی تھی۔ شکار، خرید و فروخت، ہرن کو تیر کمان سے شکار کیے جانے کی حالت اور تلوار بکف جنگجوؤں کے صف بستہ آگے بڑھنے کے مناظر جا بجا کندہ تھے۔

مندر کے اندر داخل ہونا ممکن نہ تھا کیونکہ سالوں پہلے اس میں ریت، پتھر اور مٹی کا ملبہ بھر چکا تھا۔ اس لیے ان

لوگوں نے عمارت کے ارد گرد آہستہ خرامی کرتے ہوئے اس کے بیرونی حصوں کی جی بھر کے تعریف کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کاپاسی آج تک جتنے سیاحوں کو اس مندر لے کر آیا تھا سب اس تعمیراتی شاہکار سے مبہوت ہو جاتے تھے۔ مسٹر داس باقی سب سے پیچھے رہ کر تصویریں بنا رہے تھے۔ بچے آگے آگے بھاگ رہے تھے اور برہنہ شبیہوں کی طرف مارے اشتیاق کے اشارے کرتے جاتے تھے۔ خاص طور پر وہ ناگا مٹھینس کے بارے میں بہت متجسس ہو رہے تھے۔ کاپاسی نے انہیں بتایا کہ آدھے انسانی دھڑ اور آدھے سانپوں پر مشتمل ان جوڑوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ گہرے سمندر کی پہنائیوں میں بستے ہیں۔ کاپاسی خوش تھا کہ ان لوگوں کو یہ مندر بہت پسند آیا تھا۔ اس کی خوشی کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مسز داس مندر میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ وہ ہر دو چار قدم کے بعد رک جاتیں اور دیواروں پر منقش پریکی جوڑوں، ہاتھیوں کے جلو سوں اور طبلے بجاتی ناریوں کو تکتی رہتیں جن کی چھاتیاں برہنہ تھیں۔

اگرچہ کاپاسی اس مندر میں ان گنت بار آچکا تھا لیکن آج مسز داس کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے جب اس نے ان برہنہ چھاتی والی سازندوں کو غور سے دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ اپنی بیوی کو تو اس نے آج تک کبھی اس طرح برہنہ تن نہیں دیکھا تھا۔ وہ جب ہم بستر بھی ہوتے تو اس کی بیوی اپنی چولی کی تنیوں کو نہیں کھولتی تھی اور اس کے پیٹی کوٹ کی ڈور اس کی کمر کے گرد ہی بندھی رہتی تھی۔ مسز داس کے پیچھے چلتے ہوئے کاپاسی جس طرح ان کی سڈول ٹانگوں کو دل ہی دل میں سراہ رہا تھا ایسا اس نے کبھی اپنی بیوی کی ٹانگوں کو نہیں سراہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ کاپاسی نے اس سے قبل برہنہ انگ نہیں دیکھے تھے۔ اس نے بیسیوں دفعہ ان امریکی اور یورپی خواتین کی ننگی ٹانگیں دیکھی تھیں جنہیں گھمانے کے لیے اسے بھیجا جاتا تھا۔ لیکن مسز داس کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ باقی خواتین کے برعکس جنہیں صرف مندر دیکھنے میں دلچسپی ہوتی تھی یا جو اپنے سیاحتی کتابچوں میں گھسی رہتی تھیں یا جو محض اپنے کیمروں سے تصویریں بنانے میں مگن رہتی تھیں، مسز داس نے کاپاسی کی ذات میں دلچسپی لی تھی۔

کاپاسی اگرچہ مسز داس کے پہلو بہ پہلو چلنے سے گھبراہٹا تھا لیکن ان کے ساتھ تنہائی میں اپنی نجی گفتگو جاری رکھنے کے لیے اس کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ مسز داس کی نگاہیں ان کے چشمے کے پیچھے گم تھیں اور وہ اپنے شوہر کی ایک اور فوٹو کے لیے پوز دینے کی التجاؤں سے بے نیاز اپنے بچوں کے پاس سے بھی یوں گزرتی چلی جا رہی تھی جیسے وہ اس کے لیے اجنبی ہوں۔ اس خیال سے کہ کہیں اس کے ساتھ چلنے سے مسز داس پریشان نہ ہوں کاپاسی ان سے آگے چلنے لگا۔ سامنے سورج دیوتا کے پیتل سے بنے وہ تین قد آدم اوتار تھے جن کی دلکشی ہمیشہ کاپاسی کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ مندر کی دیواروں میں بنے طاقتوں میں رکھے یہ مجسمے سورج دیوتا کو صبح، دوپہر اور شام کو پر نام کرنے کے

لیے کھڑے کیے گئے تھے۔ ان کے سروں پر منش صافے بندھے تھے، ان کی کچنی ہوئی بند آنکھوں سے اضحلال سا جھلکتا تھا اور ان کے برہنہ سینوں کے گرد کندہ کی ہوئی زنجیریں اور ہار لپٹے ہوئے تھے۔ ان مجسموں کے سرمئی قدموں میں پھولوں کی پیتاں بکھری پڑی تھیں جو اس سے قبل آنے والے زائرین نے نچھاور کی تھیں۔ ان تینوں میں سے آخری مجسمہ جو مندر کی شمالی سمت والی دیوار پہ ایستادہ تھا خاص طور پہ کاپاسی کو بہت پسند تھا۔ اس سوریہ کی آنکھوں میں ایسی ماندگی تھی جیسے وہ دن بھر کی مشقت کے بعد تھک گیا ہو۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے گھوڑے کی آنکھوں میں بھی اک غنودگی سی طاری تھی۔ اس کے ارد گرد عورتوں کے ترشے ہوئے چھوٹے چھوٹے مجسموں کے جوڑے تھے جنہوں نے اپنے جسموں کو خم دے رکھا تھا۔

"یہ کون ہے؟" مسز داس نے پوچھا۔ اچانک انہیں اپنے ساتھ کھڑا دیکھ کر کاپاسی ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا۔

"یہ اسٹھ چھالیا سوریہ ہے۔" کاپاسی نے جواب دیا۔ "ڈوبتے سورج کا اوتار۔"

"اس کا مطلب ہے چند گھنٹوں میں سورج یہیں غروب ہو گا؟" مسز داس نے اپنے چوکور ایڑی والی ایک جوتی سے پاؤں نکالا اور انگوٹھے سے اپنی دوسری ٹانگ کی پنڈلی کو کھجانے لگی۔

"جی بالکل ایسا ہی ہے!"

"اچھا!" مسز داس نے ایک لمحے کے لیے اپنے چشمے کو اوپر اٹھایا پھر واپس ناک پہ ٹکا دیا۔

کاپاسی ان الفاظ کا مطلب تو پوری طرح سمجھ نہیں پایا تاہم اسے لگ رہا تھا کہ انہوں نے اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اسے امید تھی کہ مسز داس کے دل و دماغ پہ اس سوریہ کے جمال اور جاہ و جلال کا نقشہ پوری طرح چھا گیا ہو گا۔ شاید وہ اپنے خطوط میں اس کا ذکر کریں۔ جب ان کے درمیان خط و کتابت شروع ہو جائے گی تب وہ انہیں انڈیا کی مختلف چیزوں کے بارے میں تفصیل سے بتائے گا اور وہ جواب میں اسے امریکی زندگی کے بارے میں بتائیں گی۔ اس طرح سے یہ خطوط اُس دیرینہ خواب کی تعبیر ہوں گے جو وہ ملکوں کے درمیان اپنی ترجمانی کی صورت میں دیکھتا تھا۔ خط و کتابت سے کاپاسی کا دھیان اپنے پتے کی طرف گیا۔ اس نے مسز داس کے دستی بیگ پہ نگاہ ڈالی اور یہ دیکھ کر اسے ایک گونہ اطمینان ملا کہ اس کا پتہ متفرق چیزوں کے درمیان محفوظ پڑا تھا۔ جب ایک لمحے کے لیے اس نے چشم تصور سے مسز داس کو خود سے ہزاروں میل دور خیال کیا تو اس کا دل گویا ڈوبنے لگا۔ اس کے من میں اچانک بڑی شدت سے اس خواہش نے انگڑائی لی کہ وہ ساتھ کھڑی مسز داس کو اپنی بانہوں میں بھر لے۔ چاہے یہ ایک لمحے کے لیے ہی کیوں نہ ہو اور پھر وہ ان کے ساتھ اسی حالت میں منجمد ہو جائے۔ اپنے سوریہ دیوتا کے سامنے وہ مسز داس کو حلقہء آغوش میں لینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ان ہیجانات سے بے خبر مسز داس وہاں سے آگے چل پڑیں۔

"آپ کی امریکا واپسی کب ہوگی؟" کاپاسی نے اپنی آواز میں ٹھہراؤ لانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔
"دس دن تک۔"

اس نے جمع تفریق شروع کر دی: ایک ہفتہ مسز داس کو امریکا پہنچ کر سیٹ ہونے میں لگے گا، ایک آدھ ہفتہ تصویریں صاف ہونے میں گزر جائے گا، چند دن انہیں خط لکھنے میں لگیں گے، خط کے انڈیا پہنچنے میں دو ہفتے نکل جائیں گے۔ اس کا اندازہ تھا کہ اگر کسی حادثاتی تاخیر کا وقت بھی احتیاطاً ڈال دیا جائے تو وہ لگ بھگ چھ ہفتوں کے بعد مسز داس کا پہلا خط وصول کر پائے گا۔

جب کاپاسی نے گاڑی واپسی کے لیے رستے پہ ڈالی تو ساڑھے چار سے کچھ اوپر وقت ہو چلا تھا۔ گاڑی میں خاموشی طاری تھی۔ بچوں نے سو ریڈیو تاکے رتھ کی شکل میں بنے چھوٹے چھوٹے یادگاری پیسے بطور سوغات خریدے تھے اور اب وہ ان پیسوں کو اپنے ہاتھوں میں گھمار رہے تھے۔ مسٹر داس نے دوبارہ اپنی سیاحتی کتاب کو کھنگالنا شروع کر دیا تھا اور مسز داس اپنے برش کی مدد سے ٹینا کے الجھے ہوئے بالوں کو سلجھا کر دو چھوٹی چھوٹی پونیوں کی شکل دے رہی تھیں۔

گاڑی جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی کاپاسی کے دل و دماغ میں انہیں ہوٹل چھوڑنے کا خیال خوف کی انجانی لہریں پیدا کر رہا تھا۔ وہ ابھی مسز داس کے خط کا چھ ہفتے کا انتظار شروع کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ ٹینا کی پونیوں پہ ربڑ بینڈ چڑھاتی مسز داس کو عقبی آئینے میں غیر محسوس طور پر دیکھتے ہوئے کاپاسی سوچ رہا تھا کہ وہ کیسے اس سفر کو کچھ اور طویل کر سکتا ہے۔ عام دنوں میں تو وہ پوری کی طرف واپسی پہ اپنی گاڑی کو شارٹ کٹ استعمال کرتے ہوئے بگٹٹ بھگاتا تھا تا کہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچ سکے جہاں وہ اپنے ہاتھ پاؤں صندلی صابن سے رگڑ کر صاف کرتا اور شام کا اخبار پڑھنے بیٹھ جاتا تھا اور اس کی بیوی خاموشی سے چائے رکھ کر چلی جاتی تھی۔ اگرچہ بیوی کی اس خاموشی سے اس نے سمجھوتا کر لیا تھا لیکن آج اس خاموشی کا خیال کر کے اسے وحشت ہو رہی تھی۔ چنانچہ کاپاسی نے مسٹر اور مسز داس کو اودے گیری اور کھنڈ گیری^۳ کی پہاڑی غاروں کی سیر کرنے کی تجویز دی جو ایک گھاٹی میں آمنے سامنے پتھر کھود کر بنائی گئی تھیں اور جن میں ہزاروں سال قبل بدھ اور جین سادھو رہا کرتے تھے۔ کاپاسی نے انہیں بتایا کہ یہ چند میل دور ہیں لیکن دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

"اوہ ہاں! کتاب میں بھی ان کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔" مسٹر داس بولے۔ "شاید جین مت کے پیروکار کسی بادشاہ وغیرہ نے بنائی تھیں۔"

"کیا ہم وہاں جائیں پھر؟" کاپاسی بے چین تھا۔ اس نے گاڑی ایک موڑ پہ روک دی۔ "ان کا رستہ یہاں سے بائیں ہاتھ جاتا ہے۔"

مسٹر داس نے اجازت طلب نظروں سے مسز داس کو دیکھا اور دونوں نے تذبذب سے کندھے اچکا دیے۔
"بائیں چلیں، بائیں چلیں!" بچوں نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔

کاپاسی نے گاڑی کا رخ غاروں کی طرف موڑ دیا۔ اس کے دل و دماغ سے سفر کے اختتام کا خوف ہوا ہو چکا تھا اور ایک وارفتگی سی چھا رہی تھی۔ ابھی وہ نہیں جانتا تھا کہ جب وہ پہاڑی پہ پہنچ جائیں گے تو وہ کیا کرے گا، مسز داس کو وہ کیا کہے گا۔ شاید وہ انہیں بتائے گا کہ ان کی مسکراہٹ بہت مسکور کن ہے، شاید وہ انہیں بتائے گا کہ سٹرا بیرلی والی شرٹ ان پہ کمال بیچ رہی ہے، شاید جب مسٹر داس تصویریں بنانے میں مگن ہوں گے تو وہ ایک لمحے کے لیے مسز داس کا ہاتھ پکڑ لے گا۔

کاپاسی کو زیادہ دیر اس کشمکش میں نہیں رہنا پڑا۔ جب وہ پہاڑی تک پہنچے تو اس پہ چڑھنے کے لیے عمودی ڈھلوانی رستہ دیکھ کر مسز داس نے گاڑی سے باہر آنے سے ہی انکار کر دیا۔ رستے کے دونوں جانب گھنے درخت تھے اور ان کی شاخوں پہ درجنوں بندر براجمان تھے۔ کچھ بندر پتھروں پہ ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے۔

"میری ٹانگیں تھک گئی ہیں۔" سیٹ پہ کچھ اور دراز ہوتے ہوئے مسز داس بولیں۔ "میں یہیں رہوں گی۔"

"تم یہ فضول جوتے آخر پہنتی ہی کیوں ہو؟" مسٹر داس بولے۔ "تم تصویروں میں نہیں ہو گی۔"

"تم یہ تصور کر لینا کہ میں وہی ہوں!"

"لیکن ہم ان میں سے کسی ایک تصویر کو اپنے کرسمس کارڈ کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔ سو ریامندر میں ہم پانچوں کی

اکٹھی ایک تصویر بھی نہیں بنی۔ یہاں کاپاسی صاحب ہم سب کا گروپ فوٹو بنالیں گے۔"

"میں نہیں آرہی! ان بندروں کو دیکھ کر ویسے بھی مجھے خوف آرہا ہے۔"

"لیکن یہ بندر تو بے ضرر ہیں!" مسٹر داس بولے۔ پھر تصدیق کے لیے وہ کاپاسی کی طرف مڑے۔ "کیا یہ بندر

خطرناک ہیں؟"

"یہ خطرناک سے زیادہ بھوکے ہیں۔" کاپاسی نے جواب دیا۔ "آپ کھانے کی کسی چیز سے انہیں مشتعل نہ کریں تو یہ

کچھ نہیں کہتے۔"

مسٹر داس ٹینا کو کندھوں پہ بٹھائے دونوں لڑکوں کی انگلی تھامے پہاڑی گھاٹی کی طرف چل دیے۔ کاپاسی انہیں غور

سے دیکھتا رہا۔ ایک جاپانی جوڑا ان کے پاس سے گزرا اور ٹھہر کر آخری تصویر لینے کے بعد قریب کھڑی اپنی گاڑی میں

بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ اس وقت وہاں ان کے علاوہ یہی سیاح تھے جو دکھائے دیے تھے۔ جب جاپانی سیاحوں کی کار

نظروں سے او جھل ہو گئی تو کچھ بندر ہُو ہو کرتے چاروں ہاتھ پاؤں پہ چلتے رستے پہ اتر آئے۔ کچھ لمحوں کے لیے ان

میں چند بندروں نے مسٹر داس کے گرد ایک دائرہ سا بنالیا۔ یہ دیکھ کر ٹینا خوشی سے چلائی اور رونی گول دائرے میں باپ کے گرد دوڑنے لگا۔ بوبی نے زمین پہ پڑی ایک موٹی سی لکڑی اٹھالی اور جیسے ہی بندروں کی طرف بڑھائی ایک بندر نے اس کے قریب آکر اس کے ہاتھ سے اچک لی اور اسے زمین پہ مارنے لگا۔

"میں ان کے ساتھ چلتا ہوں۔" اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کاپاسی نے کہا۔ "ان غاروں کے بارے میں بہت سی باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔"

"نہیں! ذرا رکھیں!" مسز داس بولیں۔ پھر وہ عقبی سیٹ سے اٹھیں اور آگے آکر کاپاسی کی بغلی سیٹ پہ بیٹھ گئیں۔ "راج کے پاس وضاحت کے لیے اس کی فضول کتاب موجود ہے!"

کاپاسی اور مسز داس اب گاڑی کی ونڈ شیلڈ کے پار بوبی اور بندر کے درمیان لکڑی کی چھینا جھپٹی کا نظارہ کر رہے تھے۔ "بہت بہادر لڑکا ہے!" کاپاسی نے تبصرہ کیا۔

"اس کی بہادری میرے لیے کچھ ایسی حیران کن نہیں ہے!" مسز داس بولیں۔

"نہیں؟ کیوں؟"

"کیوں کہ وہ اُس کا نہیں ہے۔"

"میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں!"

"راج کا! وہ راج کا بیٹا نہیں ہے۔"

کاپاسی کو اپنی جلد پہ چیونٹیاں سی رہتی محسوس ہوئیں۔ اس نے اپنی شرٹ کی جیب سے کنول کے تیل سے بنے بام کی وہ ڈبیا نکالی جو ہر وقت اس کے پاس رہتی تھی اور اس نے اپنی پیشانی پہ تین جگہ بام لگایا۔ اسے پتہ تھا کہ مسز داس اسے دیکھ رہی ہیں لیکن ان کی طرف دیکھنے کی ہمت وہ اپنے اندر مجتمع نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ سامنے شیشے کے پار دور ہوتے ہوئے مسٹر داس اور بچوں کو دیکھنے لگا جو اب عمودی رستے پہ چڑھ رہے تھے۔ وہ کبھی تصویر بنانے کے لیے رکتے پھر چل پڑتے تھے۔ ان کے ارد گرد بندروں کے غول بڑھتے جا رہے تھے۔

"کیا آپ کو یہ سن کر حیرت ہو رہی ہے؟" جس انداز سے مسز داس نے کاپاسی سے یہ سوال کیا کاپاسی کو جواب دیتے ہوئے بہت سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کرنا پڑا۔

"یہ ایسی بات نہیں ہے جسے کوئی شخص فوراً مان لے!" مدھم آواز میں کاپاسی نے جواب دیا۔ اس نے بام کی ڈبیا واپس اپنی شرٹ کی جیب میں رکھ دی۔

"نہیں! یقیناً نہیں! اور اس کے بارے میں یقیناً کوئی جانتا بھی نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ میں نے اس راز کو پورے

آٹھ سال سے اپنے سینے میں دبار کھا ہے۔" اس نے اپنی ٹھوڑی یوں نیچے کی جیسے باہر کا تازہ منظر دیکھنا چاہ رہی ہو۔
 "لیکن اب میں نے آپ کو بتا دیا ہے!"

کاپاسی نے سر ہلایا۔ اسے اچانک اپنا حلق پیاس سے خشک ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اس کی پیشانی تپ رہی تھی۔ بام نے اس کی پیشانی کو جیسے سُن کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ مسز داس سے ایک گھونٹ پانی مانگ لے لیکن پھر یہ ارادہ ترک کر دیا۔

"ہم پہلی دفعہ اس وقت ملے جب لڑکپن میں تھے۔" وہ کہنے لگی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے اپنے دستی بیگ میں سے کچھ تلاش کیا اور پھر مڑ مڑوں کا پیکٹ نکال لیا۔ "کھائیں گے؟"
 "جی نہیں! شکریہ!"

اس نے مٹھی بھر مڑ مڑے مونہ میں ڈالے اور سیٹ پہ کچھ اور نیم دراز ہوتے ہوئے اپنی سمت والی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ "ہم نے اُس وقت شادی کی جب ابھی ہم کالج میں تھے۔ جس وقت راج نے مجھے شادی کی پیشکش کی تب ہم ہائی اسکول میں پڑھتے تھے۔ اسکول کے بعد ہم نے ایک ہی کالج میں داخلہ لیا۔ اُن دنوں ہم ایک دن کیا بلکہ ایک منٹ کے لیے بھی ایک دوسرے سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے والدین آپس میں بہت اچھے دوست تھے اور ہم لوگ ایک ہی علاقے میں رہتے تھے۔ ہر ہفتے کے اختتام پر راج ہمارے گھر آ جاتا تھا یا میں اس کے گھر چلی جاتی تھی۔ ہمیں بالائی منزل پہ کھیلنے کے لیے بھیج کر ہمارے والدین ایک دوسرے سے ہماری شادی کے بارے میں ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی ہمیں کچھ کرتے ہوئے نہیں پکڑا۔ اب مجھے لگتا ہے جیسے ان کی طرف سے یہ سب سوچ سمجھ کر کسی منصوبے کے تحت کیا جاتا تھا۔ ان جمعے اور ہفتے کی راتوں کو جب وہ لوگ چائے پی رہے ہوتے تھے تو ہم بالائی منزل پہ نہ جانے کیا کیا کرتے تھے۔ کاپاسی صاحب میں آپ کو کیا کیا کہانیاں سناؤں!!!"

مسز داس نے اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے کاپاسی کو بتایا کہ کالج میں زیادہ وقت راج کے ساتھ بتانے کے سبب اس کے زیادہ دوست بھی نہیں تھے۔ کوئی ایسا نہ تھا جس کے ساتھ راج کے بارے میں وہ راز و نیاز کر سکتی یا اسے اپنی الجھنیں بتا سکتی یا اس سے اپنے خدشات کا ذکر کر پاتی۔ ماں باپ اب تو دنیا کے اِس کنارے پہ اس سے بہت دور رہتے ہیں لیکن اُس دور میں بھی وہ کبھی ان کے زیادہ قریب نہیں رہی تھی۔ کم عمری میں شادی کرنے کے بعد وہ سر پہ پڑنے والی پے در پے ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب گئی تھی۔ پہلا بچہ بہت جلد ہو گیا تھا۔ جب راج اپنی کاٹن کی دھاری دار پتلون اور سویٹر پہن کر سکول چلا جاتا اور اپنے طالب علموں کو چٹانوں اور ڈائینو سارس کے بارے میں گیان بانٹ رہا ہوتا تو مینا گھر میں دودھ کی بوتلیں گرم کر کر کے بچے کو پلا رہی ہوتی تھی۔ وہ تلملاتی رہتی لیکن راج کے چہرے پہ اس

نے کبھی جھنجھلاہٹ یا غصہ نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کا جسم مینا کی طرح پہلے بچے کے بعد موٹاپے کی طرف مائل ہوا تھا۔

شروع شروع میں تو اس کی کالج کی ایک دو سہیلیاں شام کے کھانے یا خریداری کے لیے اسے اپنے ساتھ مین ہٹن^{۳۲} جانے کی دعوت دیا کرتی تھیں لیکن اس کے بار بار کے انکار کے بعد انہوں نے بھی اسے بلانا ترک کر دیا اس لیے اس کا سارا دن بچے کے ساتھ اس کے کھلونوں میں گھرے گزرتا تھا۔ یہ کھلونے اکثر اس کے پاؤں تلے آ جاتے اور وہ لڑکھڑا جاتی تھی۔ اکثر جب وہ بیٹھنے لگتی تو کوئی کھلونا اس کے نیچے دب جاتا اور وہ جھنجھلا اٹھتی۔ وہ تھکی تھکی سی اور بیزار رہنے لگی تھی۔ رونی کی پیدائش کے بعد راج اور اس نے اکٹھے گھر سے باہر جانا بہت کم کر دیا تھا۔ بالخصوص تفریح کے لیے تو وہ اب شاذ و نادر ہی باہر نکلتے تھے۔ راج کو زندگی میں اس تبدیلی سے کوئی گلہ نہ تھا۔ وہ پڑھا کے جب گھر واپس آتا تو اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ ٹیلی ویژن دیکھے اور رونی کو اپنے گھٹنوں پہ بٹھا کے جھلاتا رہے۔ مینا کو ایک دن یہ سن کر اور بھی غصہ آیا تھا کہ راج کا ایک پنجابی دوست ان کے ہاں ایک ہفتہ ٹھہرنے کے لیے آ رہا ہے۔ وہ راج کے اس دوست سے ماضی میں کہیں ایک آدھ دفعہ مل چکی تھی لیکن اسے یاد نہ تھا۔ یہ دوست نیو برنزوک^{۳۳} میں کسی ملازمت کے انٹرویو کے سلسلے میں ان کے ہاں قیام کرنے آ رہا تھا۔

اسی دوست کے دوران قیام ایک دوپہر بوبی کی زندگی کا بیچ بویا گیا۔ دوست کو لندن کی کسی فارماسیٹیکل کمپنی میں ملازمت کا سندیسہ ملا تھا اور ان کے ہاں اس کا وہ آخری دن تھا۔ وہ کافی بنا رہی تھی جب اس نے مینا کی کمر پہ آہستہ سے آکر ہاتھ رکھ دیا۔ مینا نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس نے کھینچ کر مینا کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا اور رونی کی اپنے پنگھوڑھے سے نکلنے کے لیے چیخ و پکار کے درمیان وہیں صوفے پر جہاں بڑے سے بنے چھوٹے چھوٹے کھلونے بکھرے پڑے تھے اس نے نہایت سرعت سے ساری حدیں پار کر لیں۔ راج کے برعکس اس نے ذومعنی مسکراہٹیں دینے کی بجائے بڑی خاموشی سے کسی ماہر کی طرح مجامعت کی تھی اور یہ مینا کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ دوسرے دن راج اس دوست کو جے ایف کینڈی کے ہوائی اڈے پر چھوڑ آیا تھا۔ یہ دوست اب شادی شدہ ہے۔ اس نے ایک پنجابی لڑکی سے شادی کر رکھی ہے اور وہ لندن میں مقیم ہیں اور ہر سال راج اور مینا سے کرسمس کارڈز کا تبادلہ کرتے ہیں۔ دونوں جوڑے ان کارڈوں پہ اپنی اپنی کنبے کی گروپ فوٹو چپکا کر بھیجا کرتے ہیں۔ اس دوست کو یہ علم نہیں تھا کہ وہ بوبی کا باپ ہے۔ وہ کبھی یہ جان بھی نہیں پائے گا۔

"میں معذرت چاہوں گا لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا مسز داس کہ آپ نے مجھے یہ ساری باتیں کیوں بتائی ہیں؟" جب وہ اپنی کہانی مکمل کر چکی تو کپاسی نے اس سے سوال کیا۔ وہ اب اپنا رخ بدل کر کپاسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"خدا کے لیے مجھے مسز داس کہنا بند کر دو! میں صرف اٹھائیس کی ہوں۔ شاید میری عمر کے تمہارے بچے ہوں گے!"

"بالکل بھی نہیں!" یہ جان کر کاپاسی کو دھچکا لگا کہ مسز داس اسے باپ کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ کاپاسی کے دل میں مسز داس کے لیے جو رومانوی جذبات پیدا ہوئے تھے اور جن کے زیر اثر وہ عقی آئینے میں بار بار خود کو دیکھتا رہا تھا ان پہ یکدم اوس پڑ گئی۔

"میں نے آپ کو آپ کی صلاحیتوں کی وجہ سے یہ راز بتایا ہے۔" اُس نے مُر موروں کے پیکٹ کے مونہ کو تہہ لگائے بغیر واپس اپنے بیگ میں رکھ دیا۔

"میں سمجھا نہیں!" کاپاسی بولا۔

"کیا آپ کو دکھائی نہیں دیتا کہ میں آٹھ سالوں سے کسی کو یہ راز بتا نہیں پائی، نہ کسی دوست کو اور راج کو تو بالکل بھی نہیں! اسے تو کبھی گماں بھی نہیں گزرا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اب بھی اس سے پیار کرتی ہوں۔ آپ کو اس سب پہ کچھ نہیں کہنا؟"

"کس بارے میں کچھ کہوں؟"

"اسی بارے میں جو میں نے آپ کو ابھی بتایا ہے۔ میرے اس راز کے بارے میں اور میری اس ابتر کیفیت کے بارے میں! میں جب اپنے بچوں کو دیکھتی ہوں، جب راج کو دیکھتی ہوں، تو مجھے اذیت ہوتی ہے۔ میرے دل و دماغ میں خوفناک خواہشیں سر اٹھاتی رہتی ہیں، میرا جی چاہتا ہے میں چیزوں کو اٹھا اٹھا کے پٹختی رہوں۔ ایک دن میرے من میں اس خواہش نے زور پکڑ لیا تھا کہ میں گھر کی ہر چیز کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں، ٹیلی ویژن کو، بچوں کو، ہر چیز کو! کیا آپ کو نہیں لگتا کہ یہ کسی بیماری کی علامت ہے؟"

کاپاسی خاموش تھا!

"کاپاسی صاحب آپ میری اس حالت پہ کچھ نہیں کہیں گے؟ میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ کا پیشہ ہی یہ ہے!"

"میرا پیشہ لوگوں کو سیر کروانا ہے مسز داس!"

"نہیں یہ نہیں! آپ کا دوسرا پیشہ، مریضوں کی ترجمانی والا۔"

"لیکن یہاں دو مختلف زبانوں کی اجنبیت تو حائل نہیں۔ یہاں کسی ترجمان کی کیا ضرورت ہے؟"

"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں آپ کو ہر گز نہ بتاتی اگر آپ لوگوں کے روگوں کی ترجمانی نہ کرتے ہوتے۔

آپ کو نہیں لگتا کہ میرا یہ راز آپ کو بتانا میرے لیے کیا معنی رکھتا ہے؟"

"کیا معنی رکھتا ہے؟"

"یہ ظاہر کرتا ہے کہ میں اب اس اذیت کے بوجھ تلے دبے دبے تھک گئی ہوں۔ آٹھ سال کپاسی صاحب، میں نے آٹھ سال یہ اذیت سہی ہے۔ میں امید کر رہی تھی کہ آپ میرے اس احساسِ اذیت کو کم کر سکیں گے، آپ کچھ ایسا کہیں گے کہ میں بہتر محسوس کروں۔ میرا خیال تھا آپ مجھے اس روگ سے نجات کا کوئی نسخہ بتائیں گے۔"

کپاسی نے غور سے مسز داس کو دیکھا۔ سرخ و سفید خانوں والی سکرٹ اور سٹر ابری شرٹ پہنے یہ عورت جو ابھی تیس کو بھی نہیں پہنچی تھی اسے نہ اپنے شوہر سے محبت رہی تھی اور نہ اپنے بچوں سے، اس کا زندگی سے محبت کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ مسز داس کے اعتراف نے کپاسی کو افسردہ کر دیا۔ افسردگی کی یہ کیفیت اس وقت اور گہری ہو گئی جب اس نے مسٹر داس کو ڈھلوانی رستے کی چوٹی پہ کھڑے دیکھا۔ ٹینا اس کے کندھے سے لٹکی ہوئی تھی اور وہ پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی قدیم رہائشی غاروں کی تصویریں بنا رہا تھا تاکہ امریکا جا کر اپنے طالب علموں کو دکھاسکے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی کہیں یہ نہ تھا کہ اس کا ایک بیٹا اس کا نہیں ہے۔ کپاسی کو یہ سوچ کر توہین محسوس ہوئی کہ مسز داس نے اس سے اپنے اس بیہودہ اور حقیر سے روگ کا علاج تجویز کرنے کی طلب کی تھی۔ مسز داس ان مریضوں سے قطعی مختلف تھی جو ڈاکٹر کے دفتر میں علاج کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ اجڑی نیندوں یا اکھڑتی سانسوں یا پیشاب کی روانی میں حائل رکاوٹوں سے مضطرب ان مریضوں کی آنکھیں زندگی کی چمک سے محروم ہوتی تھیں اور وہ اپنے دکھوں کو الفاظ کا روپ دینے سے قاصر ہوتے۔ مسز داس اور ان مریضوں میں اس تفاوت کے باوجود کپاسی کو لگ رہا تھا کہ مسز داس کی مدد کرنا اس کا فرض بنتا ہے۔ شاید اسے مسز داس کو تجویز دینی چاہیے کہ وہ راج کو سب کچھ بتادے۔ وہ انہیں سمجھائے کہ رشتے نبھانے میں دھوکہ دہی اور فریب سے بچ کر اخلاص اور راست گوئی کے رستے پہ چلنا ہی بہترین طریقہ ہے۔ وہ اپنی کیفیت میں جس بہتری کی طالب ہیں وہ سچائی سے ہی ممکن ہے۔ شاید اسے مسز داس کو یہ بھی پیشکش کرنی چاہیے کہ جب وہ راج کو یہ راز بتا رہی ہوگی تو کپاسی درمیان میں بطور مصالحت کار موجود رہے گا۔ کپاسی نے فیصلہ کیا کہ اس قضیے کی تہہ تک جانے کے لیے اسے بنیادی سوال پوچھنا چاہیے۔

"کیا آپ محض اذیت محسوس کرتی ہیں یا پھر یہ احساسِ ندامت ہے جو آپ کو شرمسار کرتا ہے؟"

وہ کپاسی کی طرف مڑی اور اسے گھورنے لگی، اس کے گلابی ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے پھر جیسے اس کی آنکھوں میں گیان کی کوئی رو سے دوڑی اور اس نے بولنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کپاسی کو دھچکا لگا۔ وہ اسی لمحے جان گیا تھا کہ اس کی اہمیت اتنی سی بھی نہیں ہے کہ اسے جواب دے کر ڈھنگ سے بے عزت ہی کیا جاسکے۔ مسز داس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور سامنے کی طرف رستے پہ اپنی چو کو ر ہیل والی جوتیوں میں کسی قدر ڈمگاتی چل پڑی۔ اس نے اپنے دستی بیگ میں ہاتھ ڈال کر کھانے کے لیے مٹھی بھر مڑے نکالے لیکن ان میں سے زیادہ تر اس کی مٹھی سے پھسل کر نیچے

گرنے لگے اور زمین پہ ایک ٹیڑھی میڑھی سی لکیر بناتے چلے گئے۔ یہ دیکھ کر درخت سے ایک بندر لپک کر نیچے اترا اور چاولوں کے ان چھوٹے چھوٹے سفید دانوں کو چٹ کر مزید کی تلاش میں مسز داس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی کچھ اور بندر بھی اس مارچ میں شامل ہو گئے اور جلد ہی آدھے درجن کے قریب بندر اپنی مٹھلیں دھیں لہراتے مسز داس کا پیچھا کر رہے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر کاپاسی گاڑی سے اترا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ چیخ کر یا کسی اور سبیل سے مسز داس کو آگاہ کرے لیکن اسے ڈر تھا کہ اگر مسز داس کو اپنے پیچھے بندروں کی موجودگی کا پتہ چل گیا تو وہ سخت بوکھلا جائیں گی۔ شاید وہ ڈر کے اپنا توازن کھو دیں، شاید بندر ان کا بیگ چھیننے یا بال کھینچنے کی کوشش کریں۔ اس لیے کاپاسی نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور بندروں کو بھگانے کے لیے ایک درخت سے ٹوٹی ہوئی ٹہنی اٹھا کر تیز تیز قدموں سے مسز داس کی طرف بڑھنے لگا۔ مسز داس کاپاسی کے پیچھے آنے سے بے خبر آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور اس کے ہاتھوں سے چاول کے بھر بھرے دانے پیچھے گر کر نشان چھوڑتے جا رہے تھے۔ ڈھلوانی رستے کی چوٹی سے ذرا نیچے جہاں پتھروں سے بنے قوی ستونوں کے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمروں کی ایک قطار تھی اس کے سامنے مسٹر داس زمین پہ جھکا ہوا اپنے کیمرے کے لینس کو فوکس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بچے کمروں کے سامنے بنے تنگ و تاریک برآمدے میں کھڑے کبھی نگاہوں سے او جھل ہو جاتے کبھی دکھائی دینے لگتے تھے۔

"میرے لیے ٹھہرو۔" مسز داس نے چلا کر کہا۔ "میں آرہی ہوں۔"

ٹینا یہ سن کر اپنی جگہ اچھلنے لگی۔ "ممی بھی آگئیں!"

"بہت اچھا!" مسٹر داس نے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔ "تم ٹھیک وقت پہ پہنچی ہو! کاپاسی کو بلاتے ہیں وہ ہم پانچوں کی اکٹھی تصویر کھینچے گا۔"

کاپاسی نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ ہاتھ میں پکڑی ٹہنی کو وہ زور زور سے ہلاتا جا رہا تھا تاکہ بندروں کی توجہ بٹ جائے اور وہ ڈر کر بھاگ جائیں۔

"بوٹی کہاں ہے؟" مسٹر داس کے پاس پہنچ کر رکتے ہی مسز داس نے سوال کیا۔

مسٹر داس نے کیمرے سے نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھا۔ "مجھے نہیں پتہ۔ روٹی! بوٹی کہاں ہے؟"

روٹی نے کندھے اچکائے۔ "ابھی تو وہ یہیں تھا!"

"کہاں ہے وہ؟" مسز داس نے چلا کر دوبارہ پوچھا۔ "تم لوگوں کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟"

ان سب نے مل کر بوٹی کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔ وہ رستے پہ کبھی اوپر جاتے کبھی نیچے آتے۔ ان کی آوازوں میں

بوبی کی چیخوں کی آواز دب گئی تھی اس لیے وہ پہلے پہل اس کو سن نہ پائے۔ بوبی رستے پہ تھوڑا نیچے ایک درخت تلے کھڑا تھا جہاں بندروں کے ایک غول نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ درجن سے زائد یہ بندر اس کی ٹی شرٹ کو اپنے کالے کالے لمبے ناخنوں سے کھینچ رہے تھے۔ بوبی کے قدموں میں وہ مرمے بکھرے پڑے تھے جو مسز داس آتے ہوئے گراتی آئی تھیں۔ لڑکا ششدر کھڑا تھا، اس کا جسم جیسے سُن ہو چکا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہہ کر اس کے دہشت زدہ چہرے کو تر کر رہی تھی۔ اس کی نگلی ٹانگیں گرد آلود تھیں اور ان پہ جابجا اسی بندر کے ہاتھوں لگنے والی ضربوں کے سرخ نشان دکھائی دے رہے تھے جسے اس نے کچھ دیر قبل خود ہی لکڑی پکڑائی تھی۔

"ڈیڈی! بندر بوبی کو مار رہے ہیں!" ٹینا نے چلاتے ہوئے کہا۔

مسٹر داس نے اپنے دونوں ہتھیلیاں اپنی نیکر سے صاف کیں۔ بوکھلاہٹ میں وہ کیمرے کے شرٹ کا بٹن دبا بیٹھا جس سے کیمرے کے اندر فلم چلنے کی گڑ گڑاہٹ نے بندروں کو اور مشتعل کر دیا اور وہ بندر جس کے ہاتھ میں لکڑی تھی اور بھی شد و مد سے بوبی کو مارنے لگا۔

"ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اگر ان سب نے حملہ کر دیا تو ہم کیا کریں گے؟" مسٹر داس کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے۔

"کاپاسی صاحب!" مسز داس کاپاسی کو پاس ہی کھڑے دیکھ کر چیخی۔ "کچھ کیجیے، خدا کے لیے کچھ کیجیے!"

کاپاسی نے اپنی ٹہنی اٹھائی اور بندروں کو ڈرا دھمکا کر دور بھگا دیا۔ کچھ بندر ڈھیٹ تھے اور آسانی سے بوبی کی جان چھوڑنے پہ آمادہ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کاپاسی نے انہیں ڈرانے کے لیے زور زور سے زمین پہ پاؤں مارے اور مونہ سے شو شو کی آوازیں نکالنے لگا۔ یہ بندر آہستہ آہستہ بپے تلے قدموں سے پیچھے ہٹنے لگے۔ ان کے پسپائی میں کہیں خوف کی رمتق نہ تھی۔ کاپاسی نے بوبی کو اپنے بازوؤں پہ اٹھالیا اور واپس اس جگہ لے آیا جہاں اس کے والدین اور بہن بھائی کھڑے تھے۔ جب وہ بوبی کو اٹھا کر لا رہا تھا تو اس کے جی میں آیا کہ وہ اس کے کان میں راز کی ایک بات پھونک دے لیکن بوبی اس حادثے سے گنگ ہو چکا تھا، اس کا بدن مارے خوف کے کانپ رہا تھا اور اس کی ٹانگوں پہ جہاں لکڑی لگنے سے جلد ادھر گئی تھی خون رس رہا تھا۔ جیسے ہی کاپاسی نے بوبی کو اس کے والدین کے حوالے کیا مسٹر داس نے اس کی شرٹ سے مٹی جھاڑی اور اس کی ٹوپی کا چھاسیدھا کیا۔ مسز داس نے اپنے دستی بیگ سے ایک پٹی نکال کر بوبی کے گھٹنے پہ جہاں زخم تھا باندھ دی۔ رونی نے اپنے بھائی کی دلجوئی کے لیے اسے اپنی نئی بیل گم پکڑادی۔

"بالکل ٹھیک ہے بوبی! بس تھوڑا ڈر گیا ہے، ہے نا بوبی؟" مسٹر داس نے بوبی کو سر پہ پیار سے تھپکتے ہوئے کہا۔

"او میرے خدا! چلو یہاں سے نکل چلیں۔" مسز داس نے اپنے بازو اپنے سینے پہ اکٹھے کرتے ہوئے کہا۔ "اس جگہ سے

مجھے وحشت ہو رہی ہے!"

"ہاں بالکل! ہوٹل واپس چلتے ہیں۔" مسٹر داس نے اس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"بے چارہ بوبی!" مسز داس بولی۔ "ادھر میرے پاس آؤ ذرا، ممی کو اپنے بال ٹھیک کرنے دو۔" اس نے پھر اپنے بیگ میں سے تلاش کر کے بالوں کا برش نکالا اور بوبی کے بال سہلانے لگی۔ بیگ سے برش نکالتے ہوئے وہ پرچی جس پہ کپاسی کا پتہ لکھا ہوا تھا باہر آگری اور تیز ہوا میں لہرانے لگی۔ کپاسی کے سوا کسی اور نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ کپاسی اسے ہوا کی لہروں کے ساتھ تیرتے اور اوپر ہی اوپر اٹھتے ہوئے دیکھتا رہا یہاں تک کہ یہ ان درختوں کے پتوں میں کہیں او جھل ہو گئی جن پہ بندر بیٹھے بڑے انہماک سے نیچے کا یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ کپاسی نے بھی بہ نگاہ غور اس منظر کو دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ داس خاندان کی یہ ہی وہ تصویر ہے جو اس کے دماغ میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

اصلی دربان

رہائشی عمارت کے زینے صاف کرنے والی بوڑھی اماں گذشتہ دو راتوں سے چین کی نیند سے محروم تھی۔ اس لیے تیسری صبح اس نے سوچا کہ اپنی گدڑی جھاڑ کر ان نگوڑے کھٹلوں سے نجات پائی جائے۔ پہلے اس نے لیٹر بکسوں کے نیچے جہاں اس کا ٹھکانہ تھا اور پھر باہر گلی میں نکل کر اپنی دلائی اس زور سے جھٹکی کہ ذرا فاصلے پر سبزیوں کے چھلکوں پہ ٹھونکیں مارتے کوئے کانیں کانیں کرتے مختلف اطراف میں بکھر گئے۔

جب بوڑھی اماں نے چھت پہ جانے کے لیے اس چار منزلہ عمارت کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں تو اس کا ایک ہاتھ مستقل اس کے گھٹنے پہ تھا جو ہر سال برسات کی ابتدا میں سو جاتا اور اس کے لیے چلنا پھرنا دو بھر کر دیتا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بالٹی، جھاڑو اور دلائی تھی جو اس نے جیسے تیسے بازو تلے دبار کھی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے اسے ایسا لگنے لگا تھا جیسے یہ زینے کسی لکڑی کی سیڑھی کی طرح عمودی ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی عمر چونٹھ سال تھی اور اس کے سر پہ بالوں کی گجھلک چوٹی اب محض اخروٹ جتنی رہ گئی تھی۔ وہ سامنے سے جیسی سوکھی سڑی لگتی تھی پہلو سے بھی ویسی ہی سپاٹ دکھائی دیتی تھی۔

بوڑھی اماں کی ناتواں کاٹھی میں جو چیز تو انا تھی وہ اس کی آواز تھی۔ یوں لگتا جیسے اس کی تیز آواز میں اس کے سارے غم گندھ گئے ہوں۔ اس میں ترش دہی جیسی کاٹھوتی تھی اور یہ ایسی پاٹ دار تھی جیسے کدو کش پہ ناریل چھیلا جا رہا ہو! اپنی اسی جاندار آواز میں وہ دن میں کم از کم دو دفعہ، جب زینوں کی صفائی کر رہی ہوتی، بٹوارے میں خود پر بیتنے والی داستانِ غم تفصیل سے سناتی تھی۔ وہ بتاتی تھی کہ تقسیم کے ہنگاموں میں مشرقی بنگال سے کلکتہ آتے ہوئے وہ اپنے شوہر، چار بیٹیوں اور دو منزلہ پکے مکان سے جدا ہو گئی تھی۔ اس مکان میں اس کی شیشم کی لکڑی سے بنی ایک الماری اور قیمتی اشیاء سے بھرے بہت سے صندوق تھے جن کی چابیاں اب بھی اس کی ساڑھی کے پلو سے ہر وقت لٹکتی رہتی تھیں۔

ہجرت کے دوران ملنے والی تکالیف کا ذکر کرنے کے علاوہ بوڑھی اماں کا مرغوب موضوع اچھے وقتوں کی آسائشوں کو یاد کرنا تھا۔ چنانچہ اس دن جب وہ ایک گھٹنے پہ ہاتھ رکھے دوسری منزل تک پہنچی تو عمارت کے لوگ اس کی تیسری بیٹی کی شادی میں پکنے والی رنگ برنگ ڈشوں کی تفصیلات سننے کے لیے پوری طرح متوجہ ہو چکے تھے۔ "ہم نے اس کا بیاہ ایک اسکول پرنسپل سے طے کیا تھا۔ شادی والے دن چاولوں کو عرق گلاب میں پکایا گیا تھا۔ شہر کا میسر بھی مدعو تھا۔ ہر مہمان کے ہاتھ جستی کٹوروں میں دھلوائے گئے تھے۔" یہاں بوڑھی اماں نے ذرا توقف کیا، اپنی پھولتی سانسوں کو

سنجھالا اور اپنے سامان کو بازو تلے درست کیا۔ اسی اثنا میں اسے زینوں کے جنگلے کے پاس ایک لال بیگ ریختا دکھائی دیا جسے اس نے بھگا دیا اور اپنی کہانی جاری رکھی۔ "بٹیا کی شادی میں سرسوں کے پیسٹ میں گندھے ہوئے جھینگوں کو کیلے کے چھلکوں میں رکھ کر بھاپ دے کر پکایا گیا تھا۔ کوئی کھانا ایسا نہ تھا جو پروسانہ گیا ہو۔ ہمارے لیے یہ کوئی ایسی فضول خرچی نہ تھی کیونکہ ہم گھر میں ویسے بھی ہفتے کے دو دن مٹن پکایا کرتے تھے۔ ہماری زمینوں پہ ایک تالاب بھی تھا جو مچھلیوں سے اٹارتا تھا۔"

اب بوڑھی اماں کو چھت سے روشنی کی ایک کرن زینے پہ پھیلتی دکھائی دے رہی تھی اور اگرچہ ابھی محض صبح کے آٹھ بجے تھے لیکن سورج کی حدت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ وہ اپنے قدموں تلے سیمنٹ سے بنے زینوں کی گرمی محسوس کر سکتی تھی۔ یہ ایک بہت پرانی وضع کی عمارت تھی۔ اتنی پرانی کہ نہانے کے لیے پانی ابھی بھی ڈرموں میں بھر کے رکھا جاتا تھا اور اس کی کھڑکیاں شیشوں سے یکسر عاری تھیں۔

"ہمارے باغوں سے ایک مزارع کھجوریں اور امرود چننے آیا کرتا تھا اور ایک دوسرا گڑھل کے پودوں کی کانٹ چھانٹ کرنے کے لیے وقف تھا۔ وہاں اپنے گھر میں میں نے زندگی کا اصلی رس چکھا تھا یہاں تو میں کھانا بھی چاولوں کے چھوٹے سے پیالے میں کھاتی ہوں۔" کہانی میں یہاں پہنچ کر بوڑھی اماں کے سو بے ہوئے گھٹنے سے درد کی ایک ٹیس اٹھی اور اس کے کانوں کی لوئیں درد سے جلنے لگیں۔ "کیا میں نے تم لوگوں کو یہ بتایا ہے کہ جب میں نے سرحد پار کی تو میری کلائیوں میں محض دو کنگن بچے تھے؟ ہائے ہائے! ایک وہ دن تھے کہ میرے پاؤں سنگ مرمر پہ پڑتے تھے۔ تم لوگ مجھ پہ یقین کرو یا نہ کرو یہ ایسی آسانشیں تھیں جن کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے!"

بوڑھی اماں کے ان دعوؤں میں حقیقت کتنی تھی اور افسانہ کس قدر تھا کوئی بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن ایک بات سب جان گئے تھے کہ اُس کی اس سابقہ جاگیر کا حدود اربعہ ہر گزرتے دن کے ساتھ دو گنا ہوتا جا رہا تھا اور اس کی الماری اور صندوقوں کے قیمتی سامان کی فہرست طویل تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس بات میں تو کسی کو شک نہ تھا کہ وہ مہاجر ہے کیونکہ وہ جس لہجے میں بنگالی بولتی تھی وہ مقامی نہ تھا۔ لیکن اس فلیٹوں بھری عمارت کے مکینوں کو بوڑھی اماں کی سابقہ دولت کے دعوؤں اور اس کے مشرقی بنگال سے ہزاروں دوسرے مہاجرین کے ساتھ ٹرکوں میں پٹ سن کی بوریوں کے درمیان لد کر ہجرت کرنے کے قصے میں کوئی میل دکھائی نہ دیتا تھا۔ کبھی کبھی تو بوڑھی اماں کا اصرار ہوتا کہ اس نے ٹرک پہ نہیں بلکہ بیل گاڑی پہ بیٹھ کے سرحد پار کی تھی۔

"آپ کس پہ آئی ہو ٹرک پہ یا بیل گاڑی پہ؟" بچے جب گلی میں چورسپاہی کھیلنے جا رہے ہوتے تو بعض دفعہ رک کر اس سے تصدیق چاہتے اور بوڑھی اماں اپنی ساڑھی کا وہ پلو جس کے ساتھ اس کے صندوقوں کی چابیاں بندھی ہوتی تھیں

زور سے ایسے ہلاتی کہ چابیاں بج اٹھتیں۔ "اتنی تفصیل میں کیوں جاتے ہو؟ پان سے چونا کیوں کھرچتے ہو؟ مجھ پہ یقین کرو یا نہ کرو تمہاری مرضی! میری زندگی ایسے غموں سے عبارت ہے جن کو تم خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے!"

اگرچہ بوڑھی اماں کے بیان کردہ قصے حد درجہ مبالغہ آمیز لگتے کیونکہ اس کی باتوں میں واضح تضاد ہوتا تھا اور وہ اپنے ہر قصے میں رنگ آمیزی کر دیتی تھی لیکن اس کا جذباتی اندازِ بیاں اتنا قائل کر دینے والا ہوتا اور اس کی لفظی تصویر کشی اتنی دلکش اور جاندار ہوتی تھی کہ اسے آسانی سے رد کرنا ممکن نہ ہوتا۔

ایسی کون سی زمیندارنی ہے جو بڑھاپے میں سیڑھیاں صاف کرتی پھر رہی ہے؟ یہ وہ خیال تھا جو تیسری منزل پہ رہنے والے دلال صاحب کے ذہن میں اس وقت اٹھتا جب وہ روزانہ دفتر آتے جاتے بوڑھی اماں کے پاس سے گزرتے تھے۔ دلال صاحب کالج اسٹریٹ پہ پلمبنگ کا سامان بیچنے والے ایک تھوک کے بیوپاری کے ہاں رسیدوں کی لکھت پڑھت کا نظام سنبھالتے تھے۔

فلیٹوں میں رہنے والی زیادہ تر بیویوں کا اجتماعی قیاس یہ تھا کہ بے چاری بوڑھی اماں اپنے خاندان کو کھودینے کا غم غلط کرنے کے لیے ایسی کہانیاں گھڑتی رہتی ہے اور بوڑھے چترجی کا تو گویا یہ تکیہ کلام تھا: "بوڑھی اماں تو جنموں جلی ہے۔ یہ بدلتے زمانوں کی ستم ظریفی کا شکار ہے!" آزادی کے بعد سے چترجی نہ کبھی بالکونی سے ہٹے تھے اور نہ انہوں نے کبھی کوئی اخبار کھول کر دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود یا شاید اسی وجہ سے ان کی رائے کو ہمیشہ فوقیت دی جاتی تھی۔

ایک روز نہ جانے کہاں سے عمارت کے مکینوں میں یہ نظریہ گردش کرنے لگا کہ بوڑھی اماں بٹوارے سے قبل کسی تنگڑے زمیندار کے ہاں کام کاج کرتی رہی تھی۔ اسی لیے وہ آسائشوں کی تفصیل بتاتے ہوئے اتنی جزئیات کے ساتھ اپنے ماضی میں مبالغے کا تڑکا لگا پاتی تھی۔ بوڑھی اماں کے یہ دعوے کسی کو ضرر نہیں پہنچاتے تھے۔ سب تسلیم کرتے تھے کہ وہ باتیں بہت دلچسپ کرتی ہے جن سے وہ سب خوب محظوظ ہوتے تھے۔ لیٹر بکسوں کے نیچے تنگ و تاریک جگہ پر رہائش کے بدلے میں بوڑھی اماں ان کی عمارت کے ٹیڑھے میڑھے زینوں کو آئینے کی طرح چکا کر رکھتی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہاں کے مکینوں کو یہ تسلی رہتی تھی کہ رات کو مرکزی دروازے سے لگ کر سوئی ہوئی بوڑھی اماں ان کے اور باہر کی دنیا کے درمیان گویا ایک دربان کا کام کرتی تھی۔

یوں تو درجنوں فلیٹوں پہ مبنی اس کثیر منزلہ عمارت کے مکینوں کے پاس کچھ ایسا مال و متاع نہ تھا جس کے چوری ہونے کا خدشہ لاحق ہو۔ دوسری منزل پہ مقیم بیوہ مسز مشرا وہ واحد رہائشی تھیں جن کے پاس ٹیلی فون تھا۔ لیکن اس بے سروسامانی کے باوجود عمارت کے مکینوں کو اس امر کی تسلی رہتی تھی کہ بوڑھی اماں گلی میں ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتی ہے۔ وہ گھر گھر جا کر سامان بیچنے والے ہر خواجہ فروش اور چھابڑی والے کی پہلے اچھی طرح چھان بین کرتی

پھر عمارت میں گھسنے دیتی اور اگر کسی کو کہیں آنا جانا ہوتا تو جھٹ پٹ سڑک سے رکشہ بلا دیتی تھی۔ مزید براں بوڑھی اماں کو اگر عمارت کے آس پاس کوئی مشکوک شخص تھوکنے، موتنے یا کسی اور مشتبہ سرگرمی میں ملوث نظر آتا تو وہ فوراً اسے اپنے جھاڑو کی چند ضربوں سے ہی پسپا ہونے پر مجبور کر دیتی تھی۔

مختصر یہ کہ سالہا سال کی اس رکھوالی کے بعد بوڑھی اماں کی اس عمارت کے لیے خدمات کسی اصلی دربان سے کم نہ تھیں۔ اگرچہ عام حالات میں دربان کی ملازمت کسی عورت کے بس کا کام نہ تھا لیکن بوڑھی اماں اپنی اس ذمہ داری کو اچھی طرح نبھا رہی تھی۔ وہ عمارت پہ ایسی ہی کڑی نظر رکھتی تھی جیسے وہ لوئر سرکولر روڈ یا جودھ پور پارک^{۳۴} یا کسی اور پوش علاقے کے کسی شاندار بنگلے کی چوکیداری کر رہی ہو۔

چھت پہ پہنچ کے بوڑھی اماں نے اپنی دلائی اور چادریں تار پہ لٹکا دیں۔ کپڑوں والی تار چھت کی دیوار کی ایک منڈیر سے لے کر دوسرے منڈیر تک کسی قدر ترچھی بندھی ہوئی تھی اور اس کے پار چھتوں پہ جا بجا لگے ٹی وی انٹینے، اشتہاری بل بورڈ اور ان سے بھی پرے ہاؤسنگ^{۳۵} کے آہنی ستون صاف نظر آتے تھے۔ بوڑھی اماں نے گھوم پھر کر چھت کے چاروں اطراف افق پہ ایک نگاہ ڈالی اور پھر چھت پہ لگی ٹینکی کی ٹونٹی کھول کر اپنا مونہ دھویا، پاؤں کھگالے اور انگلی سے دانت صاف کیے۔ اس کے بعد وہ دلائی کو دونوں طرف سے اپنے جھاڑو کی مدد سے کوٹنے لگے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رک کر وہ دلائی سے چمٹے سیمنٹ کے ذرات کو آنکھیں میچ میچ کر اس امید پہ غور سے دیکھ رہی تھی کہ شاید اسے اس کی بے آرام راتوں کا مجرم کوئی کھٹل دکھائی دے جائے۔ وہ اپنی اس تفتیش میں اس قدر مگن تھی کہ اسے کچھ دیر تک تو تیسری منزل والی مسز دلال کی چھت پر آمد کی خبر ہی نہ ہوئی۔ مسز دلال چھت پہ لیموؤں کے نمک لگے چھلکے سوکھنے کے لیے رکھنے آئی تھیں۔ "اس دلائی میں ہی کچھ ایسا چھپا ہوا ہے جو مجھے ساری ساری رات جگائے رکھتا ہے۔" بوڑھی اماں گویا ہوئیں۔ "ذرا دیکھنا تمہیں کچھ دکھائی دیتا ہے اس میں!"

مسز دلال اپنے دل میں بوڑھی اماں کے لیے نرم گوشہ رکھتی تھیں۔ وہ کبھی کبھار اس کو ادرک کی چٹنی دے دیا کرتی تھیں تاکہ بوڑھی اماں اپنے بے مزہ سالن کو کچھ مزیدار بنا سکے۔

"مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔" کچھ دیر غور کرنے کے بعد مسز دلال بولی۔ اس کے پپوٹے ایسے شفاف تھے جیسے وہ بند آنکھوں سے بھی آر پار دیکھ سکتی ہو اور اس کے پاؤں کی پتلی پتلی انگلیوں میں چھلے پڑے ہوئے تھے۔

"ان کے شاید پر ہوں گے جو اڑ کر غائب ہو گئے۔" بوڑھی اماں نے نتیجہ نکالتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے آسمان پہ ایک دوسرے کے پیچھے اڑتے بادلوں کو غور سے دیکھا۔ "یہ کٹھنل میرے کوٹنے سے پہلے ہی اڑ گئے ہوں گے۔ لیکن تم میری پیٹھ تو دیکھو یہ ان کے کاٹنے سے ضرور نیلی پڑ گئی ہو گی۔"

مسز دلال نے بوڑھی اماں کی ساڑھی کا ایک کونا اٹھایا اور اس کی پیٹھ پہ بلاؤز سے اوپر اور نیچے نگاہ ڈالی۔ بوڑھی اماں کی سستے کپڑے سے بنی سفید ساڑھی کے کنارے پیلے پڑ گئے تھے اور اس کے بلاؤز کی کٹنگ ایسی تھی کہ مدت ہوئی اس کا رواج ختم ہو گیا تھا۔ پشت پہ طائرانہ نظر ڈال کے مسز دلال بولی: "بوڑھی اماں! آپ کی پیٹھ بالکل ٹھیک ہے یہ صرف آپ کا وہم ہے!"

"میرا وہم نہیں ہے میں تمہیں بتا رہی ہوں یہ کٹھنل مجھے جیتے جی نوچ رہے ہیں۔"

"شاید گرمی دانوں کی وجہ سے آپ کو ایسا لگ رہا ہو گا۔" مسز دلال نے ممکنہ وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر بوڑھی اماں نے اپنی ساڑھی کا وہ پلو زور زور سے ہلایا جس کے ساتھ اس کے سابقہ خزانوں کی چابیاں بندھی ہوئی تھیں۔ چابیوں کی کھٹکھناہٹ میں وہ بولی۔ "مجھے گرمی دانوں کا پتہ ہے۔ یہ گرمی دانے نہیں ہیں۔ میں پچھلے تین دنوں سے نہیں سوئی، یا شاید چار دنوں سے۔ اب دن کون گئے؟ گھر میں میرا بستر بڑا صاف ستھرا ہوتا تھا۔ ہماری چادریں بھی بڑے لطیف کاٹن سے بنی ہوتی تھیں۔ تم مجھ پہ یقین کرو یا نہ کرو۔ ہماری ہاں مچھر دانیاں بھی ریشم کی طرح نرم و نازک ہوتی تھیں۔ میں نے وہاں زندگی کی وہ آسائشیں دیکھی ہیں جن کا تم خواب بھی نہیں دیکھ سکتیں۔" "میں خواب بھی نہیں دیکھ سکتی!" مسز دلال نے بوڑھی اماں کے الفاظ دہرائے۔ اس نے اپنی نظریں جھکا لیں اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ "میں کیسے ان کے خواب دیکھ سکتی ہوں بوڑھی اماں۔ میں دو ٹوٹے پھوٹے کمروں والے فلیٹ میں رہتی ہوں اور میری شادی اس شخص سے ہوئی ہے جو ٹائلٹ کا سامان بیچتا ہے۔" مسز دلال دوسری طرف مڑی اور دلائی کو غور سے دیکھنے لگی۔ پھر اس کی سلائی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بولی۔ "بوڑھی اماں اس بچھونے پہ کتنے عرصے سے سو رہی ہو تم؟"

بوڑھی اماں نے اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے کچھ لمحے سوچا اور پھر اسے بتایا کہ اسے بالکل یاد نہیں کہ یہ دلائی کب سے اس کے پاس ہے۔

"تم نے مجھے اس کے بارے میں آج سے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ہم اتنے گزرے ہیں جو تمہیں نئی، صاف ستھری دلائی بھی نہیں دلا سکتے؟" ایسا لگ رہا تھا جیسے بوڑھی اماں کی دلائی اور چادروں کی خستہ حالی دیکھ کر مسز دلال کو اپنی ہتک محسوس ہو رہی ہو۔

"نئی دلائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ان سب کو اپنے جھاڑو سے خوب جھاڑا ہے۔ اب یہ بالکل صاف ہیں۔" "میں تمہاری کوئی حجت نہیں سنوں گی۔" مسز دلال بولی۔ "تمہیں ایک نئے بستر، نئی دلائی، نئے سرہانے اور جب سردیاں آجائیں تو ایک نئے کمبل کی ضرورت ہے۔" جب وہ یہ بول رہی تھی تو اپنے انگوٹھے سے اپنی انگلیوں کے

پوروں پہ ان چیزوں کی تعداد گنتی جارہی تھی۔

"جب تہوار کے دن آتے تو غریب غربا کو ہمارے گھر سے کھانا بانٹا جاتا تھا۔" بوڑھی اماں پھر ماضی کو یاد کرنے لگی۔ وہ اپنی بالٹی کو چھت کے دوسرے کونے میں پڑے کونلوں سے بھر رہی تھی۔

"دلال صاحب آج دفتر سے گھر واپس آتے ہیں تو میں ان سے بات کرتی ہوں۔" سیڑھیوں پہ قدم رکھتے ہوئے مسز دلال نے مڑ کر کہا۔ "شام کو میری طرف آنا میں تمہیں کچھ اچار اور پیٹھ پہ لگانے کے لیے پاؤڈر دوں گی۔"

"میں کہہ رہی ہوں یہ گرمی دانے نہیں ہیں۔" بوڑھی اماں نے جواب دیا۔

یہ حقیقت تھی کہ موسم برسات میں یہاں لوگوں کو گرمی دانوں کا عام مسئلہ رہتا تھا لیکن بوڑھی اماں کا خیال تھا کہ اس کے آرام کا ستیاناس کرنے والا، اس کی نیندیں اڑانے والا اور اس کی بوڑھی جلد کو مرچوں کی طرح جلانے والا گرمی دانے کی بجائے کوئی حقیر سا کھٹل تھا۔

بوڑھی اماں نے جب زینوں کی صفائی شروع کی تب بھی وہ دل ہی دل میں اپنے اسی مسئلے کی گتھی سلجھا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ اوپری زینوں سے نیچے کی طرف صفائی کرتے ہوئے جاتی تھی۔ ابھی وہ دوسری منزل تک ہی پہنچی تھی کہ اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ پانی کے تھیڑے اتنے زوردار تھے کہ پلک جھپکنے میں مسز دلال کے لیموؤں کے چھلکوں کو بہا کر گٹر میں لے گئے۔ اس سے پہلے کہ راہگیر اپنی چھتریاں کھول پاتے بارش کا پانی ان کے کالروں، جیبوں اور جوتوں میں سرایت کر چکا تھا۔ رہائشی فلیٹوں کی اس عمارت اور اس کے ارد گرد موجود دوسری عمارتوں کی کھڑکیوں کے چرچراتے پٹ دھڑادھڑ بند ہونے لگے اور انہیں ہوا کے زور پہ دوبارہ کھلنے سے باز رکھنے کے لیے کمر بندوں کی مدد سے کھڑکیوں کی سلاخوں سے باندھ دیا گیا۔ بوڑھی اماں نے اوپر جاتے زینوں کو دیکھا جو اسے کسی لکڑی کی سیڑھی جیسے عمودی لگ رہے تھے اور اسے بوچھاڑ کا بڑھتا ہوا تیز شور محسوس ہوا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی دلائی اور چادروں کا اتنی سی دیر میں ہی دہی بن چکا ہو گا۔

لیکن پھر اسے کچھ دیر قبل کی مسز دلال کی گفتگو یاد آئی اور وہ دوبارہ سیڑھیوں سے مٹی، سگریٹ کے ٹوٹے اور دواؤں کے خالی ریپر صاف کرنے میں جُت گئی۔ نیچے لیٹر بکسوں تک پہنچنے کے اس نے اپنی ٹوکریوں میں سے جلدی جلدی پرانے اخبارات نکال کر مرکزی دروازے کے اس حصے میں اڑس دیے جہاں سے تیز ہوا اندر آرہی تھی۔ پھر اس نے اپنی کونلوں کی ٹوکری پہ اپنا دن کے کھانے کا سالن ابلنے کے لیے رکھ دیا اور اپنے دستی پتکھے کو جھلا کر کونلوں کو آج دینے لگی۔

اسی دوپہر اپنے معمول کے مطابق بوڑھی اماں نے اپنے بالوں کا جوڑا کھول کر پھر باندھا اور اپنی ساڑھی کے پلو کو کھول

کر اپنی عمر بھر کی بچت کو دوبارہ گنا۔ وہ اخبارات کو جوڑ کر بنائے گئے اپنے عارضی بستر سے ابھی بیس منٹ کا قیلولہ کر کے اٹھی تھی۔ بارش رک چکی تھی اور اب ساری گلی میں آم کے گیلے پتوں کی باس پھیلی ہوئی تھی۔ بعض دوپہروں کو وہ عمارت کے ساتھی رہائشیوں سے ملنے نکل پڑتی تھی۔ ایک گھر سے نکل کر دوسرے اور دوسرے سے نکل کر تیسرے میں جانا اسے اچھا لگتا تھا۔ فلیٹوں کے دروازے ہمیشہ کھلے ہوتے تھے اور رات کے سوا کبھی ان میں کنڈریاں نہیں چڑھائی جاتی تھیں۔ سب فلیٹ والوں کا یہ کہنا تھا کہ وہ کبھی بھی ان کے گھر آسکتی ہے کیونکہ بوڑھی اماں کی آمد ان کے معمولات زندگی کو متاثر نہیں کرتی تھی۔ وہ حسب معمول اپنے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے، ماہانہ اخراجات کا حساب کتاب کرنے یا شام کو پکنے والے چاولوں میں سے کنکر چننے میں مگن رہتے تھے۔ کبھی کبھی بوڑھی اماں کو چائے کا گلاس بھی پیش کیا جاتا اور وہ کیرم بورڈ کھیلتے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھیل میں ان کی مدد بھی کر دیا کرتی تھی۔ بوڑھی اماں جانتی تھی کہ اسے چارپائیوں یا کرسیوں پر نہیں بیٹھنا اس لیے وہ داخلی دروازوں میں نیچے ہی اکڑوں بیٹھ جاتی اور لوگوں کی حرکات و سکنات اور عادات و اطوار کا ایسے بغور مشاہدہ کرتی رہتی جیسے کوئی شخص کسی اجنبی شہر کی رونق کو بہ نظر غائر دیکھتا ہے۔

اس دوپہر کو، جس کا یہ قصہ ہے، بوڑھی اماں نے مسز دلال کے بلاوے پہ ان کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ اخبارات کے بنے بستر پہ قیلولہ کرنے کے باوجود اس کی پیٹھ ابھی بھی دکھ رہی تھی اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ مسز دلال سے گرمی دانوں کا پاؤڈر لے کر آزما ہی لے۔ اس نے اپنا جھاڑوا اٹھایا کیونکہ اس کے سوا وہ خود کو ادھورا محسوس کرتی تھی اور ابھی وہ زینوں پہ قدم رکھنے ہی والی تھی کہ مرکزی دروازے کے سامنے ایک رکشہ آن کھڑا ہوا۔ رکشے میں دلال صاحب سوار تھے۔ ساری زندگی لیٹرینوں کے سامان کی رسیدیں کاٹ کر ان کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے لیکن آج ان کی نگاہوں میں ایک عجب چمک تھی۔ وہ مونہ ہی مونہ میں کچھ گنگنا رہے تھے اور ان کے زانوؤں پہ دو چھوٹے سائز کے واش بیسن دھرے تھے۔

"بوڑھی اماں! تمہارے لیے ایک کام ہے۔ یہ بیسن اوپر لے جانے میں میری مدد کرو!" انہوں نے رومال سے اپنی پیشانی اور گلا پونچھا اور رکشہ ڈرائیور کو ایک سکھ تھما دیا۔ پھر بوڑھی اماں کے ساتھ مل کر انہوں نے یہ دونوں واش بیسن تیسری منزل تک پہنچائے۔ جب وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنی بیگم، بوڑھی اماں اور عمارت کے ان چند رہائشیوں کو جو مارے تجسس کے وہاں اکٹھے ہو چکے تھے اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ ان کی روزانہ گھنٹوں بیٹھ کر پلمبنگ کے سامان کی رسیدیں کاٹنے کے دھندے سے جان چھوٹ گئی ہے۔ ان کے مالک نے منافع دوگنا ہونے پر اپنے کاروبار کو پھیلانے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ اپنی دکان کی ایک دوسری شاخ بردوان کے علاقے میں کھولنے جا رہا ہے۔

اس نے مسٹر دلال کی سالوں کی محنت اور مستقل مزاجی کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں ترقی دے کر کالج اسٹریٹ والی دکان کا مینیجر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس ترقی کی خوشی میں مسٹر دلال گھر واپسی پہ دو واش بیسن خرید لائے تھے۔ "دوکروں کے فلیٹ میں ہم دو واش بیسنوں کا کریں گے کیا؟" مسز دلال نے تنگ کر سوال کیا۔ وہ لیموؤں کے سانچے پہ پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ "کیا آج تک پہلے کسی نے سنا ہے کہ دوکروں کے فلیٹ کے لیے دو واش بیسن لائے گئے ہوں؟ میں اب بھی مٹی کے تیل والے چولہے پہ ہنڈیا پکاتی ہوں، تم نے اب تک ٹیلی فون کنکشن کے لیے بھی درخواست نہیں دی اور اس فریج کا تو میں نے ابھی تک مونہ بھی نہیں دیکھا جو شادی کے موقع پر تم نے دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ تم سمجھتے ہو ان دو بیسنوں سے سب چیزوں کی کمی پوری ہو جائے گی؟"

اس اعتراض کے بعد دونوں فریقین کے درمیان بحثا بحثی کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ اتنا بلند تھا کہ اس کی آواز نیچے لیٹر بکسوں تک پہنچ رہی تھی اور یہ اس قدر طویل تھا کہ گھنٹوں بلکہ پہروں جاری رہا۔ جب شام پڑنے پر بارش کی ایک دوسری زوردار بوچھاڑ پڑی تب بھی یہ تکرار جاری و ساری تھی۔ بوڑھی اماں نے جب دوسری دفعہ زینوں کی اوپر سے نیچے کی طرف صفائی شروع کی یہ مباحثہ تب بھی جاری تھا اور بوڑھی اماں کی توجہ ایسے بھٹکارہا تھا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی کی مشکلات اور ماضی کی خوش کن یادوں کا تذکرہ کرنا بھی بھول گئی۔ اس نے رات اخبار جوڑ کر بنائے گئے بستر پر ہی کاٹی!

دوسری صبح جب پلہروں کی ایک ٹیم ان واش بیسنوں کو لگانے آئی تب بھی مسٹر اور مسز دلال کے درمیان لفظی جھڑپوں کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ شب بھر کی ماراماری کے بعد دلال صاحب نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک بیسن ان کی بیٹھک میں لگایا جائے گا اور دوسرا پہلی منزل پہ سیڑھیوں کے ساتھ نصب کیا جائے گا۔ "اس طرح سے ہر کوئی اسے استعمال کر سکے گا۔" انہوں نے ہر ہر دروازے پہ کھڑے ہو کر یہ نوید سنائی۔ سب رہائشی اس فیصلے سے بہت خوش ہوئے۔ سالوں سے وہ دانت برش کرتے وقت پیالے سے پانی انڈیل کر استعمال کرتے آئے تھے۔

دلال صاحب اسی اثناء میں یہ سوچ رہے تھے کہ سیڑھیوں پہ واش بیسن کی تنصیب یقناً باہر سے آنے والوں پہ اچھا تاثر چھوڑے گی۔ اب جب کہ وہ ایک کمپنی کے مینیجر بن چکے تھے کون جانتا تھا کب کون ان سے ملنے آجائے!

واش بیسنوں کی تنصیب کرنے والے مزدور کئی گھنٹوں تک اس کام میں جُتے رہے۔ وہ سیڑھیوں پہ کبھی اوپر جاتے کبھی نیچے آتے، کبھی ایک دوسرے پہ چبختے، کبھی گالم گلوچ کرتے، کبھی تھوکیں پھیلتے اور کبھی اپنے پٹکوں سے پیشانی کا پسینہ پونچھ رہے تھے۔ انہوں نے دن کا کھانا بھی سیڑھیوں کے جنگلے کے ساتھ ہی آلتی پالتی مار کر کھایا۔ الغرض اس روز انہوں نے بوڑھی اماں کے لیے زینوں کی معمول کی صفائی کونا ممکن بنا دیا۔

چنانچہ وقت کاٹنے کے لیے بوڑھی اماں نے چھت کا رخ کیا۔ وہ چھت کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی لیکن رات اخباروں سے بنے بستر پر لیٹنے کے سبب اس کے کولہے دکھ رہے تھے اس لیے اس سے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے آسمان پہ چاروں طرف نگاہ دوڑائی پھر بارش سے خستہ حال اپنی بچی کچھی دلائی کو پھاڑ کر اس کی کئی پٹیاں بنالیں۔ اس نے سوچا کہ ان دھجیوں کو بعد میں کبھی سیڑھیوں کے جنگلے پالش کرنے کے لیے استعمال کر لے گی۔

شام پڑتے ہی عمارت کے رہائشی نئے نصب شدہ واش بیسن کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ سب نے اس میں ہاتھ دھوئے اور یہاں تک کے بوڑھی اماں کو بھی دعوت دی گئی کہ وہ بھی اس کے شفاف پانی میں اپنے ہاتھ کھنگال کر اس نئی لذت سے شاد کام ہو لے۔ بوڑھی اماں نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ "ہمارے گھر میں تو نہانے کے پانی میں گلاب کی پتیاں اور عطر ملائے جاتے تھے۔ تم لوگ میرے یقین کرو نہ کرو، وہ ایسی آسائش تھی جس کا تم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔" دلال صاحب نے آگے بڑھ کر واش بیسن کی مختلف خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے دونوں طرف کی ٹونٹیوں کو ایک ایک کر کے پہلے بند کیا پھر کھول کر دکھایا۔ پھر انہوں نے دونوں کو ایک ساتھ کھول کر پانی کے بہاؤ میں تیزی کے فرق سے سب کو آگاہ کیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر دونوں ٹونٹیوں کے درمیان لگے چھوٹے سے لیور کو اوپر کھینچ لیا جائے تو بیسن میں حسبِ ضرورت پانی اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔

"کیا ہی دلکش اور سندر نمونہ ہے یہ!" دلال صاحب نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"یقیناً یہ بدلتے زمانے کی ایک نشانی ہے!" بالکونی میں بیٹھے چترجی نے معتبر انداز میں ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

بدلتے زمانے کی اس تبدیلی سے البتہ بیویوں کے اندر بے چینی اور غصے کے جذبات پنپنے لگے۔ جب وہ ہر صبح ایک دوسرے کے پیچھے قطار میں اپنی اپنی باری پہ دانت صاف کرنے کے لیے کھڑی ہوتیں تو انتظار کی یہ کوفت اور دانت صاف کرنے کے بعد ٹونٹیاں دھونے کی ذمہ داری اور واش بیسن کے ساتھ مستقلاً اپنا صابن اور ٹوتھ پیسٹ نہ رکھ سکنے کا احساس ان کے دلوں میں بے اطمینانی اور احساسِ محرومی کو جنم دیتا۔ مسز دلال کے پاس تو ان کا اپنا واش بیسن ہے اور ہم سب کو ایک ہی واش بیسن کیوں استعمال کرنا پڑ رہا ہے؟

"کیا یہ ہمارے بس سے باہر ہے کہ ہم اپنے اپنے واش بیسن ہی خرید سکیں؟" ایک بیوی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو بالآخر ایک صبح یہ لاوا پھٹ پڑا۔

"کیا یہ استطاعت صرف دلال صاحب کے پاس ہے کہ وہ اس عمارت کی حالت بہتر کر سکیں؟ کیا ہم کچھ نہیں کر سکتے؟" ایک دوسری نے لقمہ دیا۔

عمارت میں یہ افواہیں زور پکڑنے لگیں کہ جب مسٹر اور مسز دلال کے درمیان واش بیسنوں کو لے کر بحثا بحثی ہوئی تو

دلال صاحب اپنی بیگم کو رام کرنے کے لیے دو کلو سرسوں کا تیل، ایک کشمیری شال اور درجن بھر صندلی صابن خرید کر لائے تھے اور یہ کہ انہوں نے ٹیلی فون کنکشن کے لیے درخواست دائر کر دی تھی اور مسز دلال سارا دن کوئی کام نہیں کرتی تھیں بس واش بیسن میں اپنے ہاتھ دھوتی رہتی تھیں۔ بیویوں کے ابھی یہ زخم تازہ ہی تھے کہ دوسری صبح گلی میں آکر رکنے والی ٹیکسی نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔ یہ ٹیکسی ہاوڑا کے ریلوے اسٹیشن جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ مسٹر اور مسز دلال دس دنوں کے لیے شملہ^{۳۶} جا رہے تھے۔

"بوڑھی اماں! میں بھولی نہیں ہوں۔ ہم واپسی پہ آپ کے لیے پہاڑوں کا بنا ہوا ایک اونی کمبل لائیں گے۔" مسز دلال نے ٹیکسی کی کھلی ہوئی کھڑکی سے مونہ نکال کر کہا۔ اس کی گود میں ایک چرمی بٹواتھا جس کا رنگ اس کی ساڑھی کے فیروزی کناروں سے ملتا جلتا تھا۔

"ہم دو کمبل لے کر آئیں گے بوڑھی اماں!" بیگم کے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے دلال صاحب نے زور سے کہا۔ وہ اپنی جیبوں پہ ہاتھ مارتے ہوئے یہ یقین کر رہے تھے کہ ان کا بٹوا ان کے پاس ہی ہے۔

اس عمارت کے سارے رہائشیوں میں سے بوڑھی اماں ہی وہ واحد فرد تھی جس نے مسٹر اور مسز دلال کو مرکزی دروازے پہ کھڑے ہو کر الوداع کہا اور ان کے سفر بخیر کے لیے دعا دی اور اس وقت تک وہاں کھڑی رہی جب تک ٹیکسی گلی کا موڑ مڑ کر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

دلال فیملی کے جاتے ہی بیویوں نے عمارت کی تزئین و آرائش کے اپنے اپنے منصوبوں کا آغاز کر دیا۔ ایک نے اپنی شادی کے کڑوں کے عوض زینوں کی دیواروں پہ سفیدی پھرا کر انہیں تروتازہ کرنے کا فیصلہ کیا، دوسری نے اپنی سلائی مشین گروی رکھ کر کچھ پیسے حاصل کیے اور کیڑے مکوڑے مارنے والے کو بلا لیا اور تیسری نے چاندی کے برتن اور زیورات بنانے والے سنار کو اپنے کچھ کٹورے واپس بیچ دیے۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کھڑکیوں پہ پیلا رنگ کروائے گی۔

اب اس عمارت میں شب و روز کام کرنے والے مزدوروں اور کاریگروں کا آنا جانا لگ گیا۔ اس ہلچل سے بچنے کے لیے بوڑھی اماں نے سونے کے لیے چھت کو اپنا ٹھکانہ بنالیا۔ اس قدر اجنبی چہرے ہر وقت عمارت میں آتے جاتے اور گلی میں موجود رہتے تھے کہ اب ان کا حساب کتاب رکھنا ممکن نہ تھا۔

چند دنوں کے بعد بوڑھی اماں نے اپنی ٹوکریاں اور کھانا پکانے والی دیگچی بھی چھت پہ منتقل کر دی۔ سیڑھیوں پہ لگے بیسن میں ہاتھ دھونے کی اسے ویسے بھی کوئی خاص حاجت نہیں تھی کیونکہ چھت پہ لگی ٹینکی کی ٹونٹی سے وہ باآسانی پہلے کی طرح ہاتھ مونہ دھو سکتی تھی۔ ابھی بھی اس کا ارادہ تھا کہ یہ سب افراتفری ختم ہونے کے بعد وہ زینوں کے

جنگلے کو اپنے دلائی سے پھاڑی گئی بیٹیوں سے پالش کرے گی۔ اس کی راتیں اب اخبار جوڑ کر بنائے گئے بستر پر ہی کھتی تھیں۔

آسمان سے ہر روز مینہ برستا اور چھت پہ بوڑھی اماں ٹپکتے ہوئے عارضی سائبان کے نیچے اخبار سر پہ رکھے اکڑوں بیٹھی ان برساتی چونٹیوں کو دیکھتی رہتی جو کپڑوں والی تار پہ اپنے انڈے مونہ میں دبائے قطار میں چل رہی ہوتی تھیں۔ نم آلود ہواؤں نے اس کی پیٹھ کی جلن کو کچھ کم کر دیا تھا لیکن اس کے بستر کے لیے اخباروں کی تہہ پتلی پڑتی جا رہی تھی۔ اب بوڑھی اماں کی بے کیف صبحیں طویل اور شامیں طویل تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اسے یاد نہیں تھا کہ آخری دفعہ کب اس نے کسی فلیٹ سے چائے کا گلاس پیا تھا۔ اب وہ نہ اپنی موجودہ زندگی کی مشکلات کے بارے میں سوچتی تھی اور نہ اسے ماضی کی آسائشیں یاد آتی تھیں وہ بس دلال فیملی کے لوٹ آنے کی منتظر تھی۔ اسے اپنے نئے بستر کا انتظار تھا۔

چھت پہ بے کار پڑے رہ رہ کر بوڑھی اماں کی بے کلی بڑھنے لگی تو اس نے ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے کے خیال سے شام کو عمارت کے آس پڑوس میں چکر لگانا شروع کر دیا۔ ہاتھ میں اپنا جھاڑو سنبھالے، اخبارات کی سیاہی سے آلودہ خستہ حال ساڑھی پہنے وہ گلیوں اور بازاروں میں مٹر گشت کرتی اپنی عمر بھر کی بچت کو چھوٹی چھوٹی عیاشیوں پہ اڑانے لگی۔ کسی دن وہ مرمروں کا پیکٹ خرید لیتی، کبھی اسے کاجو بھا جاتے اور کسی روز وہ گنے کے رس کا لطف اٹھا لیتی۔ ایک دن یوں ہی چلتے چلتے وہ کالج اسٹریٹ میں کتابوں کی دکانوں کے پاس آنکلی۔ اس سے اگلے دن وہ اس سے بھی آگے باؤ بازار میں سبزی منڈی تک جا پہنچی۔ یہیں پر جب وہ ایک شاپنگ پلازے میں کھڑی کھل اور جاپانی پھلوں کا جائزہ لے رہی تھی تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ساڑھی کے پلو کو کسی نے زور سے کھینچا ہو۔ جب اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کے صندوقوں کی چابیاں اور عمر بھر کی بچت جو چند سکوں کی صورت پلو سے بندھی رہتی تھی غائب ہو چکے تھے۔

اس سہ پہر جب بوڑھی اماں واپس لوٹی تو عمارت کے سب ملیں مرکزی دروازے پہ اس کے منتظر تھے۔ زینوں پہ اوپر نیچے ایک ہی ہا ہاکار مچی تھی کہ کوئی واش بیسن چرا کر لے گیا ہے۔ تازہ سفیدی کی گئی دیوار پہ ایک بڑا سا سوراخ دکھائی دے رہا تھا اور ربڑ کی ٹیوبیں اور پائپ باہر لٹک رہے تھے۔ اکھڑے ہوئے پلستر کے ٹکڑے ارد گرد بکھرے پڑے تھے۔ بوڑھی اماں کی اپنے جھاڑو پہ گرفت اور مضبوط ہو گئی لیکن اس کے ہونٹ خاموش رہے۔

سب رہائشیوں نے جلدی جلدی بوڑھی اماں کو کھینچ تان کر زینوں سے تقریباً گھسیٹتے ہوئے چھت پر ایک کونے میں لا پٹھا اور سب دوسرے کونے میں جمع ہو کر اسے لعن طعن کرنے لگے۔

"یہ سب اس بڑھیا کا کیا دھرا ہے۔" غصے سے کھولتے ان رہائشیوں میں سے ایک بوڑھی اماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر بولا۔ "اس نے ہی چوروں کو خبر دی ہو گی۔ جب اس کا کام گیٹ پہ چوکیداری کرنا تھا تو یہ اُس وقت کہاں

گم تھی؟"

"کئی دنوں سے یہ گلیوں میں بے مقصد گھوم پھر رہی ہے۔ ضرور اس نے کسی اجنبی کو یہاں کے راز بتائے ہوں گے۔" ایک دوسرا مکیں گویا ہوا۔

"ہم نے اس بڑھیا کو کھانا پکانے کے لیے ایندھن دیا، سونے کے لیے جگہ مہیا کی۔ یہ ہمیں اس طرح کیسے دغا دے سکتی ہے!" ایک تیسرے نے اپنا حصہ ڈالا۔

اگرچہ ان میں سے کسی نے بھی براہ راست بوڑھی اماں کو مخاطب نہیں کیا تھا تاہم پھر بھی وہ بولی: "میں نے کسی چور کو کچھ نہیں بتایا۔ میرا یقین کرو، میرا یقین کرو!"

"ہم کئی سالوں سے تمہارے جھوٹ سنتے آئے ہیں" انہوں نے گرج کر کہا۔ "تمہیں لگتا ہے کہ ہم اب بھی تمہاری بات کا یقین کریں گے؟"

وہ کوئی وضاحت سننے کے موڈ میں نہ تھے۔ اپنے الزامات کی صداقت پہ انہیں کامل یقین تھا۔ انہیں اب یہ خوف بھی تھا کہ وہ دلال صاحب اور ان کی بیگم کو اس حادثے کی کیا توجیہ پیش کریں گے۔ بالآخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ چترجی سے اس معاملے پہ رائے لی جائے۔ چترجی حسبِ معمول اپنی بالکونی میں بیٹھے نیچے روڈ پہ ٹریفک جام کا نظارہ کر رہے تھے۔ دوسری منزل کے ایک رہائشی نے ان کے سامنے مسئلہ پیش کیا۔ "بوڑھی اماں نے اس عمارت کی سکیورٹی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ہمارے پاس قیمتی سامان ہے۔ بیوہ مسز مشرا اکیلی رہتی ہیں اور ان کے پاس ٹیلی فون بھی ہے۔ اب ہمیں اس صورتِ حال میں کیا کرنا چاہیے؟"

چترجی نے ان کے دلائل توجہ سے سنے۔ اس مسئلے پہ غور کرتے ہوئے انہوں نے اپنے کندھوں کے گرد لپٹی چادر کو ٹھیک کیا پھر اپنے گرد نگاہ ڈالی۔ ان کی بالکونی کے گرد نئی چقیں پڑی ہوئی تھیں اور ان کی کھڑکی کے پٹ جو ہمیشہ سے بے رنگ تھے اب پیلے رنگ میں رنگے ہوئے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ اک ذرا توقف کے بعد وہ بولے:

"بوڑھی اماں تو ہے ہی جنموں جلی لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نئی بات یہ ہے کہ ہماری بلڈنگ کا رنگ روپ بدل رہا ہے۔ اب ایسی عمارت کے لیے ہمیں ایک اصلی دربان کی ضرورت ہے جو اس کی اچھی طرح حفاظت کر سکے، ہمیں ایک نئے چاک چوبند چوکیدار کی ضرورت ہے!"

اس فیصلے کے بعد مکینوں نے بوڑھی اماں کا سامان، اس کی ٹوکریاں، دیکچی، دلائی کے چیتھرے اور جھاڑو چھت سے اٹھا کر زینے پہ، پھر زینے سے اٹھا کے نیچے لیٹر بکسوں والی جگہ پہ اور پھر وہاں سے مرکزی دروازے سے باہر گلی میں پھینک دیے۔ اس کے بعد انہوں نے بوڑھی اماں کو بھی اپنی عمارت سے باہر نکل دیا۔ سب بے چین تھے کہ نئے دربان

کے لیے جلد از جلد تلاش شروع کی جائے۔

گلی میں پھینکے گئے سامان میں سے بوڑھی اماں نے محض اپنا جھاڑوا اٹھا لیا اور آہستہ آہستہ چل پڑی۔ اس نے اپنی ساڑھی کا پلو جھٹکا لیکن چابیوں کی کوئی جھنکار سنائی نہ دی۔ عمارت سے دور ہوتے ہوئے وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔ "میرا یقین کرو، میرا یقین کرو!"

سیکسی

کسی بھی شادی شدہ عورت کی زندگی میں یہ واردات کسی ڈراؤنے خواب سے کم نہیں۔ لکشمی نے میرانڈا کو بتایا کہ اس کی کزن کا شوہر نو سالہ شادی کے بعد اب ایک اور عورت کے عشق میں مبتلا ہو چکا ہے۔ دہلی سے مونٹریال کی فلائٹ میں اس کی نشست اس عورت کے ساتھ تھی۔ اپنی بیوی اور بچے کے پاس لوٹنے کی بجائے وہ ہیتھرو ایئر پورٹ پر ہی اس عورت کے ساتھ اتر گیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو فون کر کے یہ کہہ دیا تھا کہ ایک گفتگو نے اس کی زندگی کا رخ موڑ دیا ہے اور یہ کہ اسے اپنی الجھی حیات کی تاروں کو سلجھانے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ لکشمی کی کزن یہ سن کر بستر سے لگ کر رہ گئی تھی۔

"میں اپنی کزن کو اس سانحے کے لیے ذمہ دار نہیں گردانتی" لکشمی نے نمکو کے پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ سارا دن مونہ چلاتی رہی تھی۔ "ذرا سوچو، ایک انگریز لڑکی، وہ بھی اس سے آدھی عمر کی! کون مرد اس کی زلف کا اسیر نہیں ہونا چاہے گا۔"

لکشمی عمر میں میرانڈا سے چند سال ہی بڑی تھی لیکن اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی اور اپنے شوہر کی تاج محل کے سامنے سنگ مرمر کے سفید بیٹج پر بیٹھ کر کچھوائی گئی تصویر اپنے کیو بیکل^{۳۴} کے اندر لگا رکھی تھی۔ میرانڈا کا کیو بیکل اس سے جڑا ہوا تھا۔ لکشمی پچھلے ایک گھنٹے سے فون پر اپنی کزن سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہاں موجود لوگوں میں سے کسی کا بھی دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔ وہ دونوں ایک پبلک ریڈیو کے فنڈ اکٹھے کرنے والے شعبے میں کام کرتی تھیں اس لیے یہاں طویل دورانیے کی فون کالیں معمول کی بات تھی۔

"مجھے زیادہ دکھ اس کے بیٹے کا ہو رہا ہے" لکشمی نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا، "وہ کئی دنوں سے گھر پر ہے۔ میری کزن بتا رہی تھی کہ وہ اسے اسکول بھی نہیں لے جاسکتی۔"

"یہ سننے میں ہی کتنا برا لگتا ہے نا!" میرانڈا نے افسوس کیا۔

لکشمی کی فون پر گفتگو، جو وہ زیادہ تر اپنے شوہر سے کھانے کے متعلق کیا کرتی تھی، ہمیشہ میرانڈا کے کام میں خلل انداز ہوتی تھی۔ جب وہ ریڈیو اسٹیشن کے ممبرز سے ریڈیو کے لوگو والے بیگ اور چھتریوں کے تحفوں کے عوض سالانہ امداد کی رقم میں اضافے کے لیے کہہ رہی ہوتی اور اس کی انگلیاں حرف ٹائپ کر رہی ہوتیں تو اسے ساتھ والے ڈیسک سے، دیوار کی اس طرف، لکشمی کی گفتگو کے جملے صاف سنائی دے رہے ہوتے تھے جن میں وہ کبھی کبھار

ہندی کے الفاظ بھی بول جاتی۔ لیکن اس شام میر انڈا کا دھیان لکشمی کی گفتگو کی طرف نہیں تھا کیونکہ وہ خود فون پر دیو سے محو گفتگو تھی۔ وہ دونوں شام کو ملنے کی جگہ کا تعین کرنے میں مصروف تھے۔

"لیکن یہ بھی ہے کہ گھر میں چند دن رہنے سے اسے زیادہ نقصان نہیں ہوگا" لکشمی نے کچھ مزید نمکو کھائی اور باقی ماندہ دراز میں رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بچہ سمجھو کہ ایک طرح کا فطین ہے۔ اس کی ماں پنجابی اور باپ بنگالی ہے۔ اسکول میں وہ فرانسیسی اور انگریزی زبانیں سیکھتا ہے۔ یوں وہ ابھی سے چار زبانیں بولنے لگا ہے۔ میرے خیال میں اس نے دو کلاسیں ایک ہی سال میں پڑھی ہیں۔"

میر انڈا کا دوست دیو بھی بنگالی تھا۔ شروع میں میر انڈا کا خیال تھا کہ یہ کوئی مذہب ہے۔ لیکن دیو نے اسے اکانومسٹ^{۳۸} کے ایک شمارے میں چھپے نقشے پہ انگلی رکھ کر سمجھایا تھا کہ بنگال ایک جگہ کا نام ہے جو انڈیا میں واقع ہے۔ وہ یہ شمارہ خاص طور پر اٹھا کر میر انڈا کے اپارٹمنٹ میں لایا تھا کیونکہ میر انڈا کے پاس نہ تو دنیا کا نقشہ تھا اور نہ ہی اس کے گھر میں کوئی ایسی کتاب تھی جس پہ کوئی نقشہ بنا ہوا ہو۔ دیو نے نقشے پر اشارے سے اس شہر کی نشاندہی کی تھی جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور پھر ساتھ والے شہر کا بتایا تھا جہاں اس کے باپ نے جنم لیا تھا۔ ان میں سے ایک شہر کے گرد پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کے لیے ایک دائرہ بنایا گیا تھا۔ جب میر انڈا نے اس دائرے کے بارے میں استفسار کیا تو دیو نے میگزین بند کرتے ہوئے کہا تھا، "ایسا کچھ بھی نہیں ہے جس کے بارے میں تم فکر مند ہو۔" پھر اس نے پیار سے میر انڈا کے سر کو یوں تھپتھپا دیا تھا جیسے وہ کوئی چھوٹی سی بچی ہو۔

اپارٹمنٹ سے جاتے ہوئے دیو نے یہ میگزین اور سگریٹ کے باقی ماندہ ٹکڑے اٹھا کر کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دیے تھے۔ وہ جب بھی میر انڈا سے ملنے اس کے ہاں آتا تین چار سگریٹ پھونک جاتا تھا۔ میر انڈا کھڑکی سے دیو کی کار کو کامن ویلتھ ایونیو سے مضافات کی طرف، جہاں اس کا گھر تھا اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا، جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کوڑے کی ٹوکری سے وہ میگزین اٹھایا، اس کے بیرونی سرورق پہ چمٹی سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر صاف کی اور اسے ہموار کرنے کے لیے مخالف سمت میں گول کیا۔ میگزین کے صفحوں کی طرح اس کا جسم بھی دیو کے پیار سے دہرا ہوا پڑا تھا۔ وہ بستر پر دراز ہو کر بنگال کے نقشے پر غور کرنے لگی۔ نقشے پر بنگال کے ایک طرف ایک خلیج دکھائی گئی تھی اور دوسری طرف پہاڑی سلسلہ بنایا گیا تھا۔ یہ نقشہ ایک مضمون کا حصہ تھا جس میں کسی گرامین بینک کا ذکر تھا۔ اس نے صفحہ پلٹا یہ سوچتے ہوئے کہ شاید آگے اس شہر کی تصویر ہو جہاں دیو پیدا ہوا تھا لیکن وہاں محض گراف اور لکیروں کا ایک جال تھا جسے وہ سمجھ نہیں پائی۔ وہ دیر تک اس صفحے پر نگاہیں جمائے دیو کے بارے میں سوچتی رہی۔ محض پندرہ منٹ قبل ہی کیسے دیو اس سے ہمبستری کرتے ہوئے اس کی ٹانگوں کو اپنے کندھوں پر سہارتے اور

اس کے گھٹنوں کو اسی کے چھاتی پہ دباتے ہوئے کہ رہا تھا کہ اس کے پیار کی کوئی حد نہیں۔

میرانڈا ایک ہفتہ قبل ہی دیو سے فیلیپینی ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں ملی تھی۔ وہ کھانے کے وقفے میں رعایتی قیمت پر لگے چست پاجامے خریدنے سٹور کے بیسمنٹ میں موجود تھی۔ وہاں سے وہ خود کارزینوں کے ذریعے سٹور کے مرکزی حصے میں، جہاں کا سیمیٹکس کا سامان رکھا تھا، پہنچی۔ یہاں صابن اور کریمیں یوں سجا کے رکھی گئی تھیں جیسے کوئی قیمتی ہیرے جواہرات ہوں اور پاؤڈر اور آئی شیڈیوں جھلملا رہے تھے جیسے کسی نے رنگ برنگی تتلیاں شیشے کے شوکیسوں میں جڑ دی ہوں۔ اگرچہ یہاں سے میرانڈا نے لپ اسٹک کے سوا کبھی کچھ نہیں خریدا تھا لیکن اسے پھر بھی ان تنگ راہداریوں اور چھوٹی چھوٹی بھول بھلیوں میں مٹر گشت کرنا اچھا لگتا تھا۔ وہ ابھی تک بوسٹن کی گلیوں سے اتنی واقف نہیں تھی جتنی ان جگہوں سے آشنا تھی۔ اسے اسٹور میں ہر موڑ پر کھڑی، چھوٹے چھوٹے کارڈوں پر پرفیوم کا چھڑکاؤ کر کے انہیں آہستہ آہستہ ہوا میں لہرانے والی، لڑکیوں سے بھاؤ تاؤ کرنا اچھا لگتا تھا۔ بعض دفعہ اسے کئی دنوں بعد کوئی کارڈ اس کے کوٹ کی جیب میں تہہ کیا ہوا ملتا اور اس سے اٹھنے والی مہک اگرچہ مدھم پڑچکی ہوتی لیکن پھر بھی اس کے مشام جاں کو بخیر بستہ صبحوں میں، جب وہ ٹرام کی آمد کا انتظار کر رہی ہوتی، حدت کا احساس دلا جاتی۔

اس روز ایسے ہی چلتے چلتے ایک معطر کارڈ کی خوشبو سونگھنے کے لیے وہ پل بھر کے لیے ٹھہری تو اس کی نگاہ نزدیک کاؤنٹر کے سامنے کھڑے ایک شخص پہ پڑی۔ اس شخص کے ہاتھ میں، جو نسوانی نزاکت لیے ہوئے تھا، کاغذ کی ایک پرچی تھی۔ کاؤنٹر پہ کھڑی عورت نے ایک نگاہ پرچی پر ڈالی اور پھر مختلف درازیں کھول کھول کر مطلوبہ سامان نکالنے لگی۔ اس نے سیاہ ڈبیاں صابن کی ایک مستطیل ٹکلیا، جلد کو خشکی سے بچانے والا ایک ہائیڈریٹنگ ماسک، ایک شیشی میں جلد کے خلیوں کو تروتازہ رکھنے والے محلول کے قطرے اور چہرے پر لگانے والی کریم کی دو ڈبیاں نکالیں۔ اس شخص کا رنگ گندمی تھا اور اس کے بال سیاہ تھے جو اس کی انگلیوں کے پوروں پر نمایاں تھے۔ اس نے سرخی مائل گلابی شرٹ اور گہرے نیلے رنگ کے سوٹ پہ بھورے رنگ کا اوور کوٹ پہن رکھا تھا جس کے چمڑے سے بنے بٹن چمک رہے تھے۔ قیمت ادا کرنے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ دستانے سے نکال لیا تھا۔ اس نے اپنے قرمزی بٹوے میں سے تازہ کڑکتے ہوئے نوٹ برآمد کیے۔ اس کے ہاتھ میں شادی کی انگوٹھی نہیں تھی۔

"میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟" کاؤنٹر پہ کھڑی عورت نے میرانڈا سے پوچھا۔ وہ اپنی دھاری دار فریم والی عینک کے اوپر سے میرانڈا کی جلد کے رنگ کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میرانڈا خود نہیں جانتی تھی کہ اسے کیا چاہیے۔ اس وقت اس کی خواہش بس یہ تھی کہ وہ آدمی یہاں سے کہیں نہ جائے۔ وہ بھی سیلز وومن کی طرح اس کے جواب کا منتظر دکھائی دے رہا تھا۔ میرانڈا بیضوی ٹرے میں سبزی ان چھوٹی

بڑی بوتلوں کو غور سے دیکھنے لگی جو ایسی لگ رہی تھیں جیسے کوئی خاندان بال بچوں سمیت گروپ فوٹو بنوانے کھڑا ہو۔
 "کریم دکھادیں۔" میرا نڈانے بالآخر کہہ ہی دیا۔

"عمر کیا ہے آپ کی؟"

"بائیس سال۔"

عورت نے یہ سن کر سر ہلاتے ہوئے ایک دودھیا بوتل کھول لی، "آپ اس سے پہلے جو کریم استعمال کرتی رہی ہو یہ ذرا اس سے زیادہ سخت محسوس ہوگی لیکن میں اسے ابھی سے استعمال کرنا بہتر سمجھتی ہوں۔ پچیس سال کی عمر تک آپ کے چہرے پہ جھریاں بن چکی ہوں گی اور پچیس کے بعد یہ دکھائی دینا بھی شروع ہو جائیں گی۔"

جب سیلز وومن اس کے چہرے پہ کریم کی تہہ لگا کر اسے نرمی سے تھپتھپا رہی تھی تو وہ شخص وہیں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ جب میرا نڈا کریم لگانے کا درست طریقہ سیکھ رہی تھی کہ کیسے اسے گردن سے شروع کر کے اوپر چہرے کی طرف نہایت چابک دستی سے لگانا ہے تو وہ شخص لپ اسٹکس کے چھوٹے سے ہنڈولے کو گول گھما رہا تھا۔ اس نے ایک بوتل کو دبا کر اس سے جلد کی جھریاں ختم کرنے والی کریم نکال کر اپنے ہاتھ کی پشت پر مساج کیا اور پھر ایک دوسری بوتل کا ڈھکن کھول کر اس کی خوشبو سونگھنے کے لیے اتنا آگے تک جھک گیا کہ کریم کا ایک ذرہ اس کی ناک پر نشان چھوڑ گیا۔ میرا نڈا یہ دیکھ کر مسکرائی لیکن اس کی مسکراہٹ اس بڑے سے برش کے پیچھے چھپی رہ گئی جو وہ خاتون اس کے چہرے پر پھیر رہی تھی۔ "یہ دوسرے نمبر کا برش ہے۔" خاتون بولی "اس سے تمہارے چہرے کا رنگ نکھر جائے گا۔" میرا نڈا نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور اپنے عکس کو کاؤنٹر کے سامنے لگے قطار اندر قطار آئینوں میں دیکھنے لگی۔ میرا نڈا کی سرمئی آنکھوں اور پیلی جلد کے مقابلے میں اس کے سیاہ، چمکدار بال اگر اسے خوبصورت نہیں بناتے تھے تو دیکھنے والوں کی نظر میں اسے نمایاں ضرور کر دیتے تھے۔ اس کا چھوٹا سا بیضوی سر عین درمیان سے نمایاں طور پر اٹھا ہوا تھا۔ سر کی طرح اس کے چہرے کے نقوش بھی پتلے پتلے تھے۔ اس کے نتھنے یوں سکڑے ہوئے تھے جیسے کسی نے چٹکی سے پکڑ رکھے ہوں۔ اب کریم کی ہلکی سی تہہ لگنے کے بعد اس کا چہرہ دکنے لگا تھا، اس کے گال گلابی اور آنکھوں کے پوٹے سیاہی مائل ہو چکے تھے۔ اس کے ہونٹ بے طرح دمک رہے تھے۔

وہ شخص بھی آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنی ناک پہ لگی کریم پونچھ کر صاف کی۔ میرا نڈا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس آدمی کا تعلق کہاں سے ہو سکتا ہے۔ اس کے خیال میں وہ ہسپانوی یا لبنانی ہو سکتا تھا۔ جب اس شخص نے ایک اور بوتل کھولتے ہوئے یہ کہا، "اس کی خوشبو بالکل انناس کی طرح ہے" تب میرا نڈا کو اس کے لہجے سے کچھ اندازہ ہوا کہ وہ کہاں کا ہے۔

"آپ مزید کچھ خریداری کرنا پسند کریں گی؟" سیلز وومن نے میرا انڈا سے اس کا کریڈٹ کارڈ لیتے ہوئے سوال کیا۔
"نہیں! بہت شکریہ!"

"آپ ہماری اس پراڈکٹ کے استعمال سے بہت خوش ہوں گی۔" خاتون نے میرا انڈا کی مطلوبہ کریم ایک سرخ کاغذ کی تہہ میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

میرا انڈا جب کریڈٹ کارڈ کی رسید پر دستخط کر رہی تھی تو اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔ وہ شخص ابھی تک وہیں تھا۔ اپنی جگہ سے وہ ایک انچ بھی نہیں ہلا تھا۔

"ہماری ایک نئی کریم کا نمونہ بھی میں نے ساتھ رکھ دیا ہے۔" سیلز وومن نے ایک چھوٹا سا شاپنگ بیگ میرا انڈا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے میرا انڈا کا کریڈٹ کارڈ واپس اس کی طرف سرکاتے ہوئے اس کے نام پر نظر ڈالی۔
"خدا حافظ میرا انڈا!"

میرا انڈا تیز تیز قدموں سے باہر کی طرف چل پڑی لیکن پھر یہ اندازہ کر کے کہ بیرونی دروازہ قریب ہی ہے وہ قدرے آہستہ ہو گئی۔

"تمہارے نام کا ایک حصہ ہندوستانی ہے۔" اس شخص نے پیچھے سے آکر اس کے قدموں سے قدم ملاتے ہوئے کہا۔ وہ رک گئی۔ اس کے ساتھ وہ بھی ٹھہر گیا۔ وہ ایک گول میز کے پاس کھڑے تھے جس پر سویٹروں کا ڈھیر لگا تھا اور ایک طرف مخملی ٹائیاں بے ترتیب پڑی تھیں۔
"میرا انڈا؟"

"میرا۔ میری ایک خالہ کا نام میرا ہے۔"

اس شخص کا نام دیو تھا۔ اس نے میرا انڈا کو سر کے اشارے سے بتایا کہ وہ کچھ ہی فاصلے پر جنوبی سمت واقع ایک انویسٹمنٹ بینک میں کام کرتا تھا۔ دیو وہ پہلا شخص تھا جو مونچھوں کے باوجود میرا انڈا کو خوبصورت لگا۔

وہ دونوں اکٹھے پارک سٹریٹ اسٹیشن کی طرف چل پڑے۔ فٹ پاتھ کے اطراف میں سستے بیلٹ اور پرس بیچنے والوں کے اسٹال جا بجا دکھائی دے رہے تھے۔ جنوری کی تند و تیز ہوا کے ایک جھونکے نے میرا انڈا کے بال بکھیر دیے۔ اپنے کوٹ کی جیب میں ٹوکن ٹولتے ہوئے اس کی نگاہ دیو کے شاپنگ بیگز پر پڑی۔ "کیا یہ ان کے لیے ہیں؟"
"کن کے لیے؟"

"آپ کی خالہ میرا کے لیے؟"

"نہیں، یہ میری بیوی کے لیے ہیں۔" دیو نے میرا انڈا کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ "وہ کچھ

ہفتوں کے لیے انڈیا جا رہی ہے، ڈھیر سارا سامان ساتھ رکھنے کی اسے عادت ہے۔"

دیو کی بیوی کی عدم موجودگی میں ان دونوں کا آپس میں ملنا شروع شروع میں اتنا نامناسب نہیں لگتا تھا۔ ابتدا میں وہ اور دیو تقریباً ہر رات اکٹھی گزارتے۔ دیو نے اسے بتایا تھا کہ وہ ساری رات اس کے ساتھ نہیں ٹھہر سکتا کیونکہ اس کی بیوی ہر صبح چھ بجے اسے انڈیا سے فون کرتی ہے جہاں اس وقت سہ پہر کے چار بجے ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ میرانڈا کے اپارٹمنٹ سے رات کے دو یا تین بجے یا بہت دیر بھی ہو جاتی تو چار بجے تک نکل کے شہر کے مضافات میں واقع اپنے گھر چلا جاتا۔ دن کے وقت وہ میرانڈا کو تقریباً ہر ایک گھنٹے بعد اپنے دفتر سے یا موبائل فون سے کال کرتا۔ جب اسے میرانڈا کے شیڈول سے واقفیت ہو گئی تو وہ ہر شام ساڑھے پانچ بجے، جب وہ ٹرام پہ سوار اپنے اپارٹمنٹ واپس آرہی ہوتی، ایک پیغام چھوڑ دیتا تھا کہ میرانڈا جیسے ہی اپارٹمنٹ میں داخل ہو وہ اس کی آواز سنے۔

"میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا ہوں جان، یہ دل تم سے ملنے کے لیے بے حد بے چین ہے!" اس کا پیغام ٹیلی فون کی ریکارڈنگ مشین میں موجود ہوتا۔

دیو نے میرانڈا کو بتایا تھا کہ اسے میرانڈا کے اپارٹمنٹ میں اس کے ساتھ وقت بتانا اچھا لگتا ہے۔ اس اپارٹمنٹ کے باورچی خانے کا کاؤنٹر اتنا چھوٹا تھا جیسے روٹیاں رکھنے کا کوئی بکس ہو، اس کا گھسا ہوا فرش ایک طرف سے بیٹھا ہوا تھا اور اس کی برآمدے میں لگی گھنٹی کو دیو جب بھی بجاتا اس میں سے عجب بھدی سی آواز نکلتی تھی۔ دیو نے میرانڈا کو یہ بھی بتایا تھا کہ اسے اس کا مشی گن^{۲۲} سے، جہاں وہ پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی، بو سٹن اٹھ آنے کا فیصلہ، جہاں اس کا کوئی جاننے والا نہ تھا، اچھا لگا تھا۔ اس پر میرانڈا نے کہا تھا کہ یہ کوئی ایسا انوکھا فیصلہ نہ تھا۔ اس نے اسی لیے بو سٹن کا انتخاب کیا تھا کہ یہاں اس کا کوئی واقف کار نہ تھا۔ دیو نے یہ سن کر سر ہلاتے اور اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا تھا، "میں جانتا ہوں کہ اکیلا ہونے کا کرب کیسا ہوتا ہے!" اس لمحے میرانڈا کو لگا تھا جیسے دیو اس کی کیفیت کو سمجھ سکتا ہے۔۔۔ وہ سمجھ سکتا ہے کہ اکیلے فلم دیکھنے کے بعد ٹرام پہ راتوں کو سفر کرتے ہوئے یا کسی کتابوں کی دکان میں تنہا میگزین کھنگالتے ہوئے یا لکشمی کے ساتھ پینے کے لیے جاتے ہوئے میرانڈا کی کیا کیفیت ہوتی ہے! لکشمی کو ایسی ہر ملاقات میں ایک یا دو گھنٹوں میں ایلیو آف^{۲۳} سٹیشن پہ اپنے شوہر سے ملنا ہوتا تھا اس لیے وہ ہمیشہ جلدی میں ہوتی۔

جب کبھی دیو پہ سنجیدگی کا غلبہ کچھ کم ہوتا تو وہ اسے بتاتا کہ اسے میرانڈا کی ٹانگوں کا اس کی اوپری دھڑکی نسبت زیادہ لمبا ہونا اچھا لگتا تھا۔ یہ چیز اس نے تب محسوس کی تھی جب میرانڈا پہلی دفعہ کمرے میں بے لباس ہو کر اس کے سامنے سے گزری تھی۔ "تم پہلی عورت ہو"، دیو نے بستر پہ دراز ہو کر کہا تھا، "میری زندگی میں آنے والی تم وہ پہلی عورت ہو جس کی ٹانگیں اتنی لمبی ہیں۔" میرانڈا کی زندگی میں آنے والے مردوں میں سے بھی دیو وہ پہلا مرد تھا جسے اس کی

ٹانگوں کی طوالت سے دلچسپی تھی۔ ہائی اسکول اور کالج میں اس کے جن لڑکوں سے تعلقات رہے تھے دیوان سب سے مختلف تھا۔ میرانڈا کی زندگی میں وہ پہلا مرد تھا جو ہر جگہ آگے بڑھ کر اس کے لیے پیسوں کی ادائیگی کرتا، وہ کہیں جاتے تو بڑھ کر اس کے لیے دروازہ کھول کر کھڑا رہتا اور ریسٹورنٹ میں جب وہ کھانا کھانے لگتے تو سب سے پہلے جھک کر اس کے ہاتھ پہ بوسہ دیتا۔ دیو وہ پہلا شخص تھا جو اس کے لیے پھولوں کا اتنا بڑا گلہ دستہ لایا تھا کہ میرانڈا کو انہیں چھ گلاسوں میں تقسیم کر کے لگانا پڑا تھا۔ میرانڈا کی رومانوی زندگی میں دیو ہی وہ واحد مرد تھا کہ جب وہ پیار کر رہے ہوتے تو وہ سرگوشیوں میں بار بار اس کا نام جپتا رہتا تھا۔

دیو سے ملنے کے کچھ ہی دنوں بعد میرانڈا کے دل و دماغ میں یہ خواہش جنم لے چکی تھی کہ کاش وہ بھی اپنے کیوبیکل میں اپنی اور دیو کی تصویر اسی طرح لگا سکتی جس طرح لکشمی نے اپنی اور اپنے شوہر کی تاج محل کے پس منظر میں کچھوائی گئی تصویر اپنے کیوبیکل میں لگا رکھی تھی۔ میرانڈا نے لکشمی کو دیو کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس نے کسی پہ بھی اپنا یہ راز افشا نہیں کیا تھا۔ کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ لکشمی کو دیو کے بارے میں بتا دے کیوں کہ وہ بھی دیو کی طرح ہندوستانی تھی۔ لیکن لکشمی ان دنوں ہمیشہ فون پر اپنی کزن سے باتوں میں مگن رہتی تھی۔ اس کی کزن ابھی تک بستر پہ بیمار پڑی تھی، اس کا شوہر ابھی تک لندن میں تھا اور اس کا بیٹا ابھی تک سکول نہیں گیا تھا۔

"تم کھانا پینا کیوں چھوڑے بیٹھی ہو، کچھ نہ کچھ تو کھا لو" لکشمی اپنی کزن کو سمجھاتے ہوئے کہتی، "تمہیں اپنی صحت کا خیال رکھنا ہے، تمہیں صحت مند رہنا ہے۔"

جب وہ اپنی کزن سے بات نہیں کر رہی ہوتی تو اپنے شوہر سے محو گفتگو ہوتی تھی۔ کزن کی نسبت اس کا دورانیہ کم ہوتا۔ شوہر سے اس کی گفتگو کا اختتام ہمیشہ اس بحث پہ ہوتا تھا کہ انہیں شام کے کھانے میں مرغ یا دنبے میں سے کس گوشت کا انتخاب کرنا ہے۔ کبھی کبھی میرانڈا اسے اپنے شوہر سے معذرت کرتے ہوئے بھی سنتی: "معاف کرنا، اس معاملے نے آج کل میرا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا ہے۔"

میرانڈا اور دیو آپس میں کبھی کسی بحث میں نہ الجھتے تھے۔ وہ فلم دیکھنے نکلواؤں سینما جاتے اور سارا وقت ایک دوسرے کو چومنے میں گزار دیتے۔ ڈیوس سکوائر کے ریسٹورنٹ میں جب وہ مکئی کی روٹی کے ساتھ بھنے ہوئے سور کا ریشہ دار گوشت کھا رہے ہوتے تو دیو کے گلے میں کاغذی نیپکن یوں لگتا جیسے گلوبند لپٹا ہو۔ وہ ہسپانوی ریسٹورنٹ کے میخانے میں جب سرخ ہسپانوی شراب کی چسکیاں لے رہے ہوتے تو میز کے ایک سرے پر رکھا سالم سور کا سر ایسے لگتا جیسے ان کی سرگوشیاں سن کر مسکرا رہا ہو۔ ایک دفعہ وہ فنون لطیفہ کے میوزیم میں بھی گئے جہاں دیو نے میرانڈا کی خواب گاہ کے لیے کنول کے پھولوں کی ایک پرنٹڈ تصویر خریدی تھی۔ ایک اور مرتبہ ہفتے کی سہ پہر سمفونی ہال میں محفل

موسیقی میں شرکت کر کے جب وہ لوٹے تو دیو میر انڈا کو اپنی پسندیدہ جگہ دکھانے کر سچھین سائنس سنٹر کے میپورٹم^{۴۴} لے گیا۔ یہاں ایک وسیع و عریض، بلند و بالا کمرے کو روشن اور رنگ دار شیشوں کے بڑے بڑے ٹکڑوں کی مدد سے دنیا کے نقشے کی مانند گول بنایا گیا تھا۔ جب وہ اس کمرے کے درمیان میں بنائے گئے شیشے کے شفاف پل پہ کھڑے ہوئے تو انہیں یوں لگا جیسے وہ دنیا کے عین وسط میں کھڑے ہیں۔ دیو نے میر انڈا کو اشارے سے انڈیا کی نشاندہی کی جسے سرخ رنگ کیا گیا تھا۔ اکانومسٹ کے شمارے کی نسبت یہ نقشہ زیادہ تفصیلی تھا۔ اس نے میر انڈا کو بتایا کہ اس میں دیے گئے بہت سے ملکوں کے نام اور جغرافیے اب بدل چکے ہیں جیسے سیام اور اطالوی صومالی لینڈ کو اب ان ناموں سے نہیں پکارا جاتا۔ یہاں سمندر کو کسی مور کی چھاتی کے سے نیلے رنگ کے دوشیڈز میں دکھایا گیا تھا۔ جہاں پانی کی زیادہ گہرائی دکھانا مقصود تھی اس کو گہرے نیلے رنگ سے ظاہر کیا گیا تھا اور کم گہرائی کے لیے ہلکا نیلا رنگ استعمال کیا گیا تھا۔ دیو نے میر انڈا کو میریانا^{۴۵} کے جزائر کے پاس سطح سے سات میل کی گہرائی میں واقع سمندر کا وہ مقام دکھایا جسے دنیا کا گہرا ترین مقام کہا جاتا ہے۔ انہوں نے پل سے نیچے جھانک کر اپنے قدموں تلے قطب جنوبی کے جزیرہ نما دیکھے اور گردن گھما گھما کر سروں کے اوپر ٹنگا بڑا سادہاتی ستارا دیکھا۔ جب دیو میر انڈا کو نقشے کی جزئیات سمجھا رہا تھا تو اس کی آواز شیشے کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ کبھی مدھم، کبھی تیز، کبھی یہ میر انڈا کے کانوں کو چھوئے بغیر گزر جاتی اور کبھی یوں لگتا جیسے اس کے سینے میں کبھی جا رہی ہو۔ جب سیاحوں کی ایک ٹولی اس پل سے گزر رہی تھی تو میر انڈا ان کے کھنکارنے اور سانس لینے کی آوازیں یوں سن پار رہی تھی جیسے وہ مائیکروفون مونہ سے لگائے ہوئے ہوں۔ دیو نے اسے بتایا کہ یہ سب شیشے کے اس کمرے کی ساخت کی وجہ سے تھا۔

میر انڈا نے تھوڑی سی تلاش کے بعد نقشے میں لندن کو ڈھونڈ نکالا جہاں لکشمی کی کزن کا شوہر اس عورت کے ساتھ مقیم تھا جسے وہ جہاز میں دوران پرواز ملا تھا۔ میر انڈا سوچ رہی تھی کہ دیو کی بیوی بھلا انڈیا کے کس شہر میں ہوگی۔ زندگی میں میر انڈا نے صرف ایک دفعہ ہی امریکا سے باہر قدم نکالا تھا جب بچپن میں وہ بہاماس^{۴۶} گئی تھی۔ اس نے ڈھونڈنے کی بہتری کوشش کی لیکن یہ ملک اسے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ جب سیاحوں کی ٹولی وہاں سے چلی گئی اور وہ اور دیو کمرے میں اکیلے رہ گئے تو دیو نے اسے پل کے ایک سرے پر کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ دیو نے اسے بتایا کہ اگرچہ وہ دونوں پل کے مخالف سروں پر ایک دوسرے سے تیس فٹ کے فاصلے پر ہوں گے لیکن اس دوری کے باوجود وہ ایک دوسرے کی سرگوشیاں بھی سن پائیں گے۔

"مجھے تمہاری بات پہ یقین نہیں آرہا"، اس میپورٹم میں داخل ہونے کے بعد پہلی دفعہ میر انڈا نے مونہ کھولا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے کانوں میں کسی نے اسپیکر لگا دیے ہیں۔

"تم آزما کے تو دیکھو"، دیو نے اسرار کرتے ہوئے کہا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پل کے اپنی سمت والے سرے تک جا پہنچا۔ اس نے اپنی آواز سرگوشی میں بدل دی، "کچھ بولو۔"

میرانڈا نے اس کے ہونٹوں کو حرکت کرتے اور الفاظ ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ اسی لمحے اسے ان کی آواز اتنی واضح اور صاف سنائی دی جیسے وہ اس کے بہت قریب، بہت پاس ہوں۔۔۔۔۔ جیسے وہ اس کے کوٹ کے اندر۔۔۔۔۔ اس کے جسم سے چٹ کے۔۔۔۔۔ بول رہے ہوں۔ آواز کی اس قربت اور حدت سے میرانڈا کو لگا جیسے اس کا جسم تپنے لگا ہے۔

"ہائے!" میرانڈا نے بہ مشکل سرگوشی کی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا بولے۔
"تم سیکسی ہو!" دیو نے جوابی سرگوشی کی۔

اگلے ہفتے جب ایک شام وہ اور لکشمی دفتر سے روانہ ہونے کی تیاری کر رہے تھے تو لکشمی نے اسے بتایا کہ اس کی کزن کے شوہر کا یہ کوئی پہلا معاشقہ نہیں تھا۔ "میری کزن نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے سر سے عشق کے بھوت اترنے کا انتظار کرے گی۔ وہ کہتی ہے کہ وہ یہ سب اپنے بچے کے لیے کر رہی ہے۔ وہ اپنے شوہر کو اپنے بیٹے کے لیے معاف کرنے کے لیے تیار ہے۔" میرانڈا غور سے لکشمی کی بات سن رہی تھی جو اپنا کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر رہی تھی۔ "وہ ایڑیاں رگڑتا ہوا واپس آئے گا اور میری کزن اسے دوبارہ قبول کر لے گی۔ میں تو ایسا کبھی نہ کروں۔ اگر میرا شوہر اس طرح کسی اور عورت کے چکر میں پڑ جائے تو میں تو اپنے گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے اس پہ بند کر دوں!" لکشمی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ میرانڈا نے لکشمی اور اس کے شوہر کی کیوبیکل میں ٹنگی تصویر کو غور سے دیکھا۔ لکشمی کے شوہر نے اس کے کندھے پہ اپنا بازو رکھا ہوا تھا اور اس کے گھٹنے لکشمی کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ لکشمی اچانک میرانڈا کی طرف مڑی اور بولی: "کیا تم ہوتیں تو ایسا نہ کرتیں؟"

میرانڈا نے اثبات میں سر ہلایا۔ دیو کی بیوی اگلے دن انڈیا سے واپس آرہی تھی۔ دوپہر کو دیو نے فون کر کے اسے بتایا تھا کہ اسے اپنی بیوی کو لینے ایئر پورٹ جانا ہے اور یہ کہ اسے جیسے ہی موقع ملے گا وہ اسے لازمی فون کرے گا۔
"تاج محل کیسی جگہ ہے؟" میرانڈا نے بات بدلنے کے لیے لکشمی سے پوچھا۔

"دنیا کی سب سے زیادہ رومانوی جگہ!" تاج محل کے تصور سے لکشمی کا چہرہ دکنے لگا، "محبت کی دائمی یادگار ہے تاج محل!"

جب دیو ایئر پورٹ پہ اپنے بیوی کو لینے گیا ہوا تھا تو میرانڈا فیملی بی بی ڈیپارٹمنٹ اسٹور کی میسمنٹ میں ایسے پہناوے پسند کرنے میں مگن تھی جو اس کے خیال میں کسی بھی محبوبہ کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اس نے سیاہ جوتوں کا ایک جوڑا پسند

کیا جس کی ایڑیاں بہت لمبی اور بکل بہت چھوٹے تھے۔ اسے ایک چمکتا دکتاریشی لباس جو جسم سے چمٹ جاتا تھا اور جس کے کنارے بہت دلکش انداز میں ڈیزائن کیے گئے تھے بہت اچھا لگا۔ شب خوابی کا ایک سلکی جامہ بھی اسے بہت بھایا جو صرف گھٹنوں تک لمبا تھا۔ دفتر میں وہ جالی دار چست شلوار^{۴۷} زیب تن کرتی تھی لیکن آج اس نے اس کی بجائے وہ جامہ پسند کیا جس کا چست جالی دار کپڑا اس کے پاؤں سے محض اس کی رانوں تک جاتا تھا^{۴۸}۔ وہ وہاں رکھے لباسوں کے انبار تلاشتی اور الماریوں میں لگے لباس ایک کے بعد ایک ہینگر نکال کر دیکھتی رہی یہاں تک کہ اسے اس کا مطلوبہ لباس مل گیا۔ اس ریشمی لباس^{۴۹} کے چاندی جیسے رنگ میں اس کی آنکھوں کی جھلک تھی اور اس کو پشت سے باندھنے کے لیے چھوٹی چھوٹی پٹیوں کی زنجیریں بہت دلکش لگ رہی تھیں۔ یہ سب خریدتے ہوئے اس کے دماغ میں دیو کا خیال گردش کر رہا تھا۔ دیو نے میپوریم میں اسے جو کچھ کہا تھا وہ ابھی تک اس میں کھوئی ہوئی تھی۔ زندگی میں پہلی دفعہ کسی مرد نے اسے سیکی کہا تھا۔ وہ جب بھی آنکھیں بند کر کے اس لمحے کا تصور کرتی تو اسے دیو کی وہ سرگوشی اپنے رگ و پے میں اب بھی دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی۔

ڈیپارٹمنٹ سٹور کا فننگ روم ایک وسیع کمرہ تھا جس کی دیواروں پر قد آدم آئینے ایستادہ تھے۔ کمرے میں میرانڈا کے علاوہ ایک بوڑھی عورت تھی جس کا چہرہ کمرے کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا لیکن اس کے بال بد رنگ اور سوکھے سڑے تھے۔ وہ محض زیر جامے میں کھڑی اپنے ہاتھوں سے ایک سیاہ جالی دار لباس کی لچک کو کھینچ تان کر دیکھ رہی تھی۔

"خریدنے سے پہلے ہی ٹھیک طرح سے دیکھ لینا چاہیے کہ کہیں کوئی کجی تو نہیں" اس نے نصیحت آموز مشورہ دیا۔ میرانڈا نے اپنا منتخب کردہ ریشمی لباس جو جسم کے زیر و بم کو عمدگی سے ظاہر کرتا تھا اور جس کے کنارے بہت مہارت سے ڈیزائن کیے گئے تھے نکال کر خود سے لگا کر دیکھا۔ عورت نے تائیدی انداز میں سر ہلایا "اچھا ہے!" "اور یہ کیسا ہے گا؟" اس نے دوسرا چاندی کے سے رنگ کا سلکی لباس اپنے سینے سے لگا کر دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "بہت عمدہ"، عورت نے جواب دیا۔ "تمہارا عاشق چاہے گا کہ اسے فوراً تمہارے جسم سے کھینچ کر اتار دے!"

میرانڈا نے چشم تصور سے دیو اور خود کو ساؤتھ اینڈ کے علاقے کے اس ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے دیکھا جہاں وہ دونوں ایک دفعہ کھانا کھانے گئے تھے اور جہاں دیو نے مرغابیوں کی کلیجی سے بنی فرانسسی ڈش "ہکا آرڈر" دیا تھا اور جہاں انہوں نے شیمپین اور رس بھری پھلوں سے بنی سوپ پی تھی۔ خیال کی رو میں اس نے خود کو چاندی کے رنگ کے فینسی لباس میں اور دیو کو اس کے سوٹ میں ملبوس میز کے گرد بیٹھ کر اس کا ہاتھ چومتے ہوئے تصور کیا۔

بہت دنوں کے تعطل کے بعد جب دیو اس سے دوبارہ اتوار کی شام کو ملنے آیا تو اس نے ورزش کرنے کا لباس پہن رکھا

تھا۔ بیوی کے لوٹنے کے بعد اب اس کے پاس گھر سے باہر رہنے کے لیے یہ ہی ایک بہانا تھا کہ وہ ہر اتوار کو دریائے چارلس کے کناروں پر بننے ٹریکس پر دوڑتا ہے۔ پہلے اتوار کو جب دیو نے اس کے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجائی تو اس نے محض گھنٹوں تک لمبے جامے میں دروازہ کھولا لیکن دیو نے اس کے لباس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے کچھ کہے بغیر میرانڈا کو اپنی بانہوں میں اٹھایا اور اس کی خواب گاہ میں بستر تک لے گیا۔ اپنا ٹراؤز اور بوٹ اتارے بغیر اور بنا کچھ کہے وہ اس کے وجود میں مدغم ہوتا چلا گیا۔ فراغت کے بعد جب میرانڈا نے جامہ دوبارہ پہن لیا اور دیو کے سگریٹ کی راکھ کے لیے پرچ لینے جانے لگی تو دیو نے اس کے لباس پہننے پر اعتراض کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ میرانڈا نے اسے اپنی دلکش ٹانگوں کے نظاروں سے محروم کر دیا تھا۔ وہ بضد تھا کہ میرانڈا یہ لبادہ اتار دے۔ اگلے اتوار جب دیو اس سے ملنے آیا تو میرانڈا نے کسی خاص لباس کا کوئی التزام نہیں کیا۔ اس نے جینز پہنے رکھی۔ وہ شوخ زیر جامے جو وہ بڑے شوق سے خرید کر لائی تھی اس نے ایک دراز میں جرابوں اور روزمرہ استعمال کے کپڑوں کے پیچھے کہیں رکھ دیے تھے اور چاندی کے رنگ کارٹیشی لباس الماری میں ٹانگ دیا تھا۔ اکثر صبح اسے یہ لباس ایک ڈھیر کی شکل میں فرش پر پڑا ہوا ملتا کیونکہ اس کی پٹیاں جن کی مدد سے وہ اسے ہینگر پر لٹکاتی تھی اکثر پھسل جاتیں۔

دیو کی اس کے لباس سے اس بے توجہی کے باوجود میرانڈا اب بھی اتوار کی آمد کا انتظار کرتی تھی۔ وہ صبح صبح قریبی بیکری سے کھانے پینے کا وہ سامان خرید لاتی جو دیو کو پسند تھا۔ وہ فرنیچر نان رول اور ڈبوں میں بند مچھلی کا اچار، آلوؤں کا سلاد، کیک اور اطالوی مکھن کا بندوبست کر رکھتی۔ وہ دونوں بستر پر ہی کھانا رکھ لیتے اور چھری کانٹوں کے بغیر ہاتھوں کی مدد سے ہی مچھلی کے حصے اور کیک کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر کھاتے رہتے۔ دیو اسے اپنے بچپن کے قصے سناتا جب وہ اسکول سے واپس گھر آتا تو اسے ایک ٹرے میں رکھ کر آم کا جوس پیش کیا جاتا تھا جسے نوش جاں کرنے کے بعد وہ کرکٹ کا سفید لباس پہن کر ایک جھیل کے کنارے بنے گراؤنڈ میں پہنچ جاتا اور کرکٹ کھیلتا رہتا۔ وہ اسے بتاتا کہ کیسے صرف اٹھارہ سال کی عمر میں ہی اسے نیویارک کے ایک دور دراز مضافاتی کالج میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ انڈیا میں یہ وہ دور تھا جب حکومت نے کسی ہنگامی حالت کا نفاذ کر رکھا تھا۔ اسے نیویارک میں انگریزی فلموں کے امریکی لب و لہجے کو مکمل طور پر سمجھنے میں کئی سال لگے تھے حالانکہ ہندوستان میں اس نے انگریزی میڈیم سکولوں میں ہی تعلیم پائی تھی۔ جب وہ یہ سب قصے سنارہا ہوتا تو اس کے ہاتھ میں سگریٹ جلتی رہتی جس کی راکھ وہ ایک پرچ میں گراتا جاتا جو بستر کے ساتھ رکھے میز پر دھری رہتی تھی۔ کبھی کبھار وہ میرانڈا کو بھی اس کا ماضی جاننے کے لیے کریدتا جیسے وہ اس سے پوچھتا کہ اس سے پہلے کتنے مرد اس کے چاہنے والے تھے اور جب پہلی دفعہ اس کا کسی مرد سے تعلق بنا تو اس کی عمر کتنی تھی۔ میرانڈا اسے بتاتی کہ اس کی زندگی میں تین مرد آچکے ہیں اور وہ انیس سال کی تھی جب

وہ پہلی دفعہ کسی مرد کے بہت قریب ہوئی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد وہ وہیں بستر پہ ہم آغوش ہو جاتے اور بستر کی چادر پہ گرے کھانے کے ذرات ان کے جسموں کے بوجھ تلے دبے جاتے۔ دیو پیار کے بعد ٹھیک بارہ منٹ کے لیے نیند کی ایک جھپکی لیا کرتا۔ میرا انڈا نے امریکا میں کبھی کسی بالغ عمر کے فرد کو یوں دن کو قیلولہ کرتے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ دیو کی اس عادت پہ حیران ہوتی لیکن تب دیو اسے بتاتا کہ انڈیا میں، جہاں وہ پلا بڑھا تھا، لوگوں کا یہ عام معمول ہے کہ وہ دن کو تھوڑی دیر کے لیے سوتے ہیں کیونکہ گرمی اس غضب کی پڑتی ہے کہ سورج ڈھلنے سے پہلے گھر سے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ "اس کے علاوہ یہ ہم لوگوں کو اکٹھے سونے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے!" وہ شرارتی انداز میں آہستہ سا یہ کہہ کر اس کے جسم کے گرد اپنی بانہوں کو کسی بڑے سے ہار کی طرح لپیٹ لیتا۔

بارہ منٹ کے اس مختصر دورانیے میں میرا انڈا کی نگاہیں کبھی پلنگ کی جڑواں میز پر رکھی گھڑی کی سوئیوں کا طواف کرتیں کبھی وہ دیو کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنسا کر اس کے ہاتھ کی پشت پر اپنا چہرہ رگڑتی رہتی۔ اس کی ہر انگلی کی پور پر اگے لگ بھگ نصف درجن بالوں کو اپنے چہرے سے مس کرتے ہوئے میرا انڈا کو عجب طمانیت کا احساس ہوتا۔ چھ منٹ گزرنے کے بعد وہ اس کی طرف اپنا چہرہ موڑ لیتی اور یہ دیکھنے کے لیے کہ دیو واقعی سو رہا ہے انگڑائیاں لیتے ہوئے کراہنے لگتی۔ لیکن وہ واقعی سو رہا ہوتا تھا۔ اس کی سانس کے اتار چڑھاؤ سے اس کی پسلیاں نمایاں ہوتی ہوئی واضح دکھائی دیتیں۔ اگرچہ دیو کی توند پہ چربی کے اثرات نظر آنا شروع ہو چکے تھے لیکن اس کا باقی جسم ابھی موٹاپے سے کوسوں دور تھا۔ توند کی طرح دیو کو اپنے گردن سے نیچے کندھوں پر اگے بالوں سے بھی شکایت تھی لیکن میرا انڈا کے خیال میں وہ ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ وہ اسے کسی اور شکل میں تصور بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ٹھیک بارہ منٹ بعد دیو مسکراتے ہوئے یوں آنکھیں کھول دیتا جیسے وہ کبھی سویا ہی نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا سکون طاری ہوتا کہ میرا انڈا کے دل میں بھی ایسی طمانیت کے حصول کی خواہش جاگ اٹھتی۔

"اس ہفتے کے یہ سب سے اچھے بارہ منٹ تھے!" وہ میرا انڈا کی پنڈلیوں پہ اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے آہ بھر کر کہتا۔ پھر وہ اچھل کر بستر سے اترتا، اپنا ٹراؤزر پہنتا اور بوٹوں کے تسمے کھینچ کر ہاتھ روم میں دانت صاف کرنے چلا جاتا۔ برش کی بجائے وہ اپنی انگلی پہ پیسٹ لگاتا اور اسے دانتوں پہ رگڑتا کہ مونہ سے سگریٹ کی بو جاتی رہے۔ دیو نے اسے بتایا تھا کہ انگلی سے دانت پیسٹ کرنے کے فن سے انڈیا کے رہنے والے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ وقتِ رخصت جب میرا انڈا اسے بوسہ دیتی تو اسے اپنی خوشبو دیو کے بالوں میں رچی ہوئی محسوس ہوتی لیکن وہ جانتی تھی کہ دیو واپس گھر جاتے ہی سب سے پہلے غسل کرے گا۔ گھر جاتے ہی غسل خانے میں گھس جانے کے لیے اس کے پاس بہانہ موجود

ہوتا تھا کہ وہ گھنٹوں جاگنگ کرتا رہا ہے اس لیے پسینے سے نجات کے لیے یہ ضروری ہے۔

دیو اور لکشمی کے علاوہ زندگی میں میرانڈا صرف ایک اور انڈین خاندان کو جانتی تھی۔ میرانڈا کا بچپن جس علاقے میں گزرا ڈکسٹ فیملی وہیں ان کے پڑوس میں رہائش پذیر تھی۔ ہر شام مسٹر ڈکسٹ اپنے گھر کے ارد گرد کی گلیوں میں جاگنگ کرنے کے لیے نکلتے۔ انہوں نے گھر کے عام استعمال کے کپڑے پہن رکھے ہوتے اور ان کے سارے جسم پہ اگر ورزش کرنے کی کوئی علامت ہوتی تو وہ سستے قسم کے ربڑ کے تلووں والے کینوس کے جوتے ہوتے۔ محلے کے بچے ان کی اس ہیئت کدائی سے لطف اندوز ہوتے لیکن ڈکسٹ فیملی کے بچوں کو اپنے باپ کا اس حالت میں جاگنگ کرنا برا لگتا تھا۔ ہفتے کے اختتام پر چھٹی والے دن یہ خاندان۔۔۔ باپ، ماں، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔۔۔ اپنی کار میں لد لدا کر کہیں جایا کرتے تھے۔ وہ کہاں جاتے تھے اس کا علم کسی کو نہ تھا۔ محلے کے مرد اکثر شکایت کرتے نظر آتے کہ مسٹر ڈکسٹ گھر کے لان کی دیکھ بھال نہیں کرتے اور نہ ہی گرے ہوئے پتوں کو بروقت سمیٹتے ہیں۔ ان سب کا اس امر پہ اتفاق تھا کہ ڈکسٹ فیملی کا سب سے الگ دکھنے والا گھر ان کے علاقے کے حسن کو گہنارہا تھا گویا یہ ان کے اپ سکیل منحل میں ٹاٹ کا ایک بد نمایاں ہند تھا۔ عورتیں جب سوئمنگ پول کے کنارے اکٹھی ہوتیں تو کبھی مسز ڈکسٹ کو مدعو نہ کرتیں۔ جب بچے اسکول بس کے انتظار میں کھڑے ہوتے تو ڈکسٹ فیملی کے الگ تھلگ کھڑے بچوں کو دیکھ کر کھسر پھسر کرنے لگتے "ڈکسٹ۔۔۔ ڈگ۔۔۔ شٹ" اور پھر وہ باجماعت زور زور سے ہنسنے لگتے!

ایک دفعہ پڑوس کے سارے بچوں کو ڈکسٹ فیملی نے اپنی لڑکی کی سالگرہ پہ مدعو کیا۔ میرانڈا کو اب بھی ان کے داخلی دروازے کے باہر جوتوں کا ڈھیر اور گھر میں داخل ہوتے ہی پیاز اور اگر بیٹوں کی تیز بو یاد تھی۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر جو یاد اس کے دماغ کے پردے پر نقش ہو گئی تھی وہ ان کے گھر میں سیڑھیوں کے نیچے لکڑی کی کھونٹی سے ٹنگا تکیے کے غلاف جتنے سائز کا وہ کپڑا تھا جس پر ایک برہنہ عورت کی پینٹنگ بنی ہوئی تھی۔ کسی جنگجو کی ڈھال سے ملتا جلتا اس عورت کا چہرہ سرخ تھا اور اس کی بڑی بڑی سفید آنکھیں ابل کر باہر آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کی پتلیوں کی جگہ محض دو سیاہ نکلتے لگائے گئے تھے اور آنکھیں کن پٹیوں کی سمت پھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ اس کی چھاتیوں کی جگہ بھی دو گول دائرے بنا کر درمیان میں آنکھوں کی پتلیوں جیسے سیاہ نکلتے لگائے گئے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ میں جارحانہ انداز سے ایک خنجر اٹھا رکھا تھا اور ایک پاؤں تلے اس نے ایک تڑپتے پھڑکتے مرد کو دوبار کھاتھا۔ اس کے گلے میں خون آلود انسانی سروں کا ایک لمبا چوڑا ہار تھا اور اس نے اپنی سرخ زبان یوں باہر نکال رکھی تھی جیسے سامنے کھڑی میرانڈا کو چڑا رہی ہو۔

"یہ ہماری کالی ماتا دیوی ہے۔" مسز ڈکسٹ نے چپکتے ہوئے میرانڈا کو بتایا۔ اس نے لکڑی کی کھونٹی کو درست کیا تاکہ

تصویر جو کسی قدر ٹیڑھی ہو رہی تھی سیدھی ہو جائے۔ اس کے ہاتھ مہندی کے پیچ در پیچ ڈیزائن سے بھرے ہوئے تھے۔

"آ جاؤ اب کیک کاٹنے کا وقت ہے!"

نوسالہ میرانڈا اس قدر ڈر گئی تھی کہ اسے کیک کھانے کا خیال تک بھول چکا تھا۔ اس دعوت کے کئی مہینوں بعد بھی میرانڈا جب ان کے گھر کے سامنے سے گزرتی تو وہ ڈر کے مارے گلی کے دوسرے کنارے پہ چلنا شروع کر دیتی۔ اسے ایک دفعہ اسکول جاتے ہوئے بس اسٹاپ تک پہنچنے کے لیے اور دوسری دفعہ واپسی پر بس اسٹاپ سے گھر کی طرف آتے ہوئے دن میں دو مرتبہ ان کے گھر کے سامنے سے گزرنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھار تو وہ اتنی خوفزدہ ہو جاتی کہ وہاں سے گزرتے ہوئے سانس تک روک کر جلدی سے آگے بڑھ جاتی بالکل ایسے ہی جیسے اسکول بس جب قبرستان کے سامنے سے گزرا کرتی تھی تو وہ مارے ڈر کے اپنی سانس کھینچ لیتی تھی۔

اپنے اُس ڈر کو سوچ کر اب میرانڈا کو شرمندگی محسوس ہوتی۔ دیو سے پیار کرتے ہوئے اب وہ آنکھیں میچ لیتی اور چشم تصور سے ہاتھیوں اور صحراؤں کو دیکھتی اور چودھویں رات کی چاندنی میں نہائے ہوئے سنگ مرمر کے خیموں کو دیکھتی جو جھیل کے شفاف پانیوں پہ خاموشی سے تیر رہے ہوں۔

ایک سینچر کو جب اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہ تھا وہ پیدل چل کر سنٹرل سکوائر میں ایک ہندوستانی ریستورانٹ میں جا پہنچی اور تندوری چکن کا آرڈر دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے مینیو کارڈ کے نچلے حصے میں لکھے کچھ لفظ اور جملے یاد کرنے کی کوشش کی۔۔۔ "مزیدار"، "پانی" اور "بل ادا کیجیے پلیز" جیسے الفاظ کوشش کے باوجود وہ زیادہ دیر ذہن میں بٹھا نہیں پائی اس لیے اس نے وقتاً فوقتاً کینمور سکوائر میں واقع کتابوں کی دکان کے اس حصے میں جانا شروع کر دیا جہاں غیر ملکی زبانوں کی کتابیں رکھی گئی تھیں۔ یہاں وہ بنگالی زبان کے حروف تہجی خود سے سیکھنے کی کوشش کرتی۔ ایک دفعہ اس نے اپنی ڈائری میں اپنے نام کے ہندوستانی حصے "میرا" کو لکھنے کی کوشش بھی کی۔ ایسا کرتے ہوئے اسے ایسا لگا جیسے اس کا ہاتھ انجان سمت میں حرکت کر رہا ہے، جیسے اس کا قلم غیر متوقع طور پر بے وقت مڑا اور ٹھہر رہا ہے۔ کتاب میں دیے گئے نشانات کی پیروی میں وہ بائیں سے دائیں ایک لائن کھینچتی جس کے نیچے حروف کو جوڑا جاتا۔ ان میں سے کچھ حروف سے زیادہ عدد دکھائی دیتے اور کچھ کسی تکلون کی مانند نظر آتے۔ اپنے نام کے حروف کو کتاب میں دیے گئے نمونے کے حروف جیسا لکھنے کے لیے پے در پے کوششیں کرنے کے بعد بھی وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے بنگالی میں "میرا" لکھا ہے یا "مارا"! بظاہر اس کے لیے یہ آڑھی ترچھی لکیریں تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ دنیا کے ایک حصے میں یہ بے ترتیب لکیریں بھی اتنی بے معنی نہیں ہیں!

میرانڈا کے لیے ہفتے کے باقی دن اب اتنے برے نہیں رہے تھے کیونکہ وہ سارا دن کام میں جتی رہتی تھی۔ وہ لکشمی کے ساتھ دن کا کھانا ایک نئے کھلنے والے قریبی ہندوستانی ریسٹورنٹ میں کھاتی جہاں لکشمی اسے اپنی کزن کی شادی شدہ زندگی کی تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرتی۔ کبھی کبھار میرانڈا موضوع بدلنے کی کوشش کرتی لیکن لکشمی کو اس کے سوا کوئی موضوع بھاتا ہی نہ تھا۔ جب لکشمی بے تکان اپنی کزن کے شوہر کے معاشقے پر تبصرہ کر رہی ہوتی تو میرانڈا کو ایک عجب بے چینی سی گھیر لیتی۔ اسے بالکل ایسا لگتا جیسے کالج کے دنوں میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ سے بل ادکیے بغیر کھسک جانے پہ محسوس ہوا تھا۔ لیکن لکشمی اس کی کیفیات سے بے خبر بولتی چلی جاتی:

"اگر میں اپنی کزن کی جگہ ہوتی تو میں پہلی فلائٹ پکڑ کے سیدھا لندن جاتی اور ان دونوں کو گولی مار دیتی۔" پاپڑ کو درمیان سے توڑ کر اس کے ٹکڑے کو چٹنی میں ڈبو تے ہوئے لکشمی نے ایک دن اعلان کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ سمجھ نہیں آتی وہ ایسے کس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے!"

میرانڈا جانتی تھی کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر انتظار کیسے کیا جاتا ہے۔ ہر شام وہ کھانے کی میز پر بیٹھ کر اپنے ناخنوں پہ پالش لگاتی، سلاد کے پیالے سے براہ راست سلاد چن چن کر کھاتی، ٹیلی ویژن دیکھتی اور پہروں اتوار کی آمد کا انتظار کرتی رہتی۔ بالخصوص ہفتے کا دن گزارنا اس کے لیے دو بھر ہو جاتا کیونکہ اسے ایسا لگتا جیسا یہ انتظار کبھی ختم نہیں ہو گا جیسے اتوار کا دن کبھی نہیں آئے گا۔ ایک دفعہ جب ہفتے کو رات گئے دیونے اسے فون کیا تو پس منظر سے لوگوں کے بولنے اور ہنسنے کی آوازیں اس شدت سے آرہی تھیں کہ میرانڈا کو اس سے پوچھنا پڑا کہ کیا وہ کسی کنسرٹ ہال میں کھڑا ہے؟ لیکن دیو کنسرٹ ہال میں نہیں بلکہ اپنے مضافاتی گھر میں تھا۔ "میں تمہیں ٹھیک طرح سے سن نہیں پا رہا۔ گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ کیا تم مجھے یاد کر رہی ہو؟" میرانڈا کی نگاہیں ٹیلی ویژن کی سکرین پر تھیں جس پر چلنے والے مزاحیہ ڈرامے کی آواز فون کال بجنے پہ اس نے بند کر دی تھی۔ اس نے تصور میں دیو کو اپنے گھر کے بالائی کمرے میں ایک ہاتھ میں فون پکڑے سرگوشی کرتے اور دوسرا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پہ رکھے ہوئے دیکھا۔ "میرانڈا کیا تم مجھے یاد کر رہی ہو؟" دیونے دوبارہ پوچھا جس پر میرانڈا نے اسے بتایا کہ وہ اسے بہت شدت سے یاد کر رہی ہے۔

اگلے روز اتوار کو جب دیو اس سے ملنے آیا تو میرانڈا نے اس سے پوچھا کہ اس کی بیوی کیسی دکھتی ہے۔ یہ سوال پوچھتے ہوئے وہ گھبرا رہی تھی اس لیے اس نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک دیونے اپنا آخری سگریٹ پی کر پرچ میں بچھا نہیں دیا۔ میرانڈا سوچ رہی تھی کہ کیا دیو اور اس کی بیوی کبھی آپس میں لڑتے بھی ہوں گے۔ لیکن دیو کو اس کا سوال سن کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ اس نے میرانڈا کو بتایا کہ اس کی بیوی بمبئی کی ایک اداکارہ مادھوری ڈکشٹ سے ملتی

جلتی ہے۔

ایک لمحے کے لیے میرانڈا کو یوں لگا جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔ ڈکشت کے لفظ نے اس کے دماغ میں گھنٹیاں سی بجادی تھیں۔ لیکن پھر اسے یہ یاد کر کے قدرے اطمینان ہوا کہ وہ جس ڈکشت خاندان کو جانتی تھی ان کی لڑکی کا نام پ سے شروع ہوتا تھا۔ وہ لڑکی تو دکھنے میں بالکل بھی پرکشش نہیں تھی اور سکول کے زمانے میں وہ ہمیشہ بالوں کی دو چٹیا بنائے رکھتی تھی۔ میرانڈا سوچ رہی تھی کہ کیا اس لڑکی اور مادھوری ڈکشت کا آپس میں کوئی رشتہ تھا!

کچھ دنوں بعد میرانڈا سنٹرل سکوائر میں واقع کریانے کی ایک دیسی دکان میں مادھوری ڈکشت کی تلاش میں جا پہنچی۔ یہاں ویڈیو کیسٹیں کرائے پر دستیاب تھیں۔ جب وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو دروازے سے جڑی لڑیوں نے پراسرار سی گھنٹیاں بجائیں۔ کھانے کا وقت ہو چلا تھا اس لیے دکان میں اس کے سوا کوئی گاہک نہ تھا۔ اسٹور کے ایک کونے میں ذرا بلندی پر دیوار سے ٹنگا ایک ٹیلی ویژن رکھا تھا جس پہ چلنے والی ویڈیو میں ساحل سمندر پہ لڑکیوں کی ایک قطار ڈھیلی ڈھالی گھیرے دار شلواریں پہنے حالتِ رقص میں ایک ہی ردھم پہ ٹھک رہی تھی۔

"فرمائیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" کاؤنٹر پہ کھڑے شخص نے اس سے پوچھا۔ اس کے ہاتھ میں سموسہ تھا جسے وہ کاغذی پلیٹ میں رکھی گہرے سے رنگ کی چٹنی نما کسی شے میں ڈبو کے کھا رہا تھا۔ کاؤنٹر کے شیشے کے نیچے سچی ٹرے میں موٹے تازے سموسے، چاندی کے ورق میں لپیٹی برقی نمائٹھائیاں اور شیرے میں ڈوبی ہوئی نارنجی رنگ کی جلیبیاں پڑی تھیں۔ "آپ کو کسی ویڈیو کیسٹ کی تلاش ہے؟"

میرانڈا نے اپنی ڈائری کھولی جس میں اس نے دیو کی بتائی ہوئی اداکارہ کا نام لکھ رکھا تھا۔۔۔ "موٹوری ڈکشت"۔۔۔ اس نے کاؤنٹر کی پشت پر الماریوں میں ویڈیو کیسٹوں کی قطاروں میں مادھوری کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ کیسٹوں کے کور پہ براجمان لڑکیوں نے چست سکرٹس اور تنگ چولیاں ایسے پہن رکھی تھیں جیسے انہوں نے چھاتیوں کو گلوبند سے باندھ رکھا ہو۔ کچھ لڑکیاں کسی پتھریلی دیوار یا درخت سے ٹیک لگائے ایک ادا سے کھڑی تھیں۔ ساحل پہ باجماعت ناچنے والے لڑکیوں کی طرح یہ سب بھی بہت خوبصورت تھیں۔ ان کی آنکھوں میں سرمے کی لکیریں کھنچی ہوئی تھیں اور ان کے بال گھنے، سیاہ اور لمبے تھے۔ اسی لمحے میرانڈا جان چکی تھی کہ مادھوری ڈکشت بھی خوبصورت ہوگی۔

"ہمارے پاس انگریزی سب ٹائٹل والی ویڈیوز بھی موجود ہیں۔" دکاندار نے اپنی بات جاری رکھی۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنی شرٹ سے پونچھ کر صاف کیے اور تین کیسٹیں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں۔

"نہیں!" میرانڈا نے جواب دیا، "شکریہ! مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے!" وہ سٹور میں بے مقصد گھومتی الماریوں میں

پڑے ہوئے ان پیکیٹوں اور ڈبوں کو دیکھتی رہی جن پہ کچھ بھی درج نہ تھا۔ فریزر خمیری روٹیوں کے پیکیٹوں اور ان سبزیوں سے اٹا ہوا تھا جن کے نام تک میرانڈا نہیں جانتی تھی۔ البتہ وہ نمکو کے ان درجنوں پیکیٹوں سے بخوبی واقف تھی جو ایک الماری میں ترتیب سے پڑے تھے۔ ایسے ہی نمکو کے پیکٹ لکشمی سارا دن کھا کھا کر خالی کرتی رہتی تھی۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ لکشمی کے لیے کچھ پیکٹ خرید لے پھر وہ یہ سوچ کر رک گئی کہ نہ جانے لکشمی کیا سوچے کہ وہ کریانے کی دیسی دکان میں کیا کرنے گئی تھی۔

"یہ بہت مصالحو دار ہیں" دکاندار نے سر ہلاتے اور اپنی نظروں سے اس کے جسم کو ٹٹولتے ہوئے کہا، "آپ کے لحاظ سے یہ کچھ زیادہ ہی چٹ پٹے ہیں!"

فروری کے مہینے تک بھی لکشمی کی کزن کے شوہر کا شمار عشق ابھی نہیں اتر تھا۔ وہ مونٹریال میں اپنی بیوی کے پاس ایک دفعہ آیا تھا۔ دونوں دو ہفتوں تک ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہے تھے اور وہ اپنے سامان کے دو سوٹ کیس بھر کے واپس لندن چلا گیا تھا۔ اسے اب اپنی بیوی سے طلاق چاہیے تھی۔

میرانڈا اپنے کیوبیکل میں بیٹھی لکشمی اور اس کی کزن کی گفتگو سن رہی تھی۔ لکشمی اپنی کزن کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ دنیا میں اچھے مردوں کی بھی کمی نہیں بس وہ مناسب وقت پر ہماری زندگی میں آتے ہیں۔ اگلے دن کزن نے لکشمی کو بتایا کہ اس سانحے سے سنبھلنے کے لیے وہ بیٹے کے ساتھ اپنے والدین کے ہاں رہنے کے لیے کیلیفورنیا جا رہی ہے۔ لکشمی نے اسے راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ ایک ہفتے کے لیے اس کے پاس بسٹن اٹھ آئے۔ "جگہ بدلنا تمہارے لیے اچھا ہو گا۔" لکشمی نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ میں نے تمہیں کئی سالوں سے دیکھا بھی نہیں ہے۔"

دوسری طرف میرانڈا اپنے کیوبیکل میں اپنے فون پہ نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ وہ بڑی شدت سے دیو کی کال کی منتظر تھی۔ دیو سے اس کی آخری دفعہ چار روز قبل بات ہوئی تھی۔ وہ لکشمی کو سن رہی تھی جو اپنی کزن کی آمد کی تیاری میں لگ گئی تھی۔ وہ ہیلپ لائن سے کسی بیوٹی سیلون کا نمبر مانگ رہی تھی۔ اس نے مطلوبہ سیلون کال کر کے مساج، فیشیل، پیڈی اور مینی کیور کے لیے بنگ کی۔ پھر فورسیزن ہوٹل میں اس نے دن کے کھانے کے لیے ایک میز مختص کروائی۔ اپنی غم زدہ کزن کو خوش کرنے کے جوش میں وہ اس کے بیٹے کو بھلا بیٹھی تھی۔ اس لیے اس بچے کو سنبھالنے کے لیے اسے میرانڈا کی ضرورت تھی چنانچہ اس نے اپنے اور میرانڈا کے کیوبیکلز کے درمیانی دیوار پہ انگلی بجاتے ہوئے اس سے پوچھا:

"تم ہفتے کے دن کہیں مصروف تو نہیں ہو؟"

لڑکا دبلا پتلا سا تھا۔ اس نے پیلے رنگ کا ایک سفری بیگ پشت پہ اٹھا رکھا تھا اور خاکستری پتلون پہ سرخ رنگ کی انگریزی حرف وی جیسے گلے والی سویٹر پہن رکھی تھی۔ اس کے پاؤں میں سیاہ رنگ کے چمڑے کے جوتے تھے۔ اس کے گھنے بال ماتھے کو چھپاتے ہوئے اس کی بھنوں تک آئے ہوئے تھے اور آنکھوں کے نیچے سیاہ رنگ کے حلقے نمایاں تھے۔ ان سیاہ حلقوں نے میرانڈا کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ ان کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ پریشان حال اور اجڑا بچہ اس ہو۔۔۔۔۔ جیسے وہ سگریٹ پھونکتا اور رتجگے کاٹا رہا ہو اگرچہ اس کی سات سال کی چھوٹی سی عمر ان عذابوں سے گزرنے کی نہیں تھی۔ اس نے اپنی بغل میں ایک اسکیچ پیڈ دبا رکھا تھا۔ اس کا نام روہن تھا۔

"مجھ سے کسی دارالحکومت کے بارے میں پوچھیں" میرانڈا کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا۔

میرانڈا نے اس کا سوال نہ سمجھتے ہوئے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے وہ بولی: "کیا پوچھوں؟"

"یہ ایک طرح کا کھیل ہے جو یہ کھیلتا رہتا ہے" لکشمی کی کزن نے وضاحت کی۔ اپنے بیٹے کی طرح وہ بھی دھان پان سی تھی۔ اس کا چہرہ لمبوتر تھا اور اس کی آنکھوں کے نیچے بھی سیاہ حلقے واضح دکھائی دے رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے کندھوں نے اس کے مٹیلے رنگ کے کوٹ کا وزن بمشکل اٹھا رکھا ہے۔ اس نے کسی بلی ڈانسر کے سے انداز میں اپنے بالوں کو کھینچ کر سر کے اوپر جوڑا بنا رکھا تھا اور اس کی کنپٹیوں پہ چند سفید بال دکھائی دے رہے تھے۔

"آپ اسے کسی ملک کا نام بتائیں یہ آپ کو اس کے دارالحکومت کا نام بتائے گا۔"

"تم اسے تب سنیتیں جب ہم کار میں تھے" لکشمی نے لقمہ دیا، "اس نے ابھی سے سارے یورپ کے دارالحکومتوں کے نام یاد کر لیے ہیں۔"

"یہ کھیل نہیں ہے" روہن بولا "میرا اسکول میں ایک لڑکے کے ساتھ مقابلہ ہے۔ ہم دنیا کے سب ملکوں کے

دارالحکومتوں کے نام یاد کر رہے ہیں۔ میں نے اس لڑکے کو ہر حال میں ہرانا ہے۔"

میرانڈا نے یہ سن کر سر ہلایا۔ "اچھا! یہ بتاؤ کہ انڈیا کے دارالحکومت کا کیا نام ہے؟"

"یہ کیسا سوال ہے بھلا!" وہ کسی فوجی کھلونے کی طرح بازو ہلاتا اور پریڈ کرتا ہوا کمرے کے دوسرے سرے پر چلا گیا۔

پھر ویسے ہی بازو چلاتا واپس آیا اور اپنی ماں کے کوٹ کی جیب پکڑ کے جھولنے لگا۔ "مجھ سے کوئی مشکل سوال پوچھیں

۔"

"سینیکال؟" میرانڈا بولی۔

"ڈاکار" روہن نے فاتحانہ انداز سے جواب دیا اور کمرے میں گول چکروں میں دوڑنے لگا۔ پھر وہ بھاگتا ہوا کچن کی

طرف نکل گیا۔ میرا نڈا نے اس کے فریج کھولنے اور بند کرنے کی آواز سنی۔

"روہن! بغیر پوچھے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے!" لکشمی کی کزن نے تھکے تھکے سے انداز میں اسے آواز دی۔ پھر میرا نڈا کی طرف دیکھ کر پھینکی سی مسکراہٹ چہرے پہ سجاتے ہوئے کہنے لگی: "آپ کو زیادہ تنگ نہیں کرے گا ابھی تھوڑی دیر میں یہ سو جائے گا۔ اور ہاں آپ کا شکریہ کہ آپ نے آج اس کا خیال رکھنے کی حامی بھری!"

"ہم تین بجے تک واپس آجائیں گے" اپنی کزن کے ساتھ گھر سے باہر جاتے ہوئے لکشمی بولی۔ "کسی کمبخت نے ہماری گاڑی کے پیچھے اپنی گاڑی کھڑی کر دی ہے!"

دروازے کی زنجیر چڑھا کر میرا نڈا باورچی خانے میں روہن کو دیکھنے گئی لیکن وہ اب لونگ روم میں جا چکا تھا۔ کھانے کی میز پہ بیٹھا وہ اپنے بیگ کی زنجیر کھول رہا تھا۔ اس نے میرا نڈا کی مینی کیور کے سامان کی ٹوکری کو ایک طرف دھکیل کر اپنی رنگ برنگی پنسلوں کو میز پہ بکھیر دیا۔ میرا نڈا اس کے پیچھے کھڑی اسے یہ سب کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کی ایک پنسل اٹھائی اور ہوائی جہاز کا خاکہ بنانے لگا۔

"بہت پیارا ہے یہ!" وہ بولی۔ جب روہن نے اس کے تبصرے کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ باورچی خانے میں اپنے لیے کافی لینے چل دی۔

"میرے لیے بھی لیتی آئیے گا!" روہن نے زور سے آواز لگائی!

"کیا لاؤں؟" لونگ روم میں واپس آتے ہوئے میرا نڈا نے اس سے پوچھا۔

"تھوڑی سی کافی! میں نے کافی دان میں دیکھا تھا میرے لیے بھی کافی ہوگی!"

میرا نڈا چل کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ تصویر بناتے ہوئے میز پر بکھری ہوئی پنسلوں میں سے اپنی مطلوبہ پنسل اٹھانے کے لیے بار بار روہن کرسی سے اٹھ کھڑا ہوتا۔

"تمہاری ابھی کافی پینے کی عمر نہیں روہن!"

روہن اپنے اسکیچ پیڈ پہ یوں جھک گیا تھا کہ اس کا چھوٹا ساسینہ اور کندھے پیڈ کو تقریباً چھونے لگے تھے اور اس نے سر ایک طرف جھکا رکھا تھا۔ "ایئر ہو سٹس نے تو مجھے کافی دی تھی" وہ بولا۔ "اس نے اس میں بہت سا دودھ اور چینی ڈالی تھی۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پیڈ پہ اس نے جہاز کے ساتھ ایک عورت کا اسکیچ بھی بنایا تھا۔ عورت کے بال لمبے اور بل کھاتے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں کی جگہ ستارے سے بنے ہوئے تھے۔ "اس کے بال بہت دلکش تھے۔"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "میرے پاپا کو بھی جہاز پہ ایک خوبصورت عورت ملی تھی!" کافی کے گھونٹ بھرتی میرا نڈا کو غور سے دیکھتے ہوئے اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ جیسے اس پہ کوئی گھٹاسی چھا رہی ہو۔ "کیا آپ مجھے تھوڑی سی

کافی بھی نہیں دے سکتیں؟ پلیز؟؟"

میرانڈا سوچ رہی تھی کہ اس بظاہر پرسکون اور کھوئے کھوئے سے بچے کے اندر کہیں کوئی چڑچڑاہٹ اور چیخنے چلانے والا بچہ تو نہیں چھپا بیٹھا۔ میرانڈا نے چشم تصور سے روہن کو اس کی ماں اور لکشمی کے آنے تک خود پہ لاتیں چلاتے، گلا پھاڑ کے روتے اور کافی کے لیے چیختے چلاتے ہوئے دیکھا۔ یہ سوچ کر وہ چپ چاپ باورچی خانے میں روہن کے لیے اس کی خواہش کے مطابق کافی بنانے چلی گئی۔ کافی ڈالنے کے لیے اس نے ایک ایسے مگ کا انتخاب کیا جس کی اسے کچھ خاص ضرورت نہ تھی یعنی اگر روہن اسے گرا کے توڑ بھی دیتا تو میرانڈا کو افسوس نہ ہوتا۔

"شکریہ!" جب میرانڈا نے کافی کا مگ میز پہ رکھا تو وہ بولا۔ مگ کو دنوں ہاتھوں کے پیالے میں مضبوطی سے پکڑ کو وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔

میرانڈا اس کے ساتھ میز پہ بیٹھی اسے تصویریں بناتے ہوئے دیکھتی رہی لیکن جب وہ اپنے ناخنوں پہ پالش لگانے لگی تو روہن کو یہ برا لگا۔ وہ اس کی توجہ کا طالب تھا۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک تقویم نما ڈائری نکال لی اور میرانڈا سے کہنے لگا کہ وہ اس سے کچھ سوال پوچھے۔ اس کتاب میں دنیا بھر کے ملکوں کو ان کے براعظموں کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا تھا۔ ہر صفحے پہ چھ ملکوں کے نام، ان کے دارالحکومت، ان کی آبادی، نظام حکومت اور دیگر معلومات درج تھیں۔ دارالحکومتوں کے ناموں کو موٹے حروف سے نمایاں کیا گیا تھا۔ میرانڈا نے براعظم افریقہ والے حصے میں ایک صفحہ کھولا اور ملکوں کی فہرست پہ نظر ڈالتے ہوئے اس سے پوچھنے لگی۔

"مالی؟"

"باما کو" وہ فوراً بولا۔

"مالاوی؟"

"لیلونگوئی"

میرانڈا کو میموریم میں بنا افریقہ کا نقشہ یاد آیا جس کا زیادہ تر حصہ گہرے سبز رنگ میں رنگا گیا تھا۔

"اور بھی پوچھیں!" روہن بولا۔

"ماریطانیہ؟"

"نوآکشوٹ"

"موریٹش؟"

وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ اپنی آنکھیں بند کر کے کچھ دیر سوچتا رہا پھر آنکھیں کھول کر ہار مانتے ہوئے کہنے لگا۔ "مجھے

یاد نہیں آ رہا"

"پورٹ لوئیس" میرا نڈانے اسے بتایا۔

"پورٹ لوئیس۔۔۔ پورٹ لوئیس۔۔۔ پورٹ لوئیس" وہ ایک ہی سانس میں کسی منتر کی طرح بار بار یہ نام چپنے لگا۔ جب وہ افریقہ کے آخری حصے تک پہنچے تو روہن اس کو نرسے اکتا چکا تھا۔ اس نے کارٹون دیکھنے کی فرمائش کر دی اور ساتھ یہ بھی شرط رکھ دی کہ میرا نڈا بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر کارٹون دیکھے گی۔ جب کارٹون بند ہوئے تو وہ اس کے پیچھے چلتا ہوا باورچی خانے میں پہنچا اور میرا نڈا کے ساتھ کھڑا ہو کر کافی بنتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد میرا نڈا واش روم گئی تو وہ اس کے پیچھے نہیں گیا تاہم جب وہ واش روم سے نکلی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔

"کیا آپ کو بھی واش روم جانا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا لیکن سیدھا چلتا ہوا واش روم میں داخل ہو گیا۔ ٹائلٹ کے ڈھکنے پہ کھڑے ہو کر وہ آئینے کے سامنے بنے اس چھوٹے سے شیشے کے شلف کا جائزہ لینے لگا جس پہ میرا نڈا کے میک اپ کا سامان اور دانتوں کا برش پڑا رہتا تھا۔

"یہ کس لیے ہے؟" آنکھوں کی جیلی کی اس چھوٹی سی ٹیوب کو اٹھاتے ہوئے وہ پوچھنے لگا جو میرا نڈا کو بطور نمونہ اس روز اسٹور سے خریداری کرتے ہوئے ملی تھی جب اس کا دیو سے پہلی دفعہ سامنا ہوا تھا۔

"سو جن دور کرنے کے لیے"

"سو جن کیا ہوتی ہے؟"

"یہ ہوتی ہے" آنکھوں کے گرد اشارہ کرتے ہوئے میرا نڈا نے اسے سمجھایا۔

"جو رونے کے بعد بنتی ہے؟"

"ہاں! شاید"

روہن نے ٹیوب کھول کر اس کی خوشبو سونگھی پھر اسے تھوڑا دبا کر ایک قطرہ اپنی انگلی پہ گرایا اور اپنے ہاتھ پہ رگڑنے لگا۔

"یہ تو چہرہ ہی ہے!" یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ کو آنکھوں کے قریب کر کے یوں غور سے دیکھنے لگا جیسے یہ توقع کر رہا ہو کہ ابھی اس کا رنگ بدلنے لگے گا۔

"میری ماما کی آنکھوں پہ بھی سو جن رہتی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ نزلے کی وجہ سے ہے پر مجھے پتہ ہے وہ روتی رہتی ہیں۔

کبھی کبھی تو وہ گھنٹوں روتی ہیں۔ ہم کھانا کھانے بیٹھتے ہیں وہ تب بھی رو رہی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ اتنا زیادہ روتی ہیں کہ ان کی آنکھیں ایسے سوچ جاتی ہیں جیسے کسی بڑے سے مینڈک کی آنکھیں ہوں!"

میرانڈا سوچ رہی تھی کہ کیا اس بچے کو اب بھوک لگ رہی ہو گی یا نہیں کیونکہ اسے بچوں کے معمولات کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ باورچی خانے میں اسے رس کیس کا ایک پیکٹ اور سلاد پڑا ہوا ملا۔ اس نے روہن سے کہا کہ وہ باہر سے جا کر اس کے کھانے کے لیے بیکری سے کچھ لے آتی ہے لیکن روہن نے جواب دیا کہ اسے زیادہ بھوک نہیں ہے۔ اس نے ایک رس کیک لے لیا۔ "آپ بھی ایک رس کیک کھاؤ" اس نے کہا۔ وہ دونوں کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ رس کیک ان کے سامنے رکھے تھے۔ روہن نے اپنے اسکیچ پیڈ کا ایک نیا صفحہ پلٹا اور کہنے لگا: "اب آپ بنائیں"

میرانڈا نے نیلے رنگ کی پنسل اٹھائی۔ "میں کیا بناؤں؟"

وہ ایک لمحے کے لیے سوچتا رہا پھر بولا "میں بتاتا ہوں۔ آپ کمرے کی چیزوں کا اسکیچ بناؤ، صوفے، کرسیوں، ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون بناؤ۔۔۔ اس طرح مجھے یہ سب یاد ہو جائے گا"

"کیا یاد ہو جائے گا؟"

"یہ دن جو ہم نے اکٹھے گزارا!" یہ کہتے ہوئے روہن دوسرا رس کیک پیکٹ سے نکالنے لگا۔

"تم اسے کیوں یاد رکھنا چاہتے ہو؟"

"کیونکہ ہم اس کے بعد کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ کبھی بھی نہیں!"

اس کے اس جملے نے میرانڈا کو جیسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ اس نے غور سے روہن کو دیکھا۔ وہ کسی قدر افسردہ ہوتی جا رہی تھی لیکن روہن افسردہ نہ تھا۔ اس نے پیڈ پر ہاتھ مارا "چلیں بنائیں"

میرانڈا نے کمرے میں موجود چیزوں کا اسکیچ بنانے کی کوشش کی۔ صوفے، کرسیوں، ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون کو وہ جتنا اچھا بنا سکتی تھی اس نے بنایا۔ جب وہ یہ سب بنا رہی تھی تو روہن اس کی ڈرائنگ دیکھنے کے لیے اس کے ساتھ گویا لٹک رہا تھا۔ کبھی تو وہ اتنا آگے تک جھک جاتا کہ میرانڈا کو خود بھی دکھائی نہ دیتا کہ وہ کیا بنا رہی ہے۔ جب وہ یہ اسکیچ بنا چکی تو روہن اپنا چھوٹا سا گندمی ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر بولا: "اب مجھے"

میرانڈا نے پنسل اسے پکڑا دی۔

اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ "نہیں، اب میرا اسکیچ بنائیں!"

"میں نہیں بنا سکتی" وہ بولی "میرا بنایا ہوا اسکیچ تمہاری طرح نہیں لگے گا۔"

کھوئی کھوئی سی افسردگی روہن کے چہرے پہ پھیلنے لگی بالکل ایسے جیسے کافی دینے سے انکار پر اس کے چہرے پر چھا گئی

تھی۔

"پلیز!" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

میرنڈا نے اس کے چہرے کو، اس کے ماتھے پہ آئے گھنے بالوں کو پیڈ پہ اتارنے کی کوشش کی۔ وہ بالکل ساکت بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پہ مکمل سنجیدگی اور انجان سی اداسی طاری رہی۔ وہ مسلسل ایک ہی سمت نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ میرنڈا سوچ رہی تھی کہ کاش اس کی ڈرائنگ اچھی ہوتی، کاش وہ اس کا اسکیچ ایسا بنا سکتی جو اس کی صورت سے صحیح معنوں میں ملتا جلتا ہوتا۔ جب وہ لکیریں کھینچ رہی تھی تو اس کا ہاتھ بالکل اسی طرح انجان سمت میں حرکت کر رہا تھا جیسے کتابوں کی دکان میں اپنے نام کو بنگالی میں لکھتے ہوئے اسے محسوس ہوا تھا۔ اسکیچ بالکل بھی روہن کی طرح نہیں تھا۔ ابھی وہ ناک بنا ہی رہی تھی کہ روہن میز سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بور ہو رہا ہوں!" یہ اعلان کرتے ہوئے وہ میرنڈا کے شب خوابی کی کمرے کی طرف بڑھا۔ میرنڈا نے اسے کمرے کا دروازہ اور الماریوں کے پٹ کھولتے اور بند کرتے ہوئے سنا۔ جب وہ کمرے میں پہنچی تو وہ الماری میں گھسا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے بعد وہ باہر نکل آیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کے ہاتھ میں میرنڈا کے چاندی کے سے رنگ کا وہ فینسی لباس تھا جو اس نے دیو سے ملاقات کے بعد خریدا تھا۔

"یہ فرش پہ پڑا ہوا تھا۔"

"ہاں یہ اکثر ہینگر سے گر جاتا ہے۔"

روہن نے ایک نظر لباس کو پھر میرنڈا کو دیکھا۔ "اسے پہنیں!"

"کیا کہا؟"

"اسے پہن کے دکھائیں!"

میرنڈا کے لیے اس لباس کو پہننے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ خریداری کرتے ہوئے فٹنگ روم کے علاوہ اس نے اس لباس کو دوبارہ کبھی نہیں پہنا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ جب تک دیو کے ساتھ ہے اسے کبھی نہیں پہنے گی۔ وہ جانتی تھی کہ اب دیو کی بیوی کے واپس آنے کے بعد وہ کبھی دیو کے ساتھ ریسٹورنٹ نہیں جاسکے گی جہاں دیو میز کی دوسری طرف سے آکر اس کا ہاتھ چومے گا۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ اس کے اپارٹمنٹ میں ہی اتوار کے اتوار ملتے رہیں گے جہاں دیو نے ورزش کا لباس پہن رکھا ہو گا اور وہ جینز میں ملبوس رہے گی۔ اس نے روہن کے ہاتھ سے لباس لے لیا اور اسے جھٹک کر اس کی سلوٹیں درست کیں اگرچہ اس کا کپڑا ایسا تھا کہ سلوٹیں پڑنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ الماری کھول کر وہ کسی خالی ہینگر کو تلاش کرنے لگی۔

"پلیز! اسے پہنیں۔" روہن اچانک اس کے عین پیچھے آن کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا چہرہ میرانڈا کے ساتھ چمٹا دیا اور اپنے تیلے تیلے بازو اس کی کمر کے گرد ڈال کر کہنے لگا: "پلیز!"

"اچھا ٹھیک ہے" چھوٹے سے روہن کی مضبوط گرفت سے حیران ہو کر وہ بولی۔

وہ مسکرایا اور مطمئن سا ہو کر بستر کے ایک کونے پہ بیٹھ گیا۔

"آپ کو باہر جا کر میرے لباس تبدیل کرنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔" دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میرانڈا بولی۔ "میں جب پہن لوں گی تو باہر آ جاؤں گی۔"

"لیکن میری ماما تو میرے سامنے ہی کپڑے بدل لیتی ہیں!"

"اچھا! وہ ایسا کرتی ہیں؟"

روہن نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ تو کپڑے بدلنے کے بعد پہلے والے کپڑوں کو بھی نہیں اٹھاتیں۔ وہیں فرش پہ بستر کے ساتھ بکھرے ہوئے پڑے رہتے ہیں۔ ایک دن وہ میرے کمرے میں سوئی تھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ انہیں پاپا کے جانے بعد اب اپنے کمرے کی بجائے میرے کمرے میں سونا چھا لگتا ہے۔"

"میں آپ کی ماما نہیں ہوں۔" روہن کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے بستر سے اٹھاتے ہوئے میرانڈا بولی۔ جب اس نے کھڑے ہونے سے بھی انکار کر دیا تو میرانڈا نے اسے اٹھالیا۔ وہ اس کی توقع سے زیادہ بھاری تھا۔ وہ اپنی ٹانگیں اس کی کمر کے گرد لپیٹ کر اور اس کے سینے پہ سر رکھ کر اس کے ساتھ چٹ گیا۔ میرانڈا نے اسے باہر لاؤنج میں چھوڑا اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ احتیاطاً اس نے کمرے کی کنڈی بھی چڑھا دی۔ فینسی لباس پہننے کے بعد اس نے دیوار پہ ٹنگے قد آدم آئینے میں خود کو دیکھا۔ اس کی جرابیں اس کے لباس کے ساتھ لگا نہیں کھا رہی تھیں اس لیے اس نے دراز کھول کر اس میں سے جالی دار چست پاجامہ نکالا۔ پھر اس نے وہ جوتے پہنے جن کی ایڑیاں لمبی لیکن بکلی چھوٹے چھوٹے تھے۔ لباس کی پٹی نمازنجیریں اس کی ہنسل کی ہڈی پہ اسے اتنی ہلکی محسوس ہو رہی تھیں جیسے وہ کاغذ کی بنی ہوں۔ لباس کچھ ڈھیلا بھی تھا۔ وہ خود سے زپ نہیں کر سکتی تھی۔

روہن نے دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا تھا۔ "کیا اب میں اندر آ جاؤں؟"

میرانڈا نے دروازہ کھولا۔ وہ ہاتھوں میں اپنی تقویٰ ڈائری اٹھائے مونہ ہی مونہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ میرانڈا کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"لباس کی زپ چڑھانے میں مجھے تمہاری مدد چاہیے۔" وہ بستر کے کونے پہ بیٹھ گئی۔ روہن نے زپ کو کھینچ کر اوپر تک چڑھا دیا۔ میرانڈا کھڑی ہوئی اور گول گھوم کر اس نے اپنے لباس کا جائزہ لیا۔ روہن نے اپنی تقویٰ ڈائری نیچے رکھ

دی اور اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا: "آپ سیکیسی ہو!"

"کیا کہا تم نے؟"

"آپ سیکیسی ہو!"

میرانڈا ایک دم بیٹھ گئی۔ اگرچہ وہ جانتی تھی کہ ایک بچے کے لیے ان الفاظ کا کوئی مطلب نہیں لیکن پھر بھی اسے ایسے لگا جیسا اس کا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا ہے۔ غالباً روہن کے نزدیک ہر عورت ہی سیکیسی تھی۔ غالباً اس نے یہ لفظ ٹی وی دیکھتے ہوئے سنا ہو گا یا کسی میگزین کے سرورق پہ دیکھا ہو گا۔ میرانڈا کو آج بھی یاد تھا کہ میپوریم کے پل پہ کھڑے ہو کے دیو نے یہی الفاظ کہے تھے۔ اُس وقت اسے لگا تھا کہ وہ دیو کی بات سمجھ رہی ہے، اُس وقت اسے یہ الفاظ اتنے ناقابل فہم نہیں لگے تھے۔

سینے پہ ہاتھ باندھ کر میرانڈا نے بہت غور سے روہن کی آنکھوں میں دیکھا: "مجھے ایک بات تو بتاؤ۔" وہ خاموش تھا۔

"اس کا کیا مطلب ہے؟"

"کس کا؟"

"اس لفظ 'سیکیسی' کا کیا مطلب ہے؟"

وہ شرما کر نیچے دیکھنے لگا۔ "میں آپ کو نہیں بتا سکتا!"

"کیوں نہیں؟ کیوں نہیں بتا سکتے؟"

"یہ ایک راز ہے" اس نے اپنے ہونٹ اس زور سے بھیجنے لیے کہ اس کا نچلا ہونٹ سفید پڑ گیا۔

"مجھے یہ راز بتاؤ۔ میں جاننا چاہتی ہوں۔"

روہن میرانڈا کے ساتھ بستر کے کونے پہ بیٹھ گیا اور وہ میٹرس پہ اپنی ٹانگیں چلانے لگا۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس رہا تھا اور اس کا دبلا پتلا جسم یوں دہرا ہو رہا تھا جیسے کوئی اسے گد گدی کر رہا ہو۔

"مجھے بتاؤ۔" میرانڈا نے جھک کر اس کی دونوں ایڑیوں کو پکڑ لیا تاکہ وہ پاؤں نہ چلا سکے۔ روہن نے میرانڈا کی طرف

دیکھا۔ روہن کی آنکھیں اس وقت محض لکیریں نظر آرہی تھیں۔ اس نے اپنی ٹانگیں چھڑوانے کی کوشش کی تاکہ وہ

دوبارہ لاتیں چلانے کا شغل جاری رکھ سکے لیکن میرانڈا نے اسے مضبوطی سے دبا رکھا تھا۔ وہ پیچھے بستر پر گر گیا اور

اپنے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر مونہ پر رکھ لیا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولا: "اس کا مطلب ہے اس سے پیار کرنا جسے

آپ جانتے بھی نہیں ہو!"

میرانڈا کو روہن کے الفاظ اپنے رگ و پے میں ریگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اسے بالکل ایسا ہی محسوس ہوا جیسے دیو کے الفاظ سے ہوا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ اب اس کا جسم تپنے کی بجائے سن ہو گیا تھا۔ اس احساس نے اس کے ذہن میں دیسی دکان پر کھڑے اس لمحے کو تازہ کر دیا جب بن دیکھے اسے پہلی بار لگا تھا کہ مادھوری ڈکشت، جس سے دیو کی بیوی ملتی جلتی تھی، بہت خوبصورت ہوگی۔

"میرے پاپا نے بھی ایسا ہی کیا تھا" روہن اپنی رو میں جاری تھا۔ "وہ کسی انجان، کسی سیکیسی عورت کے ساتھ جہاز میں بیٹھے تھے اور اب وہ ماما کی بجائے اس عورت سے پیار کرتے ہیں!"

اس نے اپنے جوتے اتارے اور انہیں جوڑ کر فرش پہ رکھ دیا۔ پھر اس نے کمر اٹھایا اور اپنی تقویٰ ڈائری سمیت بستر میں گھس گیا۔ ایک منٹ بعد ہی اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور ڈائری اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ میرانڈا اسے سوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سانسوں کا اتار چڑھاؤ کمر کے زیر و بم سے نظر آ رہا تھا۔ وہ دیو کی طرح بارہ منٹ بعد نہیں جاگا۔ اس نے تب بھی آنکھیں نہیں کھولیں جب میرانڈا نے اپنا فینسی لباس اتار کر واپس جینز پہن لی، اس نے لمبی ایڑی والے جوتے الماری کے نیچے اور جالی دار پاجامہ واپس دراز میں رکھ دیے۔

جب وہ ہر چیز کو واپس اس کی جگہ رکھ چکی تو بستر پہ آکر بیٹھ گئی۔ اس نے جھک کر روہن کے چہرے کو قریب سے دیکھا۔ رس کیک کے کچھ ذرات ابھی تک اس کے ہونٹوں کے کناروں پہ اٹکے ہوئے تھے۔ میرانڈا نے اس کی ڈائری اٹھالی اور بے خیالی میں اس کے ورق ایک ایک کر کے پلٹنے لگی۔ صفحے پلٹتے پلٹتے وہ خیالوں کی رو میں بہہ نکلی۔ اس نے چشم تصور سے روہن کو مونٹریال میں اپنے گھر میں دیکھا جہاں وہ اپنے ماں باپ کو دن رات لڑتے ہوئے دیکھتا ہوگا۔ "کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟" اس کی ماں اس کے باپ سے چیخ کے پوچھتی ہوگی۔ اس نے پچھلے کئی ہفتوں سے اپنا لباس تک تبدیل نہیں کیا ہوگا اور اس کا خوبصورت چہرہ غم و غصے اور نفرت سے بگڑ رہا ہوگا۔ "کیا وہ بہت سیکیسی ہے؟" اس کے باپ نے پہلے پہل اس سے انکار کیا ہوگا اور بات بدلنے کی کوشش کی ہوگی۔ "مجھے بتاؤ۔۔۔ مجھے بتاؤ کیا وہ بہت سیکیسی ہے؟" روہن کی ماں گلا پھاڑ کر چیخی ہوگی۔ آخر کار اس کے باپ نے تسلیم کر لیا ہوگا کہ وہ عورت واقعی سیکیسی ہے اور تب روہن کی ماں پھوٹ پھوٹ کر رو دی ہوگی۔ اپنے بستر پہ جس کے چاروں طرف کپڑے بکھرے پڑے ہوں گے وہ سسکتی بلکتی رہی ہوگی اور اس کی آنکھیں کسی موٹے سے مینڈک کی طرح سوج گئی ہوں گی۔ "تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟" سسکتے ہوئے اس نے پوچھا ہوگا "تم کیسے اس عورت سے محبت کر سکتے ہو جسے تم جانتے تک نہیں؟"

جب میرانڈا نے یہ سب تصور کیا تو اس کی اپنی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ اس روز میپوریم میں اسے ایسا لگا تھا

جیسے دنیا کا ہر ملک اتنا پاس ہے کہ اسے چھو کے دیکھا جاسکتا ہے اور اسے دیو کی آواز شیشے کی دیواروں سے ٹکرا کر اکر کے خود تک آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس روز میپوریم کے پل پہ دیو سے تیس فٹ دور کھڑے ہو کر بھی اس کی آواز اسے اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس سرگوشی کی حدت وہ کئی دنوں تک اپنے رگ و پے میں محسوس کرتی رہی تھی۔ لیکن اب وہ سرگوشی اس کے دل و دماغ کو ہمارہی تھی۔ اب وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ خود کو روکنا چاہتی تھی پر روک نہیں پار رہی تھی۔ روہن ابھی تک سو رہا تھا۔ میرانڈا نے روتے روتے سوچا یہ معصوم اس سب کا عادی ہو چکا ہے۔ یہ سوتے ہوئے اپنے سرہانے کسی روتی بلکتی عورت کی سسکیوں کا عادی ہو چکا ہے۔

اتوار کے روز دیو نے میرانڈا کو فون کر کے بتایا کہ وہ رستے پہ ہے اور اس کی طرف آ رہا ہے۔ "میں تمہارے پاس تقریباً دو بجے تک پہنچ جاؤں گا۔"

اس وقت میرانڈا ٹی وی پہ کھانا پکانے کا ایک شو دیکھ رہی تھی جس میں ایک عورت سیبوں کی ایک قطار کی طرف اشارہ کر کے بتا رہی تھی کہ ان میں سے کون سا سیب پکانے کے لیے بہترین ہے۔ "تم آج نہ آؤ"

"کیوں؟ خیریت ہے؟"

"مجھے نزلے کی شکایت ہے۔" میرانڈا نے جھوٹ بولا۔ تاہم یہ اتنا جھوٹ بھی نہ تھا۔ رونے سے اسے اپنا گلا بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ "میں صبح سے بستر پہ پڑی ہوں۔"

"تمہارا گلا خراب لگ رہا ہے" ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا: "تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"نہیں میں ٹھیک ہوں"

"قبوہ اور یخنی وغیرہ زیادہ پیو"

"دیو؟"

"جی! میرانڈا!"

"کیا تمہیں وہ دن یاد ہے جب ہم میپوریم گئے تھے؟"

"ہاں! بالکل یاد ہے"

"تمہیں یاد ہے ہم نے کیسے ایک دوسرے کو سرگوشیاں کی تھیں؟"

"ہاں مجھے یاد ہے" دیو نے ہنستے ہوئے سرگوشی کی۔

"کیا تمہیں یاد ہے تم نے کیا کہا تھا؟"

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ "چلو تمہاری اسی پسندیدہ جگہ چلتے ہیں!"

وہ آہستہ سے ہنس دیا۔ "اگلا اتوار ٹھیک رہے گا؟"

ایک روز قبل جب وہ سوئے ہوئے روہن کے پاس بیٹھی رو رہی تھی تو وہ مسلسل یہ سوچ رہی تھی کہ وہ کچھ بھی بھلا نہیں پائے گی یہاں تک کہ بنگالی میں لکھا ہوا اس کا نام کیسا دکھتا ہے یہ بھی اسے ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ روتے روتے روہن کے ساتھ ہی سو گئی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ پاس بیٹھا کا نو مسٹ کے اس شمارے پہ جہاز کی ڈرائنگ بنا رہا تھا جو میرانڈا نے بیڈ کے نیچے چھپا کے رکھا ہوا تھا۔ "دیو جی متر اکون ہیں؟" شمارے پہ چپکے ہوئے پتے پہ نظر ڈالتے ہوئے روہن نے اس سے پوچھا تھا؟

میرانڈا نے تصور کیا کہ دیو ورزش کا لباس پہنے جو گنگ کے جوتے چڑھائے فون پہ اس سے بات کرتے ہوئے ہنس رہا ہے۔ ابھی ایک پل کے بعد وہ نیچے اپنی بیوی کے پاس جائے گا اور اسے بتائے گا کہ وہ دوڑنے کے لیے نہیں جا رہا کیونکہ ایکسرسائز کرتے ہوئے اس کے پٹھے کھچ گئے ہیں۔ پھر وہ صوفے پہ دراز ہو کے اخبار پڑھنے لگے گا۔ اپنی موجودہ کیفیت کے باوجود میرانڈا کے دل میں ابھی دیو کی طلب باقی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس سے ایک یا شاید دو اتوار مزید ملے گی۔ تب وہ اسے وہ سب بتائے گی جو اس نے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ وہ اسے بتائے گی کہ ان دونوں کا تعلق نہ صرف اس کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ دیو کی بیوی کے ساتھ بھی زیادتی ہے اور یہ کہ وہ دونوں عورتیں اس سے بہتر رویے کی حق دار ہیں۔ وہ اسے بتائے گی کہ اب اس تعلق کو مزید قائم رکھنے کا کوئی مقصد باقی نہیں بچا۔

لیکن اگلے اتوار کو برف باری شروع ہو گئی اور یہ اتنی شدید تھی کہ دیو جاگنگ کا بہانہ کر کے گھر سے باہر نہ نکل پایا۔ اس سے اگلے اتوار کو اگرچہ گلیوں میں برف پگھل چکی تھی لیکن اس دن میرانڈا نے لکشی کے ساتھ فلم دیکھنے کے لیے باہر جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا اور جب اپنے اس پروگرام کے بارے میں اس نے فون پہ دیو کو بتایا تو دیو نے اسے کینسل کرنے کی کوئی فرمائش نہیں کی۔ تیسرے اتوار کو وہ صبح جلدی اٹھ کر چہل قدمی کرنے باہر نکل پڑی۔ موسم اگرچہ بخ تھا لیکن سورج نکل آیا تھا اس لیے وہ کا من ویلتھ ایونیو پہ چلتی رہی۔ وہ ان ریسٹورانوں کے پاس سے گزری جہاں کبھی دیو نے اسے بوسے دیے تھے۔ پھر وہ چلتے چلتے کر سچٹین سائنس سنٹر کے سامنے جا نکلی۔ میپوریم ابھی بند تھا لیکن اس نے نزدیکی پلازے سے کافی کا ایک کپ لیا اور چرچ کے سامنے بیچ پر آ بیٹھی۔ وہ دیر تک اس کے دیو قامت ستونوں، اس کے عظیم الشان گنبد اور شہر پر پھیلے صاف، نیلے آسمان پہ نظریں جمائیں کھوئی رہی۔

مسز سین کا گھر

ایلیٹ کو اب مسز سین کے گھر جاتے ہوئے لگ بھگ ایک ماہ ہونے کو آیا تھا۔ ستمبر میں اسکول کھلنے کے بعد سے ہی وہ ان کے ہاں جا رہا تھا۔ پچھلے سال اس کی دیکھ بھال کی ذمہ دار ایک یونیورسٹی طالبہ ایبی کے سر تھی۔ چھائیوں سے اٹے ہوئے چہرے والی دھان پان سی ایبی ہر وقت کتابوں سے چمٹی رہتی تھی۔ ان کتابوں کے سرورق تصویروں سے عاری ہوتے تھے اس لیے ایلیٹ کو ان میں ایبی کی اس قدر دلچسپی کی کبھی سمجھ نہیں آئی۔ ایبی کو گوشت سے چڑ تھی اس لیے وہ ایلیٹ کے لیے کوئی بھی ایسی ڈش بنانے پہ آمادہ نہ ہوتی تھی جس میں گوشت کا استعمال کیا جائے۔ ایبی سے قبل ایلیٹ کی دیکھ بھال ایک بوڑھی خاتون مسز لنڈن کے ذمہ تھی۔ جب وہ ہر دوپہر اسکول سے گھر لوٹتا تو مسز لنڈن اس کا خوش دلی سے استقبال کرتیں لیکن ان کی یہ عادت بری تھی کہ وہ ہر وقت اپنے تھر موس سے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے اخبار کھولے لفظی پہیلیاں سلجھانے میں مگن رہتی تھیں اور ایلیٹ کی طرف ان کا دھیان کم ہی ہوتا تھا۔ ایلیٹ بے چارہ خود ہی کھیتا رہتا اور کھیل کھیل کر تھک جاتا تو خود ہی سو جاتا۔ ایبی اپنی ڈگری مکمل کرنے کے بعد ایک دوسری یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے بعد شہر چھوڑ گئی تھی جبکہ مسز لنڈن کو ایلیٹ کی امی نے یہ انکشاف ہونے کے بعد خود نکال باہر کیا تھا کہ ان کے تھر موس میں کافی کی بجائے وہسکی بھری ہوتی تھی۔

مسز سین سے ان کا پہلا تعارف ایک دو سٹری اشتہار کے ذریعے ہوا۔ سپر مارکیٹ کے داخلے پہ ایک انڈیکس کارڈ پہ خوش خط لکھائی میں درج تھا: "پروفیسر کی ذمہ دار اور نرم خوبی آپ کے بچے کی اپنے گھر میں دیکھ بھال کے لیے دستیاب ہے۔" دیے گئے نمبر پہ فون کر کے ایلیٹ کی امی نے مسز سین کو بتایا کہ اس سے پہلے ایلیٹ کی دیکھ بھال کرنے والی سب آیا ان کے گھر آیا کرتی تھیں۔ "دیکھیں ایلیٹ کی عمر اب گیارہ سال ہے۔ وہ اپنا کھانا پینا اور کھیلنا کو دنا خود کر سکتا ہے، میں بس یہ چاہتی ہوں کہ گھر میں کوئی بڑا موجود رہے تاکہ خدا نخواستہ اگر کوئی ایمر جنسی ہو جائے تو اسے سنبھال سکے۔" لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مسز سین ڈرائیونگ سے یکسر نا بلد تھیں اس لیے ان کے گھر آنے سے قاصر تھیں۔

جب وہ پہلی دفعہ مسز سین سے ملنے ان کے گھر پہنچے تو انہوں نے تعارف ہوتے ہی کہا تھا: "آپ خود دیکھ لیں ہمارا گھر صاف ستھرا اور بچوں کے لیے بالکل محفوظ ہے۔" یونیورسٹی ملازمین کے لیے بنایا گیا یہ اپارٹمنٹ کیمپس کے نواح میں واقع تھا۔ عمارت کی لابی میں نصب چوکور خانوں والی ہلکی سرخ ٹائلیں بھدی لگ رہی تھیں اور دیوار کے ساتھ قطار میں میل بکس کھڑے تھے جن پہ کاغذی ٹیپ چپکا کر متعلقہ اپارٹمنٹ کے نمبر لکھے گئے تھے۔ اپارٹمنٹ کے اندر

بچھی ناشپاتی کی سی رنگت والی قالین بالکل نئی اور قیمتی تھی اور اس پر ویکيوم کليئر سے چھن کر آنے والی روشنی کی پرچھائیں گویا منجمد ہو گئی تھی۔ صوفوں اور کرسیوں کے سامنے مختلف رنگوں کے قالینوں کے بچے کچھ بے جوڑ ٹکڑے یوں پڑے تھے جیسے بیٹھنے والوں کے قدموں تلے بچھ کر خیر مقدم کے لیے بے تاب ہوں۔ صوفوں کے کے اطراف میں رکھے ہوئے لیمپوں کے شیڈ ڈرموں کی طرح گول تھے اور ان سے پلاسٹک شیٹیں ابھی تک نہیں اتاری گئی تھیں۔ ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون سیٹ بھی پیلے رنگ کے آرائشی حاشیوں والے کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ میز پر ایک طشتری میں سرمئی رنگ کی مخروطی چینک میں چائے دھری تھی اور ساتھ مگ اور بسکٹ پڑے تھے۔ گھر میں مسٹر سین بھی موجود تھے جو گٹھے ہوئے جسم کے نسبتاً کوتاہ قامت انسان تھے۔ ان کی آنکھیں کچھ باہر کو ابھری ہوئی تھیں اور انہوں نے کالے رنگ کا مستطیل فریم والا چشمہ چڑھا رکھا تھا۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے دونوں ہاتھوں سے مگ کو تھامے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ گھونٹ بھرنے کے بعد بھی وہ مگ کو ہونٹوں کے پاس ہی رہنے دیتے تاکہ اگلے گھونٹ کے لیے زیادہ تردد نہ کرنا پڑے۔ مسٹر اور مسز سین دونوں نے جوتوں کی بجائے پاؤں میں ربڑ کے نرم چپل پہن رکھے تھے۔ ایلین نے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہوئے نوٹ کیا تھا کہ داخلی دروازے کے ساتھ ایک چھوٹی سی کتابوں والی الماری میں جوتوں کے بہت سے جوڑے رکھے ہوئے تھے۔

"مسٹر سین یونیورسٹی میں ریاضی پڑھاتے ہیں۔" مسز سین نے تعارف کرواتے ہوئے یوں کہا تھا جیسے وہ دونوں میاں بیوی کی بجائے کوئی دور کے واقف کار ہوں۔ مسز سین تیس کے آس پاس تھیں۔ اگرچہ ان کے دانتوں میں ایک چھوٹا سا خلا اور ٹھوڑی پہ کیل مہاسوں کے مدہم نشان موجود تھے لیکن ان کی آنکھیں بڑی جاندار تھیں۔ گھنی لیکن نوک دار بھنوں تلے ان کے پپوٹوں پہ آئی شیڈ آنکھوں کی حدوں سے باہر تک پھیل کر انہیں دلکش بنا رہا تھا۔ ان کے ہونٹوں پہ چمکتی گلابی لپ اسٹک بھی اپنی حدوں سے کچھ باہر بھٹک آئی تھی۔ انہوں نے جھلمل جھلمل کرتی سفید ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی جس پہ نارنجی رنگ کے خمدار پتوں والے ڈیزائن بنے ہوئے تھے تاہم ان کا یہ لباس اگست کی اس بوند باندی سے بوجھل خاموش دوپہر کی بجائے شام کی کسی پرولق پارٹی کے لیے زیادہ موزوں لگ رہا تھا۔

لیکن ایلین کا خیال تھا کہ مسز سین کی بجائے یہ اس کی ماں تھی جس کا لباس زیادہ بے ڈھب لگ رہا تھا۔ گھٹنوں سے اوپر خاکستری جامے اور ڈھیلے ڈھالے کینوس کے جوتوں میں وہ اس گھر میں بالکل بے جوڑ لگ رہی تھی۔ اس کے مختصر لباس کے مقابلے میں اس کے ترشے ہوئے بال، جن کی رنگت اس کے جامے سے لگا کھارہی تھی، کچھ زیادہ طویل اور کچھ زیادہ معتبر دکھائی دے رہے تھے۔ اس کمرے میں جہاں ہر چیز کو اس قدر احتیاط سے ڈھانپ کر رکھا گیا تھا

اس کے شیو کی ہوئی ٹانگیں اور برہنہ زانو کچھ زیادہ ہی برہنہ لگ رہے تھے۔

ایلیٹ کی ماں اپنے ساتھ ایک چھوٹا اسٹینوپید^{۵۱} لائی تھی اور مسز سین سے پے در پے سوالات کر کے ان کے جوابات اس میں لکھتی جا رہی تھی۔ جب بھی مسز سین بسکٹوں کی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتیں وہ بسکٹ لینے سے انکار کر دیتی اور اپنے سوال جواب کا سلسلہ شد و مد سے جاری رکھتی۔ کیا اپارٹمنٹ میں ایلیٹ کے علاوہ اور بچے بھی ہوں گے جن کی آپ دیکھ بھال کریں گی؟ کیا اس سے پہلے آپ نے کسی بچے کی دیکھ بھال کی ہے؟ امریکہ میں رہتے ہوئے آپ کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟ اس کے پاس سوالوں کی ایک لمبی فہرست تھی۔ سب سے زیادہ اسے اس امر پر تشویش ہو رہی تھی کہ مسز سین کو ڈرائیونگ نہیں آتی۔ خود وہ یہاں سے شمال کی طرف پچاس میل دور ایک دفتر میں کام کرتی تھی اور ایلیٹ کے باپ کے بارے میں جو آخری اطلاع اس کے پاس تھی اس کے مطابق وہ یہاں سے کوئی دو ہزار میل دور مغرب کی طرف رہ رہا تھا۔

"میں اسے ڈرائیونگ کی تربیت دے رہا ہوں۔" مسٹر سین نے اپنا منہ میز پر رکھتے ہوئے اس کی تشویش کچھ کم کرنے کی کوشش کی۔ ساری گفت و شنید میں مسٹر سین نے پہلی دفعہ مونہ کھولا تھا۔ "میرے اندازے کے مطابق دسمبر تک اس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہو گا۔"

"کیا واقعی؟" ایلیٹ کی ماں اپنے پیڈ میں یہ معلومات بھی درج کرتے ہوئے بولی۔

"جی ہاں! میں سیکھ رہی ہوں۔" مسز سین بولیں۔ "لیکن میں ڈرائیونگ سیکھنے میں کچھ سست ہوں۔ پیچھے گھر میں تو ہمارے پاس اپنا ڈرائیور ہوتا تھا اس لیے اس بکھیڑے میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

"آپ کا مطلب ہے شو فر؟"

مسز سین نے اس سوال پر وضاحت طلب نظروں سے مسٹر سین کی طرف دیکھا جنہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایلیٹ کی ماں نے بھی سر ہلاتے ہوئے کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ "بس یہی کچھ ہے جو آپ مجھے بتانا چاہیں گی؟

---- ویسے پیچھے کہاں؟ انڈیا میں؟"

"جی ہاں!" مسز سین نے جواب دیا۔ انڈیا کے ذکر سے جیسے ان کے اندر توانائی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ انہوں نے اپنی ساڑھی کے کنارے کو اپنے سینے پر درست کیا اور ایلیٹ کی ماں کی اقتدا میں کمرے کی چیزوں پر نگاہ دوڑائی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے لیمپ شیڈ، چائے کی چینک اور نیچے قالین پر منجمد سائے میں انہیں کچھ ایسا دکھائی دے گیا ہو جو باقیوں کی نظروں سے اوجھل ہو۔ "جی ہاں یہی سب کچھ ہے۔"

ایلیٹ کو ہر روز اسکول سے لوٹ کے مسز سین کے گھر جانے کا معمول بالکل بھی برا نہیں لگا۔ ستمبر تک ویسے بھی وہ

چھوٹا سا ساحلی گھر جس میں ایلین اور اس کی ماں سارا سال رہتے تھے اس قدر سرد ہو چکا تھا کہ کھڑکیوں پہ پلاسٹک شیٹ اور ہیر ڈرائر نصب کرنے کے باوجود انہیں جب بھی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانا ہوتا وہ ہیٹر کو ساتھ ساتھ اٹھائے پھرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس موسم میں ساحل بھی اس قدر ویران، اجڑا پجڑا اور بے رونق ہو جاتا تھا کہ ایلین کا تنہا اس پہ کھیلنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ آس پڑوس میں کوئی اس کا ہم عمر بچہ بھی نہ تھا۔ آخری پڑوسی جو ستمبر میں لیبر ڈے^{۵۲} کے بعد تک یہاں رکے رہے تھے ایک نوجوان جوڑا تھا جن کے کوئی بچہ نہ تھے۔ ایلین کو اب ساحل سے سیپیوں کے خول چن کر اپنی ٹوکری میں اکٹھا کرنے اور سمندر کی اس کائی کو چھونے میں بھی کچھ خاص دلچسپی نہیں رہی تھی جو ساحل کی ریت پہ زمر کی طرح دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ گھر اور گھر سے باہر کی اس بے بسی کے مقابلے میں مسز سین کا اپارٹمنٹ گرم بلکہ بعض اوقات کچھ زیادہ ہی گرم ہوتا تھا۔ اس میں سارا دن ریڈی ایٹر چلتے رہتے اور ان سے کسی پریشکر کی طرح سسینے کی آوازیں بلند ہوتی رہتیں۔ پہلی چیز جو ایلین نے مسز سین کے گھر داخل ہوتے ہی سیکھی وہ یہ تھی کہ اسے دروازے میں ہی اپنے بوٹ اتار کر کتابوں کی چھوٹی سی الماری میں مسز سین کی جوتوں کی قطار کے ساتھ رکھ دینے ہیں۔ اس الماری میں رکھی مسز سین کے رنگ برنگی چپلوں کے جوڑوں کی خاص بات یہ تھی کہ ان کے تلوے کسی گتے کی طرح پتلے تھے اور ان میں انگوٹھا ڈالنے کے لیے چمڑے کے پتلے تیلے حلقے بنے ہوئے تھے۔

ایلین کو خاص طور پر مسز سین کو سبزیاں اور پھل کاٹتے ہوئے دیکھنا بہت دلچسپ لگا۔ جب وہ لونگ روم کے فرش پہ اخبار بچھا کر ان پہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتیں اور کٹناٹ چیزیں کاٹتیں تو ایلین اس سرگرمی سے بھرپور لطف لیتا۔ روایتی چاقو کی بجائے مسز سین ایک ایسی چھری استعمال کرتی تھیں جس کا لمبا چوڑا پھل کسی ایسے بحری جہاز کے اگلے حصے کی طرح خمیدہ تھا جسے قدیم بحری قذاق پر اسرار سمندر کی پہنائیوں میں دوڑاتے پھر رہے ہوں۔ پھل کی طولانی کے مقابلے میں اس کا لکڑی کا دستہ بہت چھوٹا تھا اور اس کی سٹیل پہ نقری کی بجائے سیاہ رنگ غالب تھا۔ اس کی دھار بھی دندانے دار تھی اور مسز سین نے ایلین کو اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ وہ اس دھار کی مدد سے سبزیوں کو کدو کش کرتی ہیں۔ ہر دوپہر وہ اس خمیدہ پھل والی چھری کو لے کر بیٹھ جاتیں اور سبزیوں پہ پے درپے وار کر کے ان کو پارہ پارہ کر دیتیں۔ گو بھی، بند گو بھی، کدو اور پیٹھے ان کا ایک وار بھی نہ سہہ پاتے۔ ان کے پہلے وار سے سبزی کے دو حصے اور دوسرے سے چار حصے ہو جاتے۔ پھر وہ ان حصوں کے مزید چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتیں۔ وہ کسی بھی آلو کو محض چند سیکنڈ میں چھیل سکتی تھیں۔ کبھی وہ آلتی پالتی مارے بیٹھی ہوتیں اور کبھی ٹانگیں پھیلا کر اپنی اس سلطنت میں براجمان ہوتیں۔ ان کے ارد گرد رنگ برنگے برتنوں میں پانی بھرا ہوتا اور وہ اپنی سبزیوں کو کانٹ چھانٹ کر ان میں

ڈبوتی جاتیں۔

جب وہ یہ سب امور سرانجام دے رہی ہوتیں تو ان کی ایک نظر ٹیلی ویژن پر اور دوسری ایلپٹ پر ہوتی تھی۔ سبزیوں کی طرف دیکھنے کی انہیں بالکل بھی ضرورت نہیں پڑتی تھی کیونکہ وہ بن دیکھے سبزیاں چھیلنے اور کاٹنے کے ہنر میں تاک تھیں۔ ایلپٹ کو اس دوران ادھر ادھر پھرنے کی قطعاً اجازت نہیں تھی۔ وہ جب بھی اپنی جگہ سے سرکنے کی کوشش کرتا تو مسز سین صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتیں "بیٹھ جاؤ، نیچے بیٹھ جاؤ، مجھے بس اب دو منٹ اور لگیں گے۔" یہ صوفہ ہمیشہ ایک سبز اور سیاہ رنگ کے ایسے پلنگ پوش سے ڈھکا رہتا تھا جس پہ ہاتھیوں کی تصویریں پرنٹ کی گئی تھیں۔ قطار اندر قطار چلتی ان ہاتھیوں کی پشت پہ پالکیاں دھری ہوئی تھیں۔ مسز سین کا یہ سبزی کش معمول لگ بھگ ایک گھنٹے پر محیط ہوتا تھا اور اس دوران ایلپٹ کو مصروف رکھنے کے لیے وہ اسے اخبار کا وہ حصہ پکڑا دیتیں جس پہ مزاحیہ کارٹون بنے ہوتے تھے یا اسے کریم والے بسکٹ دے دیتیں۔ بعض اوقات ایلپٹ کی توجہ مرکوز رکھنے کے لیے وہ اسے رنگ برنگی آئس کریم یا گاجروں کی پھانکیں بھی پکڑا دیتی تھیں۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو ایلپٹ کو بٹھا کر اس کے ارد گرد سی کھینچ دیتیں تاکہ وہ ایک جگہ ٹک کر بیٹھا رہے اور ادھر ادھر نہ بھٹکے۔ تاہم ایک دفعہ انہوں نے اپنے اس اصول کو خود توڑتے ہوئے ایلپٹ کو باورچی خانے سے کچھ لانے کے لیے بھیجا تھا کیونکہ وہ کشتہ سبزیوں کے ایسے انبار میں گھری بیٹھی تھیں کہ اٹھنے میں انہیں دقت ہو رہی تھی۔ "ایلپٹ! فریج کے ساتھ والی الماری میں ایک پلاسٹک کا ڈونگار کھا ہے جس میں یہ ساری پالک آجائے گی وہ پکڑا نا ذرا مجھے۔" جب ایلپٹ ڈونگا لے کر آ رہا تھا تو وہ بولیں: "احتیاط سے، بہت احتیاط سے، بس اسے یہاں کافی کی میز پر رکھ دو، میرا ہاتھ پہنچ رہا ہے میں خود پکڑ لیتی ہوں۔"

مسز سین سبزیوں کا کشت و خوں کرنے والی یہ مرد میدان چھری خاص ہندوستان سے لے کر آئی تھیں اور ان کی باتوں سے ایسا لگتا تھا جیسا وہاں ہر گھر میں ایک عدد ایسی چھری پائی جاتی ہے۔ "جب کبھی ہمارے خاندان میں کوئی شادی ہوتی ہے" ایلپٹ کو ایک دن انہوں نے بتایا تھا "یا کوئی بڑی تقریب منعقد ہونی ہو تو میری اماں شام کو سارے محلے کی عورتوں کو اپنی اپنی چھریوں کے ساتھ ہمارے گھر آنے کی دعوت دے بھیجتی ہیں۔ رات بھر یہ سب عورتیں ہماری چھت پہ ایک لمبے چوڑے دائرے میں بیٹھ کر ہنستی کھیلتی، خوش گپیاں کرتی سیروں کے حساب سے سبزی کاٹ کر رکھ دیتی ہیں۔" صوفے پہ بیٹھے ایلپٹ کو مسز سین اپنے ارد گرد موجود کٹے ہوئے کھیروں، بیٹنگن اور پیاز کے چھلکوں پہ یوں چھائی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں جیسے وہ ان کی حفاظت کرنے پہ مامور ہوں۔ "ایسی راتوں میں محلے دار عورتوں کی ان خوش گپیوں کے دوران سونا نا ممکن ہوتا ہے۔" انہوں نے ذرا توقف کر کے کھڑکی سے جھانکتے

دیودار کے پیڑ پر نگاہ ڈالی اور پھر گویا ہوئیں: "یہاں اس سنسان جگہ، جہاں مجھے مسٹر سین نے لا کے رکھا ہے، میں اکثر اس لیے نہیں سو پاتی کیونکہ اس قدر خاموشی میری جان کھاتی ہے۔"

ایک دن مرغی کے گوشت سے پیلی پیلی چربی کی تھیں کھینچ تان کر اتارتے ہوئے مسز سین نے ایلٹ سے ایک عجیب سوال کیا۔ اس روز بھی وہ اپنے مخصوص انداز میں آلتی پالتی مارے بیٹھی تھیں۔ مرغی کی رانوں اور ٹانگوں کی بوٹیاں الگ کرتے ہوئے ان کی سونے کی چوڑیاں زور زور سے ایک دوسرے سے بچ رہی تھیں۔ ان کے بازو سرخ ہو رہے تھے اور ان کی تیز سانسوں کی آواز ایلٹ تک بھی پہنچ رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں گوشت تھامے وہ ایک لمحے کے لیے رک گئیں اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں۔ ان کی انگلیوں پہ چربی اور گوشت کے ریشے چپکے ہوئے تھے۔

"ایلٹ! اگر میں ابھی زور زور سے گلا پھاڑ کے چیخنا شروع کر دوں تو کیا میری آواز سن کر کوئی آئے گا؟"

"مسز سین! ہوا کیا ہے؟ آپ کیوں چیخیں گی؟"

"کچھ نہیں ہوا۔ میں صرف پوچھ رہی ہوں کہ کیا کوئی آئے گا؟"

ایلٹ نے کندھے اچکائے۔ "ہو سکتا ہے کوئی آجائے!"

"گھر میں جب کسی کو متوجہ کرنا ہوتا تو ہم یہی کرتے ہیں۔ وہاں ہر ایک کے پاس ٹیلی فون نہیں ہے۔ بس صرف زور سے آواز لگانی پڑتی ہے۔ اپنی کوئی خبر، کوئی دکھ یا کوئی خوشی بھی بانٹنی ہو تو صرف گلا پھاڑ کے ایک نعرہ لگانا پڑتا ہے اور چند لمحوں میں سارا محلہ اکٹھا ہو جاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب آپ کی خوشی یا غم میں شریک ہو جاتے ہیں۔"

اس وقت تک ایلٹ سمجھ چکا تھا کہ جب مسز سین گھر کہتی ہیں تو اس کا مطلب یہ اپارٹمنٹ نہیں ہوتا جس میں وہ سارا دن بیٹھ کر سبزیاں کاٹتی رہتی ہیں بلکہ اس سے مراد ان کا ہندوستان والا گھر ہے۔ ایلٹ نے اپنے گھر کے بارے میں سوچا جو یہاں سے پانچ میل دور تھا اور اسے وہ نیا شادی شدہ پڑوسی جوڑا یاد آیا جو شام کو ساحل پہ جاگنگ کرتے ہوئے کبھی کبھار ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا کرتا تھا۔ لیبر ڈے پہ ان کے ہاں کوئی پارٹی رکھی گئی تھی۔ گھر کے سامنے برآمدے میں جمع مہمان کھانے اڑانے اور شراب لٹھہانے میں مگن تھے اور ان کے جاندار قہقہوں کا شور سمندر کی تھکی ماندی لہروں کی پڑمردہ آوازوں پہ غالب آ رہا تھا۔ اس پارٹی میں ایلٹ اور اس کی ماں کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ یہ دن ان چند دنوں میں سے ایک تھا جب اس کی ماں خلاف معمول چھٹی پر ہونے کی وجہ سے گھر پر تھی لیکن وہ دونوں کہیں باہر نہیں گئے۔ اس کی ماں نے پہلے کپڑے دھوئے، پھر چیک بک میں اپنے پیسوں کا حساب کتاب برابر کیا اور پھر ایلٹ کی مدد سے کار کو اندر سے ویکووم سے صاف کیا۔ ایلٹ نے ماں کو تجویز دی تھی کہ وہ چند میل دور کارواش سروس سے اپنی گاڑی دھلوا لیتے ہیں جہاں وہ اکثر جایا کرتے تھے اور جہاں ایلٹ کو گاڑی کے اندر بیٹھ کر بند شیشوں

سے جھاگ اور بڑے بڑے برشوں کی مدد سے گاڑی کو دھلتے دیکھنا اچھا لگتا تھا لیکن اس کی ماں نے یہ کہہ کر اس تجویز کو رد کر دیا تھا کہ وہ بہت تھکی ہوئی ہے اس لیے انہوں نے گھر پہ ہی پانی کے پائپ کی مدد سے گاڑی دھونے پر اکتفا کیا تھا۔ شام ہوتے ہی جب پڑوسیوں کی پارٹی میں ناچ گانا شروع ہوا تو ایلین کی ماں نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ان کا نمبر نکالا اور انہیں فون کر کے کہا تھا کہ وہ موسیقی کی آواز کو ذرا دھیمہ رکھیں۔

"ہو سکتا ہے وہ آپ کی آواز سن کر آجائیں" ایلین نے خیالوں کی دنیا سے واپس آتے ہوئے مسز سین کی طرف دیکھ کر کہا۔ "لیکن وہ آپ کی خوشی یا غم بانٹنے کی بجائے یہ شکایت کریں گے کہ آپ بہت زیادہ شور کر رہی ہیں۔" ایلین جہاں بیٹھا تھا وہاں سے مسز سین کے وجود سے اٹھتی کافوری گولیوں^{۵۳} اور زیرے کی عجیب سی مہک محسوس کر سکتا تھا۔ اسے مسز سین کی گندھی ہوئی چوٹیوں کے درمیان سیدھی مانگ میں بھرا ہوا سیندر تمتماتا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پہلے پہل جب ایلین نے ان کی مانگ میں سیندر دیکھا تو وہ سمجھا کہ شاید ان کے سر پہ چوٹ لگی ہے یا کسی چیز نے کاٹ لیا ہے لیکن پھر ایک دن اس نے انہیں واش روم کے آئینے کے سامنے کھڑے دیکھا۔ وہ مرے کے ایک چھوٹے سے مرتبان سے سرخ رنگ کا پاؤڈر نکال نکال کر بڑی نفاست سے اپنی مانگ میں لگا رہی تھیں۔ جب وہ اپنی بھنوں کے درمیان ایک چپٹی پن کی مدد سے سرخ نشان لگانے لگیں تو اس پاؤڈر کے کچھ ذرات ان کی ناک پہ آ گئے۔ "یہ سرخ پاؤڈر سیندر ہے، مجھے یہ ہر روز لگانا ہوتا ہے۔" انہوں نے ایلین کے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے اسے سمجھایا تھا۔ "جب تک میں سہاگن ہوں مجھے یہ لگانا ہوگا، یہ ہماری ریت ہے۔" "آپ کا مطلب ہے جس طرح شادی کی انگوٹھی ہو؟"

"ہاں بالکل ایلین! شادی کی انگوٹھی ہی کی طرح! لیکن شادی کی انگوٹھی اور اس میں فرق یہ ہے کہ برتن دھوتے ہوئے ہمیں یہ خوف نہیں ہوتا کہ انگوٹھی کی طرح کہیں یہ بھی پانی میں بہہ نہ جائے!"

ہر شام جب ایلین کی ماں چھ بج کر بیس منٹ پہ اسے لینے پہنچتی تو مسز سین اس وقت تک اپنی دن بھر کی کشتہ سبزی کے جملہ شواہد مٹا چکی ہوتی تھیں۔ چھری رگڑ رگڑ کر صاف ہونے، دھلنے، کھنگالنے اور خشک ہونے کے بعد اوپر الماری میں اپنی مخصوص جگہ پہ پہنچ چکی ہوتی تھی اور ایلین کی مدد سے سبزی کے چھلکے اور بیج اور زائد چربی کو اخبار میں سمیٹ کر کوڑے کی ٹوکری میں دبایا جا چکا ہوتا۔ باورچی خانے کے کاؤنٹر پہ کٹی ہوئی سبزی سے اٹاٹ بھرے ہوئے ڈونگے اور پیالے ترتیب سے رکھے ہوتے اور پسے ہوئے مصالے اور کوٹے ہوئے ادرک و لہسن کے پیسٹ مطلوبہ مقدار میں تیار پڑے ہوتے۔ جلد ہی رنگارنگ شوربے چولہے کے شعلوں پہ دھرے ابلتے دکھائی دیتے تھے۔ مسز سین کا یہ روزانہ کا معمول تھا۔ وہ اس قدر تردد کسی خاص موقع کی مناسبت سے نہیں کرتی تھیں اور نہ ہی گھر میں کسی

مہمان کے آنے کی کوئی توقع ہوتی تھی۔ یہ سب تیاری محض شام کے کھانے کے لیے ہوتی تھی اور لونگ روم کے کونے میں کھانے کے چھوٹے سے چوکور میز پہ جب وہ دو پلیٹیں اور دو ہی گلاس رکھتیں تو ایلٹ اندازہ لگاتا تھا کہ اس کھانے میں صرف مسز سین اور ان کے شوہر نے ہی شریک ہونا ہے۔ میز پہ اس نے کبھی نیپکن یا چھری کانٹے رکھے ہوئے بھی نہیں دیکھے۔

مسز سین کی اقتدا میں جب ایلٹ اخباروں میں لپٹے سبزی کے چھلکے کوڑے کی ٹوکری میں دبا رہا ہوتا تو اسے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اور مسز سین کسی ان کہے اصول سے روگردانی کر رہے ہیں۔ شاید یہ احساس اس لیے تھا کہ مسز سین ہر کام بڑی عجلت سے پایہ تکمیل کو پہنچاتی تھیں۔ چٹکی میں نمک اور مرچ لے کر سالن پہ چھڑکنے، دالوں کو ننھارنے، شیلفوں کو رگڑ کر نکھارنے اور الماریوں کو یکے بعد دیگرے کھول کر ان میں سے چیزیں نکالنے اور رکھنے کے سب کام وہ جلدی جلدی نبٹایا کرتی تھیں۔ جب ایلٹ کی ماں اچانک اپارٹمنٹ کے دروازے پہ نمودار ہوتی تو وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک سا جاتا جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ اس کی ماں نے شفاف جالی دار پاجامہ اور دفتر میں پہننے والا کوئی سوٹ پہن رکھا ہوتا تھا اور وہ دہلیز میں ہی کھڑے ہو کر اسے آواز لگاتی کہ وہ اپنی چیزیں سمیٹ لے اور بوٹ پہن کر چلنے کے لیے تیار ہو جائے لیکن مسز سین یوں بغیر کسی تواضع کے اس کی ماں کو جانے نہ دیتیں۔ ہر شام مسز سین کا اصرار ہوتا کہ ایلٹ کی ماں کچھ دیر صوفے پہ بیٹھ جائے تاکہ وہ اس کی کچھ خاطر مدارت کر سکیں۔ وہ اسے کبھی عرق گلاب ملا گلابی دہی کا گلاس لا تھماتیں، کبھی گرم گرم شامی کباب پیش کرتیں اور کبھی سوچی کے حلوے سے اس کی خاطر داری کرنے کی کوشش کرتیں۔

"اوہ! مسز سین آپ کیوں اتنا تردد کرتی ہیں میں نے دوپہر کا کھانا بہت دیر میں کھایا تھا۔"

"اس میں بھلا تردد کیا ہے۔ مجھے ایلٹ کا خیال رکھنے میں کوئی تردد پیش نہیں آتا تو یہ تو کوئی بات ہی نہیں!"

ایلٹ کی ماں مسز سین کی ان رنگارنگ ڈشوں کو تھوڑا تھوڑا چکھتے ہوئے اپنی آنکھیں مٹکا کر ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کرتی۔ اس کے دونوں گھٹنے ایک دوسرے سے جڑے ہوتے اور اس کی اونچی ایڑی والی جوتیاں، جنہیں وہ کبھی بھی باہر نہیں اتارتی تھی، قالین میں کھب سی جاتی تھیں۔ "یہ مزے کا ہے!" محض ایک دو چیچ کھانے کے بعد ہی وہ فیصلہ صادر کرتے ہوئے پلیٹ رکھ دیتی۔ ایلٹ جانتا تھا کہ اسے یہ چیزیں بالکل بھی مزے کی نہیں لگتیں۔ ایسا اس نے خود ایلٹ کو ایک دفعہ کار میں بیٹھتے ہوئے بتایا تھا۔ ایلٹ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ دفتر میں کبھی دوپہر کا کھانا نہیں کھاتی تھی کیونکہ وہ لوگ جب اپنے ساحلی گھر پہنچتے تو اس کی ماں پہلا کام ہی یہ کرتی کہ سینڈویچ اور شراب کا گلاس لے کر بیٹھ جاتی اور بعض اوقات اتنا زیادہ کھا لیتی کہ شام کو جب کھانے کے لیے پیزا آتا، جس کا وہ

عموماً بلاناغہ آرڈر دیا کرتے تھے، تو اس کی بھوک مٹ چکی ہوتی تھی۔ جب ایلپیٹ بیزا اکھا رہا ہوتا تو وہ شراب کا ایک اور گلاس لے کر میز پہ بیٹھ جاتی اور اس سے پوچھتی کہ دن کیسا گزرا۔ بالآخر وہ سکریٹ لے کے گھر کے بیرونی برآمدے میں کھڑی ہو جاتی اور ایلپیٹ کو باقی ماندہ بیزا اور برتن خود ہی سمیٹنے پڑتے۔

ہر دوپہر جب ایلپیٹ مرکزی سڑک پہ اسکول بس سے اس علاقے کے دو تین اور بچوں کے ساتھ اترتا تو مسز سین دیودار کے درختوں کے چھوٹے سے جھنڈ میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہوتی تھیں۔ ہمیشہ ایلپیٹ کو یہ احساس ہوتا تھا کہ مسز سین کافی دیر سے انتظار میں کھڑی ہیں اور ان کے انداز میں ایسی بے تابی ہوتی جیسے وہ سالوں بعد کسی سے مل رہی ہوں۔ اس روز بھی حسب معمول مسز سین اس کی منتظر تھیں۔ ان کی کنپٹیوں پہ بالوں کی ایک لٹ ہوا کے نرم رو جھونکوں کے ساتھ اڑ رہی تھی اور ان کی مانگ میں تازہ سیندور جھلک رہا تھا۔ انہوں نے گہرے نیلے رنگ کے فریم والا چشمہ لگا رکھا تھا جو ان کے چہرے کے حساب سے کچھ زیادہ ہی بڑا لگ رہا تھا۔ انہوں نے ایک چوخانے دار کوٹ پہن رکھا تھا اور ان کی ساڑھی، جو ہر روز ایک نئے ڈیزائن کی ہوتی تھی، کوٹ کے کناروں سے نیچے ہوا کے زور سے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ جب وہ بس اسٹاپ سے گھر کی طرف چل پڑے تو مسز سین نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک سینڈوچ بیگ میں رکھی نارنگی کی کٹی ہوئی پھانکیں نکال کر ایلپیٹ کو دیں۔ ہر روز وہ کچھ نہ کچھ اپنی جیب میں رکھتی تھیں تاکہ اسٹاپ سے گھر تک کے فاصلے میں ایلپیٹ کو دے سکیں۔ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ایک ہی جیسی لگ بھگ ایک درجن عمارتوں کے گرد اگر دپھری ہوئی تار کول کی اس سڑک پہ شاہ بلوط کے پھل جا بجا بکھرے پڑے تھے اور ریشمی سنڈیاں جہاں تہاں ریختی پھر رہی تھیں۔

گھر پہنچتے ہی وہ سیدھا کار پارکنگ میں گئے اور گاڑی لے کر نکل پڑے۔ مسز سین نے لگ بھگ بیس منٹ تک ڈرائیونگ کی مشق کی۔ یہ ایک گہرے بھورے رنگ کی سیڈان کار تھی جس کی سیٹیں وینائل^{۵۴} کی تھیں۔ اس میں نصب ریڈیو کے بٹن کروم^{۵۵} کے تھے اور پچھلی سیٹ کی پشت پہ ٹشو پیپر کا ایک ڈبہ اور برف ہٹانے والا چھوٹا سا اوزار رکھا تھا۔

"آپ کو اکیلا اپارٹمنٹ میں چھوڑ کے ڈرائیونگ کے لیے نکلتا مجھے ٹھیک نہیں لگتا اس لیے ساتھ بٹھالیا ہے۔" مسز سین نے گاڑی میں بیٹھتے ہی وضاحت کی تھی۔ لیکن ایلپیٹ جانتا تھا کہ اسے ساتھ بٹھانے کی وجہ یہ تھی کہ اکیلے ڈرائیونگ سے انہیں ڈر لگتا تھا۔ گاڑی کا اگنیشن گھماتے ہی مسز سین نے اپنے دونوں کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے کیونکہ انہیں انجن کے غرانے کی آواز سے خوف آتا تھا۔

"مسٹر سین کہتے ہیں کہ جب مجھے ڈرائیونگ لائسنس ملے گا تو یہ مسئلہ ختم ہو جائیگی۔ میرا اعتماد بڑھ جائے گا۔ آپ کا

کیا خیال ہے ایلٹ؟ چیزیں بہتر نہیں ہو جائیں گی؟

"جی بالکل! آپ مختلف جگہوں پہ جاسکیں گی۔" ایلٹ نے اپنی رائے پیش کی "آپ جہاں چاہیں جاسکیں گی۔"

"کیا میں یہاں سے ڈرائیو کر کے کلکتہ بھی جاسکوں گی؟ وہاں پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا ایلٹ؟ کلکتہ دس ہزار میل دور ہے، اگر ہم پچپن میل فی گھنٹہ کے حساب سے جائیں تو بھلا کتنا وقت لگے گا؟"

ایلٹ ریاضی کا اتنا پیچیدہ حساب کتاب زبانی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چپ چاپ مسز سین کو دیکھتا رہا۔ انہوں نے اپنی سیٹ تھوڑا آگے کی، عقبی آئینے کو درست کیا اور اپنا چشمہ سر پہ اٹکا کر ریڈیو کو ایک ایسے اسٹیشن پہ سیٹ کر دیا جہاں سمفونی موسیقی بج رہی تھی۔ "کیا یہ بیتھوون^{۵۶} ہے؟" انہوں نے بیتھوون کے "بے" کا تلفظ "بی" کرتے ہوئے سوال کیا۔ اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے انہوں نے ایلٹ کو بھی ایسا ہی کرنے کے لیے کہا۔ آخر کار انہوں نے بریک پیڈل پہ پاؤں دبا کر گاڑی کو آٹو میٹک گئیر شفٹ میں ڈال کر بڑی احتیاط سے پارکنگ سے آہستہ آہستہ باہر نکالا۔ انہوں نے اپارٹمنٹ کمپلیکس کے گرد اگر دپھری تار کول کی سڑک پہ پہلے ایک چکر مکمل کیا پھر دوسرا چکر لگایا۔

"میں کیسی ڈرائیونگ کر رہی ہوں ایلٹ؟ کیا میں ٹیسٹ پاس کر لوں گی؟"

دورانِ ڈرائیونگ مسز سین کی توجہ مسلسل بھٹک رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے گاڑی کو بغیر کوئی اشارہ دیے سڑک پہ روک کر ریڈیو کے کسی اعلان کی طرف متوجہ ہو جاتیں یا سڑک کنارے کسی چیز کو دیکھنے کے لیے ایک دم بریک لگا دیتیں۔ اگر کوئی شخص پاس سے گزرتا تو وہ ہاتھ ہلا کر اسے ہیلو کہتیں۔ اگر انہیں سڑک پہ بیس فٹ آگے بھی کوئی پرندہ بیٹھا ہوا دکھائی دے جاتا تو وہ ہارن بجانا شروع کر دیتیں اور اس کے سڑک سے اڑنے کا انتظار کرنے لگتیں۔ انہوں نے ایلٹ کو بتایا کہ انڈیا میں ڈرائیور یہاں کے برعکس گاڑی کی دائیں طرف بیٹھ کر ڈرائیونگ کرتا ہے۔ بہر حال رینگتے رینگتے وہ جھولوں کے پاس سے گزرے، پھر لائڈری والی عمارت، پھر کوڑے کے گہرے سبز ڈرموں اور پھر پارک کی ہوئی گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتے چلے گئے۔ جب وہ دیودار کے درختوں کے اس جھنڈ کے پاس پہنچے جہاں تار کول کی یہ ذیلی سڑک مرکزی سڑک سے ملتی تھی اور جہاں گاڑیاں شاں شاں کر کے گزر رہی تھیں تو مسز سین آگے کو جھک گئیں اور اپنا سارا وزن بریک پہ ڈال دیا۔ مرکزی سڑک نسبتاً تنگ تھی اور اس کے درمیان میں پیلے رنگ کی پٹی دونوں اطراف کی لائنوں کو ایک دوسرے سے جدا کر رہی تھی۔

"ناممکن ہے ایلٹ! میں اس پہ کیسے جاؤں؟"

"آپ تھوڑا رکیں جب دونوں طرف سے کوئی گاڑی نہ آرہی ہو تب آگے جائیں۔"

"یہ گاڑیوں والے اپنی گاڑیاں آہستہ کیوں نہیں کر رہے؟"

"اب کوئی بھی نہیں آرہا، چلیں۔"

"لیکن وہ دائیں طرف سے جو کار آرہی ہے، تمہیں دکھائی دی؟ اور دیکھو اس کے پیچھے ایک ٹرک بھی تو آرہا ہے۔"

بحر حال مجھے مسٹر سین کے بغیر مرکزی سڑک پہ جانے کی ویسے بھی اجازت نہیں ہے۔"

"آپ کو جلدی سے موڑ کاٹ کے اپنی رفتار بڑھانی ہے بس۔" ایلینٹ بولا۔ اس کی ماں بھی ایسا ہی کرتی تھی۔ مسز سین کے برعکس وہ جیسے بغیر سوچے گاڑی کو دوسری سڑک پہ ڈال دیتی تھی۔ جب وہ ماں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا ہوتا اور شام کے گھرے ہوتے سائیوں میں گاڑی بڑی روانی کے ساتھ ان کے ساحلی گھر کی طرف دوڑ رہی ہوتی تو اسے یہ سب بہت سادہ، بہت غیر پیچیدہ سا عمل لگتا تھا۔ تب سڑک محض سڑک ہوتی تھی اور آتی جاتی گاڑیاں محض ارد گرد کے مناظر کا ایک حصہ دکھائی دیتیں۔ لیکن اب مسز سین کے ساتھ، موسم خزاں کے درختوں سے جھانکتے حدت سے عاری سورج تلے، گاڑی میں بیٹھے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا کہ ڈرائیونگ کا عمل اتنا بھی سادہ نہیں تھا جتنا اس کی ماں کے ساتھ بیٹھ کر اسے لگتا تھا۔ آتی جاتی گاڑیاں اب محض منظر کا ایک غیر دلچسپ سا حصہ نہیں تھیں بلکہ انہیں دیکھ کر مسز سین کی انگلیوں میں جیسے خون منجمد ہو رہا تھا، ان کی کلائیاں لرز رہی تھیں اور ان کی انگریزی لڑکھڑاہی تھی۔

"ہر کوئی۔۔۔ یہ لوگ۔۔۔ ان کی دنیا میں بہت زیادہ!" پتہ نہیں وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔

مسز سین کے ہاں کچھ روز جانے کے بعد ہی ایلینٹ جان گیا تھا کہ مسز سین کو دو چیزوں سے ناقابلِ بیاں خوشی ملتی ہے۔ پہلی چیز ان کے خاندان کی طرف سے ہندوستان سے آنے والا خط تھا۔ ان کی عادت تھی کی ہر روز ڈرائیونگ کی مشق کرنے کے بعد وہ اپنا میل بکس دیکھتی تھیں۔ میل بکس کا تالا کھولنے کے بعد وہ ایلینٹ کو اس میں موجود ڈاک کا جائزہ لینے کا کہتیں۔ جب ایلینٹ میل بکس میں بل اور مسٹر سین کے نام آنے والے میگزین پھرول رہا ہوتا تو وہ اپنی آنکھیں بند کر کے ان پہ ہاتھ رکھ لیتیں۔ پہلے پہل تو ایلینٹ کو ان کی اس قدر بے چینی اور اضطراب ناقابلِ فہم لگتا تھا کیونکہ اس کی ماں کا بھی ایک پی۔ او۔ بکس تھا اور وہ اس میں آنے والی ڈاک کئی کئی ہفتوں تک نہیں اٹھاتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ ان کی بجلی بھی بل کی عدم ادائیگی کی وجہ سے تین دن تک منقطع رہی تھی۔ بہر حال کئی ہفتے یوں ہی گزر گئے۔ بالآخر ایک دن جب مسز سین حسبِ معمول آنکھیں بند کیے منتظر تھیں ایلینٹ کو میل بکس میں ایک نیلے رنگ کا ہوائی ڈاک سے موصول ہونے والا خط ملا۔ اس پہ جابجا ٹکٹ چسپاں تھے جن پہ ایک گنجے سروالے آدمی اور چرنے کی تصویریں تھیں۔ ان ٹکٹوں پہ بے تحاشا مہریں ثبت تھیں۔

"کیا یہی وہ خط ہے مسز سین؟"

مسز سین نے اس کے ہاتھ سے خط لے کر اسے بے اختیار پہلی دفعہ گلے سے لگا لیا۔ مسز سین کی ساڑھی سے چمٹے ہوئے ایلٹ نے کافی گولیوں اور زیرے کی مہک کو اپنے چاروں طرف محسوس کیا۔

جیسے ہی وہ گھر کے اندر داخل ہوئے مسز سین نے اپنے جوتے یہاں وہاں اتار پھینکے اور اپنے بالوں سے ایک پن اتار کر اس کی مدد سے خط کو ایک طرف سے ایک ہی جھٹکے میں چاک کر دیا۔ خط کی عبارت پڑھتے ہوئے ان کی آنکھیں سطروں کے ساتھ تیز تیز گھوم رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ خط پڑھ چکیں انہوں نے فون سیٹ کا کڑھائی کیا ہوا غلاف اتارا اور جلدی سے نمبر ڈائل کر کے بولیں: "جی، کیا مسٹر سین سے بات ہو سکتی ہے پلیز؟ میں مسز سین بول رہی ہوں اور ان سے میرا بات کرنا بہت ضروری ہے۔"

چند لمحوں بعد جب دوسری طرف مسٹر سین لائن پہ آئے تو مسز سین اپنی زبان میں بات کرنے لگیں۔ ایلٹ کی سماعتوں کے لیے یہ زبان بہت تیز اور بہت بے ہنگم سی تھی۔ تاہم اسے اتنی سمجھ آرہی تھی کہ مسز سین خط کے مندرجات کو حرف بہ حرف پڑھ کر اپنے میاں کو سنارہی ہیں۔ ان کی آواز معمول سے زیادہ بلند تھی اور اس میں ایک عجیب سا زیروم تھا۔ اگرچہ مسز سین ایلٹ کے سامنے اپنے پورے وجود سے کھڑی تھیں لیکن ایلٹ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کمرے میں، اس ناشپاتی کی سی رنگت والے قالین پہ، موجود نہیں بلکہ کسی اور جہاں میں ہیں۔

اپنے شوہر سے فون پر بات کرنے کے بعد اب مسز سین کے لیے اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں ٹک کر بیٹھنا ممکن نہ رہا تھا چنانچہ وہ دونوں گھر سے نکلے اور مرکزی سڑک پار کر کے کچھ دور یونیورسٹی کیمپس جا پہنچے جہاں سنگیں مینار پہ ٹنگے گھنٹے کی آواز وقت کا اعلان کر رہی تھی۔ کچھ دیروہ یوں ہی سٹوڈنٹ یونین کی عمارت میں مٹر گشت کرتے رہے پھر کیفے ٹیریا میں آکر بیٹھ گئے۔ گول میزوں پہ خوش گپیوں میں مگن طالب علموں کے درمیان بیٹھ کر انہوں نے گتے کی کشتی نما پلیٹوں میں بھرے ہوئے فرنیچ فرائز اڑائے اور پھر ایلٹ نے ایک کاغذی گلاس میں سوڈا جب کہ مسز سین نے ٹی بیگ کی مدد سے چائے کا کپ بنا کر نوش کیا۔ پیٹ پوجا کرنے کے بعد وہ یونیورسٹی کی اس عمارت کو کھوجنے نکل پڑے جس میں مختلف فن پارے رکھے گئے تھے۔ اس عمارت کی سردراہداریوں میں تازہ پینٹ اور گندھی ہوئی مٹی کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ مجسموں اور پینٹنگز کو دیکھتے دیکھتے جب وہ تھک گئے تو وہاں سے نکل پڑے۔ ریاضی کی عمارت کے پاس سے گزرتے ہوئے مسز سین نے ایلٹ کو بتایا کہ یہاں مسٹر سین اپنی کلاسز کو پڑھاتے ہیں۔ وہ چلتے چلتے ورزش گاہ جانکے جہاں ہر طرف کھلاڑیوں کا شور تھا اور عمارت میں ہر سو کلورین کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ چوتھی منزل کی ایک بڑی سی کھڑکی سے انہوں نے اندر فیروزی ٹائلوں والے چمکتے دیمتے سوئمنگ پول میں تیراکوں کو ایک طرف سے دوسری طرف تیراکی کرتے ہوئے دیکھا۔ جب ایلٹ تیراکوں پہ نظریں گاڑے کھڑا تھا تو اس اثنا میں مسز سین

نے اپنے پرس سے انڈیا سے آیا ہوا خط نکالا اور اس کے ٹکٹوں اور مہروں اور پتے پر کچھ دیر غور کرنے کے بعد اسے کھول کر دوبارہ پڑھنے لگیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ گاہے بہ گاہے آہیں بھرتی جا رہی تھیں۔ جب وہ خط پڑھ چکیں تو کچھ دیر تیرا کوں پہ نظر جمائے خاموش کھڑی رہیں پھر بولیں:

"میری بہن کے ہاں لڑکی ہوئی ہے اور میں اسے دیکھ بھی نہیں سکتی۔ جب میں ہندوستان جا کر اس سے ملوں گی تب تک وہ تین سال کی ہو چکی ہوگی۔ اور یہ بھی تب ممکن ہے اگر مسٹر سین کو ملازمت کا اگلا کنٹریکٹ مل جائے اور وہ چھٹی لے کر ہندوستان جاسکیں۔ اس لڑکی کے لیے اس کی اپنی خالہ ایک اجنبی عورت ہوگی۔ اگر ہم کبھی ٹرین میں ساتھ ساتھ بھی بیٹھے ہوں تو اسے میرے چہرے سے کوئی شناسائی نہیں ہوگی۔" مسز سین نے خط کو تہہ کر کے اپنے پرس میں ڈالا اور ایلٹ کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں: "یہ دوپہر میں میرے ساتھ کاٹے ہوئے تمہیں اپنی ماں کی کمی محسوس ہوتی ہے ایلٹ؟"

ماں کی کمی محسوس کرنے کا خیال کبھی ایلٹ کو نہیں آیا تھا اس لیے وہ خاموش رہا۔

"تمہیں اپنی ماں کو مس کرنا چاہیے۔ جب میں تمہارے بارے میں سوچتی ہوں۔۔۔۔ ایک چھوٹا سا لڑکا۔۔۔۔۔ جسے دن کا زیادہ تر وقت اپنی ماں سے جدا گزارنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ تو میں خود کو قصور وار سمجھتی ہوں۔" "میں اپنی ماں سے رات کو مل لیتا ہوں۔"

"جب میں تمہاری عمر کی تھی تو کبھی یہ میرے وہم و گمان سے بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک دن میں اپنوں سے اتنی دور چلی جاؤں گی۔ تم بہت سمجھ دار ہو ایلٹ۔ تم نے ابھی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ مستقبل میں زندگی نے کیا رخ اختیار کرنا ہے۔"

ہندوستان سے آنے والے خط کے علاوہ مسز سین کو دوسری چیز جو بہت شاد کام کرتی وہ ساحل سے ملنے والی مچھلی تھی۔ وہ صاف کی ہوئی مچھلی کی بجائے ہمیشہ تازہ اور سالم مچھلی پہ اصرار کیا کرتی تھیں۔ انہیں بغیر کانٹے والی مچھلی کے پارچے بھی نہیں بھاتے تھے۔ ایلٹ کو یاد تھا کہ ایک رات جب ان کے ہاں اس کی ماں کے دفتر کا کوئی دوست مدعو تھا تو اس کی ماں نے ایسے ہی مچھلی کے قتلے بھون کر بنائے تھے۔ اس شخص نے رات اس کی ماں کی خواب گاہ میں ہی گزاری تھی لیکن ایلٹ نے اس کے بعد اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ایک شام جب ایلٹ کی ماں اسے لینے آئی تو مسز سین نے اسے ٹیونا مچھلی کے بنے ہوئے کباب پیش کیے اور ساتھ یہ وضاحت بھی کی کہ بنگال میں یہ کباب دراصل ایک اور مچھلی بھینگی سے بنائے جاتے ہیں۔

"یہ سوچ کر ہی اپنی بے بسی پہ غصہ آجاتا ہے کہ سمندر کے اتنے قریب رہتے ہوئے بھی ہمیں وافر مچھلی دستیاب نہیں

ہے۔" مسز سین کی فرسٹریشن بہت نمایاں تھی۔ انہوں نے مزید بتایا کہ موسم گرما میں وہ ساحل سمندر کی ایک قریبی مارکیٹ سے مچھلی خرید لاتی تھیں۔ اگرچہ اس کا ذائقہ تو ہندوستانی مچھلی جیسا نہیں ہوتا لیکن کم از کم یہ مچھلی تازہ ہوتی تھی۔ اب جب کہ موسم سرد ہوتا جا رہا تھا مچھیرے سمندر کے پانیوں میں کم کم ہی نکلتے تھے اس لیے بعض دفعہ کئی کئی ہفتوں تک کوئی تازہ، سالم مچھلی مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہوتی تھی۔

"آپ سپر مارکیٹ کا چکر لگائیں۔" ایلین کی ماں نے تجویز پیش کی۔

مسز سین نے نفی میں سر ہلایا۔ "سپر مارکیٹ میں مجھے بلی کو کھلانے کے لیے تورنگارنگ خوراک کے بتیس طرح کے بند ڈبے مل جائیں گے لیکن مجھے میرے کام کی ایک مچھلی بھی نہیں ملے گی، ایک بھی نہیں!"

مسز سین نے انہیں بتایا کہ وہ دن میں دو دو دفعہ مچھلی کھا کر پل بڑھی تھیں۔ کلکتہ میں جہاں ان کا بچپن گزرا لوگ صبح اٹھ کر پہلا کام ہی مچھلی کھانے کا کرتے تھے اور رات کو سونے سے پہلے ان کا آخری کھانا بھی مچھلی پہ ہی مشتمل ہوتا تھا اور اگر کچھ آسودہ حال ہوں تو دن کو اسکول سے واپسی کے بعد بھی مچھلی ہی خوراک ہوتی تھی۔ وہ مچھلی کے سارے حصے، اس کی دم، انڈے، یہاں تک کے سر بھی کھاتے تھے۔ مچھلی بازار میں ہر جگہ ہر وقت سورج نکلنے سے آدھی رات ڈھلنے تک دستیاب ہوتی تھی۔ "بس آپ کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ گھر سے باہر نکلیں اور چند قدم چلتے ہی آپ کو مطلوبہ مچھلی مل جائے گی۔"

مسز سین کا اب یہ معمول تھا کہ ہر کچھ دن کے بعد وہ مقامی فون ڈائریکٹری کھول کر بیٹھ جاتیں اور اس کے حاشیے پہ نشان زد فون نمبر ڈائل کر کے پوچھتیں کہ کیا سالم مچھلی دستیاب ہے۔ اگر جواب اثبات میں ملتا تو وہ انہیں کہتیں کہ یہ مچھلی کسی اور کو نہ بچیں۔ نام پتہ لکھواتے ہوئے وہ وضاحت کرتیں۔ "جی سین، ایس جیسے سام میں ہے اور این جیسے نیویارک میں ہے۔ مسٹر سین آپ سے یہ مچھلی اٹھالیں گے۔" پھر وہ مسٹر سین کو یونیورسٹی کال کرتیں اور چند منٹ بعد مسٹر سین گھر پہنچ جاتے۔ ایلین کے سر کو پیار سے تھپتھپا کر وہ کھانے کی میز پر بیٹھ جاتے، ڈاک میں اپنے نام آنے والے خط پڑھتے اور باہر جانے سے پہلے چائے کی ایک پیالی پیتے۔ ایلین نے انہیں کبھی گھر میں آکر مسز سین کو بوسہ دیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے بعد وہ گھر لوٹتے تو ان کے ہاتھ میں کاغذی لفافہ ہوتا جس پہ مسکراتے ہوئے جھینگے کا خاکہ بنا ہوتا۔ یہ لفافہ وہ مسز سین کے حوالے کرتے اور خود شام کی کلاسز پڑھانے یونیورسٹی لوٹ جاتے۔ ایک دن ایسا ہی ایک لفافہ مسز سین کو پکڑاتے ہوئے وہ بولے: "اب کچھ عرصے کے لیے مچھلی نہیں ملے گی۔ فریزر میں جو مرغی کا گوشت رکھا ہے وہی پکا لیا کرو۔ مجھے اب آفس کے لیے نکلنا ہے۔"

اگلے کچھ دنوں تک مچھلی مارکیٹ میں فون گھمانے کی بجائے مسز سین نے فریزر میں رکھے ہوئے مرغی کے تخبستہ

گوشت سے ہی کام چلایا۔ ایک دن اس یکسانیت کو توڑنے کے لیے وہ مارکیٹ سے ڈبہ بند سارڈین مچھلی بھی لے کر آئیں اور سبز پھلیوں سے ملا کر اس کا قورمہ بنایا لیکن ان کی تشفی نہ ہوئی۔ تاہم اگلے ہی ہفتے مچھلی مارکیٹ سے ایک دکاندار کا فون آگیا۔ اسے مسز سین کی تازہ اور سالم مچھلی کی طلب کا اندازہ تھا اس لیے اس نے انہیں بتایا کہ اس کے پاس تازہ مچھلی دستیاب ہے اور وہ شام تک اس مچھلی کو ان کے لیے روک کر رکھ سکتا ہے۔ مسز سین یہ سن کر خوشی سے پھولے نہ سمائیں: "کتنا اچھا ہے نایہ آدمی ایلین؟ مجھے بتا رہا تھا کہ اس نے میرا نام ٹیلی فون ڈائریکٹری سے تلاش کیا اور پوری ڈائریکٹری میں سین نام کے صرف ہم ہی ہیں۔ تمہیں پتہ ہے کلکتہ کی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں کتنے ڈھیروں سین ہوتے ہیں؟"

مسز سین نے ایلین کو بوٹ اور جیکٹ پہننے کو کہا اور یونیورسٹی میں مسٹر سین کا نمبر ملایا۔ ایلین داخلی دروازے پہ اپنے بوٹوں کے تسمے باندھنے کے بعد کچھ دیر ان کا منتظر رہا لیکن جب وہ نمودار نہ ہوئیں تو چند منٹ کے بعد ایلین نے ان کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے اپنے تسمے ڈھیلے کیے اور مسز سین کو دیکھنے لوگ روم لوٹ آیا۔ مسز سین صوفے پہ بیٹھی رو رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا رکھا تھا اور آنسو ان کی انگلیوں سے نیچے ٹپک رہے تھے۔ وہ مونہ ہی مونہ میں مسٹر سین کی کسی میٹنگ کے بارے میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد ٹیلی فون سیٹ پر کڑھائی کیا ہوا پوشش ٹھیک کرنے کے بعد وہ آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جب وہ چلیں تو ایلین ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ گھر کے اندر وہ پہلی دفعہ قالین پر بوٹ پہنے چل رہا تھا۔ انہوں نے رک کر کھوئی کھوئی نظروں سے ایلین کو دیکھا۔ ان کے نچلے پپوٹے سوچ کر گلابی ہو چکے تھے۔ "مجھے بتاؤ ایلین! کیا میں نے کوئی بہت بڑا مطالبہ کر دیا ہے جو پورا نہ کیا جاسکے؟"

ایلین کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی وہ اسے بازو سے پکڑ کر اپنی خواب گاہ میں لے گئیں۔ اس کمرے کا دروازہ عام طور پر بند رہتا تھا۔ خواب گاہ میں پلنگ کے علاوہ فرنیچر کے نام پہ صرف ایک چھوٹی سی تپائی، کپڑے استری کرنے والی ایک میز اور درازوں والی ایک الماری موجود تھی۔ پلنگ کے سرہانے کی طرف ٹیک لگانے والا تختہ موجود نہیں تھا اور تپائی پہ ٹیلی فون سیٹ دھرا تھا۔ مسز سین نے دھڑا دھڑا درازیں اور دیوار گیر الماری کے پٹ کھولنا شروع کر دیے۔ درازوں اور الماریوں میں رنگا رنگ ساڑھیوں کے ڈھیر گتھے پڑے تھے۔ زری کی تاروں سے کڑھی ہوئی یہ ساڑھیاں ہر اس رنگ اور ڈھنگ کی تھیں جس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ کچھ کا کپڑا اتنا پتلا تھا کہ آر پار صاف دکھتا تھا اور کچھ کے کپڑے کھڑکیوں کے پردوں کی طرح دبیز تھے اور ان کے کناروں پہ جھالریں سجی ہوئی تھیں۔ کچھ ساڑھیاں دیوار گیر الماریوں میں ہینگروں پہ لٹکی ہوئی تھیں جب کہ بہت سی درازوں میں تہہ در تہہ رکھی گئی تھیں۔ مسز سین

ایک ایک ساڑھی کو اٹھاتے ہوئے کہنے لگیں: "میں نے یہ ساڑھی کب پہنی ہے؟ اور یہ کب پہنی ہے؟ اور یہ والی؟ اور یہ؟" وہ درازوں اور ہینگروں سے ساڑھیاں نکال نکال کر پلنگ پہ پکاتی جا رہی تھیں اور ساڑھیوں کا یہ ڈھیر رنگ برنگے کپڑوں کا ایک الجھا ہوا انبار دکھائی دے رہا تھا۔ ساڑھیوں کے کھلنے سے سارے کمرے میں کافی گولیوں کی تیز بو پھیل گئی تھی۔

"تصویریں بھیجو، میرے گھر والے لکھتے ہیں تصویریں بھیجو، اپنی نئی زندگی کی تصویریں بھیجو۔ میں بھلا انہیں کیا تصویریں بھیجوں ایلین؟" وہ مضحک سی پلنگ کے کنارے پہ جیسے ڈھے گئیں۔ پلنگ پہ جا بجا بکھری ساڑھیوں نے ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ محدود کر دی تھی۔ "وہ سمجھتے ہیں کہ میں یہاں کسی ملکہ کی طرح زندگی گزار رہی ہوں۔" انہوں نے کمرے کی سپاٹ دیواروں پہ کھوئی کھوئی نظریں دوڑائیں۔ "وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں ایک بٹن دباتی ہوں اور سارا گھر صاف ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں کسی محل میں رہتی ہوں۔"

تپائی پہ رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور بجتی چلی گئی۔ کافی دیر بعد مسز سین نے بالآخر ریور اٹھالیا۔ ٹیلی فون پہ دوسری طرف سے کی جانے والی گفتگو کے دوران وہ پلنگ پہ پڑی ایک ساڑھی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے صرف ہوں ہاں سے جواب دیتی رہیں۔ جب وہ بات ختم کر چکیں تو انہوں نے ساڑھیوں کو بغیر تہہ کیے واپس درازوں میں جیسے تیسے ٹھونس دیا اور پھر وہ اور ایلین جوتے پہن کر باہر کار کے پاس آکر مسٹر سین کا انتظار کرنے لگے۔

"آج تم ڈرائیو کیوں نہیں کرتیں؟" مسٹر سین نے نمودار ہوتے ہی کار کے بونٹ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ایلین کی موجودگی میں وہ دونوں ہمیشہ آپس میں گفتگو انگریزی میں کیا کرتے تھے۔

"آج نہیں، پھر کسی دن۔"

"تم بھلا ٹیسٹ کیسے پاس کرو گی اگر سڑک پہ دوسری گاڑیوں کی موجودگی میں ڈرائیونگ سے اسی طرح ڈرتی رہیں تو؟" "نہیں، آج ایلین ہے۔"

"یہ تو ہر روز ہی ہوتا ہے۔ میں تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں، پریکٹس نہیں کرو گی تو گاڑی نہیں چلا پاؤ گی۔"

ایلین! مسز سین کو بتاؤ کہ یہ ان کے اپنے لیے کتنا اچھا ہے۔"

مسز سین بہر حال اپنی نہ پہ ڈٹی رہیں۔

وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتے ہوئے انہیں جانی پہچانی سڑکوں سے گزرے جہاں سے ہر شام ایلین اپنی ماں کے ساتھ واپس اپنے ساحلی گھر جایا کرتا تھا لیکن آج مسٹر اور مسز سین کی معیت میں پچھلی سیٹ پہ بیٹھے ایلین کو گاڑی کا یہ سفر کچھ انجانا سا اور قدرے طویل لگ رہا تھا۔ سمندری بگلوں کی وہ پر شور آوازیں جن کی وجہ سے ہر صبح اس کی آنکھ کھل

جاتی تھی آسمان میں غوطے لگاتے دکھائی دے رہے تھے اور اب ان کی آوازیں سامعہ خراشی کرنے کی بجائے اس کے اندر ایک جوش اور سنسنی پیدا کر رہی تھیں۔ وہ ایک کے بعد ایک ساحل سے گزرتے چلے گئے۔ وہ کھوکھے جہاں گرمیوں میں بخ بستہ شگنجن اور سمندری گھونگے بکا کرتے تھے اب بند پڑے تھے اور ان پہ زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ صرف مچھلی مارکیٹ میں ایک کھوکھا کھلاتا تھا۔ جب گاڑی اس کے سامنے رکی تو مسز سین نے اپنی سمت کا دروازہ کھولنے کے بعد مڑ کر مسٹر سین کی طرف دیکھا جنہوں نے ابھی تک اپنی سیٹ بیلٹ نہیں کھولی تھی: "آپ آرہے ہیں؟"

مسٹر سین نے اپنے بٹوے سے چند نوٹ نکال کر مسز سین کو دیے۔ "میری بیس منٹ بعد ایک ضروری میٹنگ ہے، پلیز جلدی کرنا وقت بالکل بھی ضائع نہ کرنا۔" جب وہ بول رہے تھے تو ان کی نگاہیں گاڑی کے ڈیش بورڈ پہ مرکوز تھیں۔

ایلیٹ مسز سین کے ساتھ اس چھوٹی سی نم آلود دکان میں پہنچا جس کی دیواروں پہ مچھلی پکڑنے کے جال، سٹار فش اور لنگر نما کے ماڈل سجے ہوئے تھے۔ سیاحوں کا ایک گروپ گردنوں میں کیمرے لٹکائے کاؤنٹر پہ ٹھنسا کھڑا تھا۔ کچھ سیاح گھونگوں کے خولوں کا معائنہ کر رہے تھے جب کہ کچھ دوسرے اس بڑے سے چارٹ کی طرف اشارے کر کے آپس میں بات چیت کر رہے تھے جس پہ شمالی بحر اوقیانوس میں پائی جانی والی مچھلی کی پچاس اقسام دکھائی گئی تھیں۔ مسز سین نے کاؤنٹر مشین سے ٹکٹ لیا اور لائن میں لگ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگیں۔ ایلیٹ جھینگوں کے ٹینک کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ٹینک کے گدلے پانی میں جھینگے بھرے پڑے تھے اور ان کے پنچوں پہ پیلے پیلے ربڑ بینڈ چڑھائے گئے تھے۔ ایلیٹ وہیں کھڑا مسز سین کو باری آنے پہ دکاندار کے ساتھ ہنس کر باتیں کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دکاندار کا سرخ چہرہ دمک رہا تھا اور اس کے پیلے پیلے دانت بہت نمایاں تھے۔ اس نے سیاہ رنگ کا ربڑ کا ایپرن باندھ رکھا تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں میں سرمئی رنگ کی دو مچھلیاں تھیں جنہیں اس نے دموں سے اٹھا رکھا تھا۔

"آپ کو پکا یقین ہے ناکہ یہ بالکل تازہ ہیں؟"

"بالکل تازہ ہیں! جب آپ ان کو پکائیں گی تو یہ خود بتائیں گی کہ یہ کتنی تروتازہ ہیں۔"

ترازو کے کانٹے نے وزن کا اعلان کیا تو دکاندار نے پوچھا: "چھلکے اتار دوں مسز سین؟"

مسز سین نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ان کے سر رہنے دو، انہیں نہ اتارنا پلیز۔"

"گھر میں بلیاں ہیں آپ کی؟"

"نہیں، بلیاں نہیں ہیں۔ صرف ایک شوہر ہے۔"

اپارٹمنٹ لوٹ کر مسز سین نے اپنا پسندیدہ ہتھیار یعنی خمیدہ پھل والی چھری الماری سے نکالی، قالین پہ اخبار کے صفحات بچھائے اور مشتاق نظروں سے اپنے خزانے کا معائنہ کرنے لگیں۔ دونوں مچھلیوں کے گرد لپٹے کاغذ انہوں نے ایک ایک کر کے اتارے۔ کاغذوں پہ جھریاں پڑ گئی تھیں اور ان پہ جابجا خون کے دھبے ثبت تھے۔ انہوں نے چھری کے ایک ایک وار سے دونوں مچھلیوں کی دیمیں علیحدہ کیں، پیٹ کاٹ کر اندر کا مواد باہر نکالا اور پھر چھری سے لمبائی کے رخ ان کو دو حصوں میں چیر دیا۔ ایک قینچی کی مدد سے انہوں نے پروں کو بڑی نفاست سے کتر دیا اور جب وہ مچھلیوں کے گلپھڑوں کے نیچے انگلی ڈال کر انہیں نکال رہیں تھیں تو مسز سین کا سرخ سینہ دور ان گلپھڑوں کی سرخی کے سامنے ماند پڑ رہا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے چھری کو سیدھے رخ کھڑا کر کے پاؤں کے نیچے دبایا اور دونوں مچھلیوں پہ ایک ایک کر کے دونوں ہاتھوں سے تھامے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کٹ لگاتی گئیں۔

"آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟" ایلین نے مارے تجسس کے پوچھا۔

"یہ دیکھنے کے لیے کہ کتنے ٹکڑے بنتے ہیں۔ اگر میں ان کو ٹھیک طرح سے کاٹوں تو اس جسامت کی مچھلی سے میں تین وقت کے کھانے کا بندوبست کر سکتی ہوں۔" انہوں نے مچھلیوں کے سر کاٹ کر گہرے پینڈے والی ایک پلیٹ میں سجا دیے۔

نومبر کے مہینے میں کچھ دن ایسے بھی گزرے جب مسز سین کے رویے میں یکدم ایک تبدیلی رونما ہوئی اور انہوں نے ڈرائیونگ کی مشق یکسر ترک کر دی۔ اب وہ نہ خمیدہ پھل والی چھری کو الماری سے نکالتیں نہ اخبار کے صفحات قالین پہ پھیلا کے بیٹھتیں۔ انہوں نے مچھلی مارکیٹ فون کرنا اور فریز کیا ہوا مرغی کا گوشت پکانا بھی ترک کر دیا۔ ان پر ایک طویل خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ وہ چپ چاپ ایلین کو کریم والے بسکٹ لادیتیں اور پھر خود جوتوں کے ایک ڈبے میں سے ہندوستان سے آئے ہوئے پرانے خط نکال کر پڑھتی رہتیں۔ شام کو جب ایلین کے جانے کا وقت ہوتا تو وہ اس کی چیزیں اکٹھی کر کے کچھ کہے بغیر اسے رخصت کر دیتیں۔ اس کی ماں کو صوفے پر بٹھانے اور کھانے پینے کی چیزوں سے اس کی تواضع پر اصرار اب انہوں نے یکسر ترک کر دیا تھا۔ مسز سین کے رویے میں اس تبدیلی کے بارے میں بالآخر ایک دن ایلین کی ماں نے گاڑی میں اس سے سوال کیا لیکن ایلین نے جواب دیا کہ اسے مسز سین میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ وہ ماں کو یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ اب مسز سین سارا دن اپارٹمنٹ میں گرم سم بے مقصد ادھر سے ادھر پھرتی رہتی ہیں اور وہ پہروں پلاسٹک چڑھے لیمپ شیڈ کو ایسے گھورتی رہتی ہیں جیسے انہیں پہلی دفعہ دیکھ رہی ہوں۔ اس نے ماں کو یہ بتانا بھی مناسب نہ سمجھا کہ اب مسز سین ٹیلی ویژن آن کر کے اسے دیکھنا بھول جاتی ہیں اور اپنے لیے چائے بنا کر پینا انہیں یاد نہیں رہتا اور چائے کی پیالی کافی کی میز پر پڑے پڑے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

خاموشی کے اسی دورانیے میں ایک دن مسز سین نے ٹیپ پہ کچھ ایسی موسیقی چلائی جس سے ایلین کے کان اب تک نا آشنا تھے۔ مسز سین نے اسے بتایا کہ اس موسیقی کو راگ کہتے ہیں اور اسے شام کے ڈھلتے سایوں میں سورج ڈوبتے سے سنا جاتا ہے۔ ایلین کو اس دھن کی بس اتنی سمجھ آئی کہ جیسے کوئی وائلن کے تاروں کو پہلے بہت آہستہ آہستہ اور پھر بہت تیز تیز چھیڑ رہا ہو۔ لگ بھگ ایک گھنٹے تک ٹیپ پہ یہ راگ بجاتا رہا اور مسز سین آنکھیں موندے صوفے پہ بیٹھی رہیں۔ جب ٹیپ چل چکی تو انہوں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور بولیں: "اس راگ میں بہت سوز ہے، تمہارے میتھوون سے بھی زیادہ! ہے نا؟"

ایک اور دن انہوں نے ٹیپ پہ جو کیسٹ چلائی اس میں لوگوں کی باتوں کی آوازیں تھیں جو اپنی زبان میں کچھ بول رہے تھے۔ ایلین کو انہوں نے بتایا کہ یہ اس دن کی ریکارڈنگ ہے جب وہ ہندوستان کو الوداع کہہ کے امریکا آئی تھیں۔ یہ ان کے خاندان نے بطور تحفہ ان کے لیے تیار کی تھی۔ ٹیپ پہ ایک کے بعد دوسری آواز ابھرتی اور مسز سین ہنستی، کھکھلاتی، قہقہے لگاتی ہوئی ان آوازوں کو صاف صاف پہچان لیتیں: "یہ میرے تیسرے چچا ہیں، یہ میری کزن کی آواز ہے، یہ میرے ابو بول رہے ہیں، یہ میرے دادا ہیں۔" ایک بولنے والے نے گانا گایا، ایک اور نے نظم پڑھ کر سنائی۔ ٹیپ میں آخری آواز مسز سین کی ماں کی تھی۔ اس آواز میں ٹھہراؤ تھا اور اس میں باقی آوازوں سے زیادہ سنجیدگی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر جملہ بولنے کے بعد ایک لمحے کے لیے آواز تھم جاتی اور اسی وقفے میں مسز سین ایلین کے لیے گزرے جملے کا ترجمہ کر دیتیں۔ "بکری کا گوشت دو روپے مہنگا ہو گیا ہے، بازار کے آدموں میں اب وہ مٹھاس نہیں رہی، باڑھ میں کالج اسٹریٹ میں پانی بھر گیا ہے۔" مسز سین نے ٹیپ بند کر دی اور بولیں "جس دن میں انڈیا سے یہاں آئی یہ سب کچھ وہاں ہوا تھا۔" اگلے روز مسز سین نے وہی کیسٹ دوبارہ چلائی لیکن اس دفعہ جب ان کے دادا بول رہے تھے تو انہوں نے ٹیپ بند کر دی۔ ایلین کو انہوں نے بتایا کہ انہیں پچھلے ہفتے ہندوستان سے خط موصول ہوا تھا کہ ان کے دادا فوت ہو گئے ہیں۔

ہفتے بھر بعد مسز سین اپنے معمول پہ آگئیں اور انہوں نے دوبارہ باورچی خانہ سنبھال لیا۔ ایک دن جب وہ لونگ روم کے فرش پہ حسب دستور آلتی پالتی مارے گو بھی کاٹ رہی تھیں تو مسٹر سین کا فون آگیا۔ وہ مسز سین اور ایلین کو ساحل سمندر پہ گھمانے لے جانا چاہتے تھے۔ مسز سین نے اس موقع کے لیے جھٹ سرخ ساڑھی اور سرخ لپ اسٹک سجالی اور اپنے بالوں کی چٹیا دوبارہ بنا کر مانگ میں سیندور تازہ کر لیا۔ گلے میں مفطر کی گرہ لگا کر انہوں نے دھوپ کے چشمے سر پر ٹکالیے اور اپنے پرس میں ایک چھوٹا جیبی کیمرہ رکھ لیا۔ جب مسٹر سین پارکنگ میں سے گاڑی ریورس میں نکال رہے تھے تو انہوں نے اپنا ایک بازو بغلی نشست کی پشت پہ اس طرح رکھا ہوا تھا کہ یوں لگ رہا تھا جیسے

انہوں نے مسز سین کے گرد بازو جمائل کر رکھا ہو۔ "اس کوٹ میں تو تمہیں سردی لگے گی۔" انہوں نے مسز سین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چلو تمہارے لیے کچھ گرم لیتے ہیں۔" مچھلی مارکیٹ کی اسی دکان سے انہوں نے تین مختلف اقسام کی مچھلیاں خریدیں لیکن اس دفعہ مسٹر سین خود بھی ان کے ساتھ دکان میں آئے اور انہوں نے دکاندار سے مچھلی کے تازہ ہونے کے بارے میں تصدیق کی اور پھر اسے ہدایات دیتے رہے کہ مچھلیوں کو کہاں سے اور کیسے کاٹنا ہے۔ اس دفعہ انہوں نے اتنی زیادہ تعداد میں مچھلیاں خریدیں کہ ایک بیگ ایلپٹ کو بھی اٹھانا پڑا۔ جب وہ یہ سارے بیگ گاڑی کی ڈگی میں رکھ چکے تو مسٹر سین نے کہا کہ انہیں بھوک لگ رہی ہے۔ مسز سین نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی چنانچہ وہ لوگ سڑک پار کر کے ایک ریسٹورنٹ پہنچے جہاں کھانا ساتھ لے جانے کی سہولت ابھی تک دستیاب تھی۔ ریسٹورنٹ سے گھونگوں کے پکوڑوں^{۵۸} سے بھری دو پلیٹیں لے کر وہ تینوں ایک قریبی میز پر آ بیٹھے۔ مسز سین نے سرخ مرچوں کی بہت سی چٹنی اور کالی مرچیں اپنے حصے کے پکوڑوں پر چھڑک کر کھاتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارے دیسی پکوڑوں جیسے ہیں۔ یا نہیں؟" مرچوں کے اثرات سے ان کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا اور ان کے ہونٹوں پہ لپ اسٹک مدھم پڑ گئی تھی اور وہ مسٹر سین کی ہر بات پہ کھل کر قہقہے لگا رہی تھیں۔

اس ریسٹورنٹ کی عقبی طرف ایک چھوٹی سی ساحلی پٹی تھی۔ یہ لوگ کھانے سے فراغت کے بعد وہیں چہل قدمی کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ مسز سین نے چلتے چلتے سمندر کی لہروں کی طرف اشارہ کیا اور بولیں کہ کبھی کبھی انہیں ایسا لگتا ہے جیسے یہ لہریں تار پہ لٹکی اس ساڑھی کی طرح ہیں جسے سوکھنے کے لیے ڈالا گیا ہو۔۔۔ ہوا اس قدر تیز چل رہی تھی کہ انہیں کچھ دیر بعد ہی الٹے قدموں چلنا پڑا۔ "ناممکن ہے، میں تو اس ہوا میں نہیں چل سکتی!" مسز سین واپس مڑیں اور انہوں نے ہنستے ہوئے چیخ کر کہا۔ ان کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ انہوں نے ساحل کی ریت پر کھڑے ایلپٹ اور مسٹر سین کی تصویر لی۔ اس کے بعد انہوں نے کیمرہ مسٹر سین کو پکڑا یا اور خود ایلپٹ کے ساتھ جا کھڑی ہوئیں۔ ایلپٹ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے وہ بولیں: "اب ہماری تصویر لیں۔" اس کے بعد اپنی اور مسز سین کی تصویر لینے کے لیے کیمرہ ایلپٹ کو دیتے ہوئے مسٹر سین بولے: "اسے مضبوطی سے پکڑو اور دیکھو تصویر بناتے ہوئے کیمرہ ہلے نہیں!" ایلپٹ نے کیمرے کی چھوٹی سی کھڑکی سے آنکھ لگالی۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ مسٹر اور مسز سین ایک دوسرے سے جڑ کے کھڑے ہوں تو وہ کیمرے کا بٹن دبائے لیکن ان دونوں کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تصویر بناتے ہوئے نہ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے اور نہ ہی بازو ایک دوسرے کی کمروں کے گرد جمائل کیے۔ دونوں نے محض بند ہونٹوں کے ساتھ مسکرا نے پر اکتفا کیا۔ ہوا کی شدت سے انہوں نے آنکھیں کسی قدر میچر رکھی تھیں اور مسز سین کی سرخ ساڑھی کوٹ کے نیچے یوں پھڑ پھڑا رہی تھی جیسے آگ کے شعلے لپک رہے ہوں۔

جب وہ واپسی کے لیے محو سفر ہوئے تو کھانے کے اثرات اور سمندری ہواؤں کا مقابلہ کرنے کے سبب کچھ مضحک ہو چکے تھے۔ باہر کی تیز ہواؤں کے مقابلے میں گاڑی کا درجہ حرارت بہت سکون بخش تھا اس لیے وہ ساحل پہ بنے ریت کے ٹیلوں، دور سمندر میں چلتے بحری جہازوں، لائٹ ہاؤس اور رنگ بدلتے سرخ اور ارغوانی آسمان کو بہ نظر تحسین دیکھتے آگے بڑھتے گئے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد مسٹر سین نے گاڑی آہستہ کر کے سڑک کے کنارے روک دی۔

"کیا مسئلہ ہے؟" مسٹر سین نے سوال کیا

"یہاں سے تم گاڑی چلا کر آج ہمیں گھر لے جاؤ گی۔"

"نہیں، آج نہیں!"

"ہاں، آج ہی!" مسٹر سین گاڑی سے اتر کر دوسری طرف آئے اور مسٹر سین کا دروازہ کھول دیا۔ جیسے ہی گاڑی کا دروازہ کھلا تند ہوا کے جھونکے اور ساحل سے سرچلتی سمندری موجوں کا شور گاڑی میں در آئے۔ بہت حیل جھت کے بعد بالآخر مسٹر سین ڈرائیونگ سیٹ پہ براجمان ہوئیں لیکن وہ کافی دیر اپنی ساڑھی اور چشمے درست کرتی رہیں۔ ایلین نے مڑ کر عقبی شیشے سے سڑک پہ نظر دوڑائی۔ یہ سنسان پڑی تھی۔ مسٹر سین نے ریڈیو آن کر دیا اور گاڑی میں تیز وائلن بجنے لگا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے!" مسٹر سین نے ریڈیو آف کرتے ہوئے کہا۔

"یہ مجھے ڈرائیونگ کے دوران توجہ مرکوز رکھنے میں مدد دیتا ہے۔" مسٹر سین نے جواب دیا اور ریڈیو دوبارہ آن کر دیا۔

"اپنی طرف کا اشارہ لگاؤ۔" مسٹر سین نے ہدایت دی۔

"مجھے پتہ ہے کیا کرنا ہے۔"

لگ بھگ ایک میل تک مسٹر سین بڑی روانی سے ڈرائیونگ کرتی رہیں اگرچہ ان کی رفتار سڑک سے گزرتی دوسری گاڑیوں کے مقابلے میں بہت آہستہ تھی۔ لیکن جیسے ہی وہ آبادی کے قریب پہنچیں اور تاروں پہ لٹکتے ٹریفک کے اشارے دور سے دکھائی دینے لگے انہوں نے اپنی رفتار مزید دھیمی کر دی۔

"اپنی لین بدل لو۔" مسٹر سین بولے۔ "آگے گول چکر میں تمہیں بائیں طرف رہنا ہے۔"

لیکن مسٹر سین نے لین نہ بدلی۔

"اپنی لین بدل لو، میں تمہیں کہہ رہا ہوں۔" مسٹر سین نے ریڈیو بند کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم مجھے سن رہی ہو؟"

پیچھے سے آنے والی ایک گاڑی نے زور سے ہارن بجایا، اس کے بعد ایک اور گاڑی زور سے چیخی۔ مسٹر سین نے جواب میں اسی زور سے ہارن بجایا اور پھر اشارہ دیے بغیر سڑک کے ایک طرف ہو کر یک دم انہوں نے بریک لگا دی۔ "مجھ

سے نہیں چلتی۔" اپنا سر اسٹیرنگ وہیل پہ ٹکاتے ہوئے وہ بولیں۔ "مجھے نفرت ہے اس سے، مجھے نفرت ہے اس ڈرائیونگ سے، مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔"

اس واقعے کے بعد مسز سین نے ڈرائیونگ یکسر ترک کر دی۔ کچھ روز بعد جب مچھلی مارکیٹ سے انہیں تازہ مچھلی کی دستیابی کا فون آیا تو انہوں نے مسٹر سین کو بلانے کے لیے فون بھی نہیں کیا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کوئی اور طریقہ ڈھونڈیں گی۔ اس علاقے میں یونیورسٹی سے لے کر ساحل سمندر تک ہر گھنٹے کے وقفے سے ایک بس چلتی تھی مسز سین ایلپٹ کو لے کر اسی بس میں سوار مچھلی مارکیٹ کے لیے روانہ ہو گئیں۔ یونیورسٹی کے بعد اس بس کے دو اسٹاپ تھے۔ پہلا اسٹاپ ایک نرسنگ ہوم کے سامنے تھا اور دوسرا اس بے نام شاپنگ پلازے کے سامنے جس میں کتابوں، جوتوں، دوائیوں اور کیسٹوں کی ایک ایک دکان کے علاوہ پالتو جانوروں کی ایک دکان بھی تھی۔ جب وہ پہلے اسٹاپ پہرے تو نرسنگ ہوم کے داخلی دروازے کے سامنے رکھے بچوں پہ بوڑھی عورتیں دو دو کا گروپ بنائے بیٹھی گلا صاف کرنے والی گولیاں چوس رہی تھیں۔ انہوں نے گھٹنوں تک لمبے اوور کوٹ پہن رکھے تھے۔ ان کوٹوں کے بٹن اپنے جیم میں کچھ زیادہ ہی بڑے تھے۔

"ایلپٹ!" مسز سین نے بس کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا آپ بھی اپنی امی کو بڑھاپے میں کسی نرسنگ ہوم میں چھوڑ دو گے؟"

"ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن میں ان سے ملنے ہر روز آیا کروں گا۔"

"اب تو تم یہ کہہ رہے ہو لیکن جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو نہ جانے زندگی تمہیں یہاں سے کھینچ کر کتنا دور لے جائے۔ ان جگہوں میں جن کے بارے میں تم ابھی سوچ بھی نہیں سکتے۔" مسز سین نے یہ کہہ کر اپنی انگلیوں پہ سال گنے اور اپنی بات جاری رکھی۔ "تمہاری ایک بیوی ہوگی، اپنے بچے ہوں گے اور وہ ضد کریں گے کہ تم انہیں مختلف جگہوں پہ گھمانے لے جاؤ۔ وہ کتنے بھی اچھے کیوں نہ ہوں لیکن ایک دن وہ یہ ضرور شکایت کریں گے کہ تم روز روز ماں کے پاس کیوں جاتے ہو۔ تم خود بھی نرسنگ ہوم کے چکر لگا لگا کر تھکے چکے ہو گے اس لیے تم پہلے ایک دن کا ناغہ کرو گے پھر دو دن کا پھر یہ فاصلہ بڑھتا جائے گا یہاں تک کہ ایک دن آئے گا جب تمہاری بوڑھی ماں گلا صاف کرنے والی گولیاں لینے کے لیے بھی خود ہی بسوں پہ گرتے پڑتے دھکے کھا رہی ہوگی۔"

مچھلی فروش کی دکان پہ مچھلیاں رکھنے والے بریلے بکس تقریباً خالی پڑے تھے اور جھینگوں والا ٹینک بھی ویران تھا۔ اس ٹینک کی تہہ میں زنگ کے نشان اب واضح نظر آرہے تھے۔ دکان پہ ایک نوٹس آویزاں تھا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ یہ دکان موسم سرما کے باعث اس ماہ کے اختتام تک بند ہو جائے گی۔ کاؤنٹر کے پیچھے صرف ایک نو عمر لڑکا کام

کر رہا تھا جس نے مسز سین کو نہیں پہچانا۔ جب اس نے مچھلیوں کا پیکٹ جو مسز سین کے نام پہ ریزرو تھا انہیں پکڑا یا تو وہ بولیں:

"ان کی صفائی کر دی گئی ہے؟ چھلکے اترے ہوئے ہیں؟"

لڑکے نے کندھے اچکائے۔ "میرا باس آج جلدی چلا گیا۔ اس نے مجھے صرف یہ ہی بتایا کہ میں یہ آپ کو دے دوں۔"

پارکنگ میں مسز سین نے بس کے اوقات کا شیڈول دیکھا تو اگلی بس کے روانہ ہونے میں ابھی ۴۵ منٹ باقی تھے اس لیے وہ سڑک پار کر کے ریسٹورنٹ پہنچے اور پچھلی دفعہ کی طرح جھینگوں کے پکوڑے خریدے لیکن اب بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ ساحل پہ رکھی گئی کرسیوں پر میزوں کو الٹ کر انہیں زنجیروں سے باندھ دیا گیا تھا۔

گھر واپسی پہ بس میں ایک بوڑھی عورت ان کو سارے رستے گھورتی رہی۔ وہ کبھی مسز سین کو دیکھتی کبھی ایلین کو اور کبھی اس مچھلیوں والے بیگ کو جو ان کے پاؤں میں پڑا تھا۔ اس عورت نے سیاہ رنگ کا اوور کوٹ پہن رکھا تھا اور اس نے گود میں، اپنے جھریوں زدہ، زرد ہاتھوں میں، دواؤں کا ایک سفید لفافہ اٹھا رکھا تھا۔ اس بڑھیا کے علاوہ بس میں صرف کالج کے ایک لڑکا لڑکی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آخری سیٹ پہ ڈھیلے ڈھالے بیٹھے تھے۔ اس پریمی جوڑے نے ایک ہی رنگ کی جرسیاں پہن رکھی تھیں۔ مسز سین اور ایلین نے خاموشی سے آخری بچے کچے جھینگوں کے پکوڑوں پر ہاتھ صاف کیے اور چونکہ مسز سین نیپکن لانا بھول گئی تھیں اس لیے کچھ ذرات ان کے ہونٹوں کے کنارے پہ لگے رہ گئے۔ جب بس نرسنگ ہوم والے اسٹاپ پہ پہنچی تو وہ اوور کوٹ والی بوڑھی عورت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈرائیور سے کچھ کہنے کے بعد بس سے اتر گئی۔ ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر مسز سین کو دیکھا اور پھر بولا: "اس بیگ میں کیا ہے؟"

مسز سین نے اوپر دیکھا۔ اس سوال پہ وہ بھونچکا رہ گئی تھیں۔

"انگلش بول سکتی ہو؟" ڈرائیور نے پھر پوچھا۔

بس اب دوبارہ چل پڑی تھی اس لیے ڈرائیور اب براہ راست پیچھے دیکھنے کی بجائے اپنے سامنے لگے لمبے چوڑے عقبی آئینے میں مسز سین اور ایلین کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں، میں بول سکتی ہوں۔"

"پھر بتائیں اس بیگ میں کیا ہے؟"

"مچھلی ہے۔" مسز سین نے مختصر جواب دیا۔

"اس کی بو سے دوسرے مسافر پریشان ہو رہے ہیں۔ بچے! آپ اپنے طرف والی کھڑکی کھول دو۔"

کچھ روز بعد ایک دوپہر فون کی گھنٹی بجی۔ اسی دکاندار نے مسز سین کو تازہ مچھلی کی آمد کی اطلاع دی اور پوچھا کہ کیا وہ مچھلی خریدنا چاہیں گی؟ مسز سین نے مسٹر سین کو فون لگایا لیکن وہ اپنے دفتر موجود نہ تھے۔ انہوں نے دوسری دفعہ کوشش کی پھر تیسری دفعہ لیکن بات نہ ہو سکی۔ بالآخر انہوں نے یہ کوشش ترک کر دی اور باورچی خانے سے جا کر اپنی چھری، ایک بینگن اور پرانے اخبار کے کچھ صفحات اٹھالائیں۔ ایلین نے بغیر بتائے صوفے پر جا کے اپنی پوزیشن سنبھال لی اور وہ مسز سین کو بینگن کاٹتے ہوئے دیکھنے لگا۔ مسز سین نے پہلے بینگن کے لمبائی کے رخ حصے کیے پھر ان قاشوں کے مزید چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر ڈالے۔

"مچھلی میں بینگن اور سبز کیلے ملا کر بہت مزیدار سالن بنتا ہے۔" مسز سین نے ایلین کو بتایا۔ "لیکن مجھے سبز کیلوں کے

بغیر ہی یہ سالن بنانا پڑے گا۔"

"کیا ہم مچھلی لینے جائیں گے؟"

"ہم مچھلی لینے جا رہے ہیں۔"

"کیا مسٹر سین ہمیں لینے آئیں گے؟"

"آپ اپنے بوٹ پہنو۔"

وہ سبزی کٹنے کے نشانات صاف کیے بغیر اپارٹمنٹ سے نکل پڑے۔ باہر اس غضب کی ٹھنڈ پڑ رہی تھی کہ ایلین اس کی شدت اپنے دانتوں پہ بھی محسوس کر رہا تھا۔ وہ کار میں سوار ہوئے اور مسز سین نے کمپلیکس کے گرداگرد پھری تارکول کی سڑک پہ چکر لگانے شروع کر دیے۔ ہر دفعہ جب وہ دیودار کے پیڑوں کے اس جھنڈ کے پاس پہنچتے جہاں سے یہ ذیلی سڑک مرکزی سڑک سے مل رہی تھی تو مسز سین تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر کر مرکزی سڑک سے گزرنے والی ٹریفک کا انتظار کرتیں۔ ایلین سمجھ رہا تھا کہ وہ مسٹر سین کے آنے کا انتظار کر رہی ہیں اور وقت کاٹنے کے لیے محض ڈرائیونگ کی مشق کر رہی ہیں لیکن پھر ایک دفعہ مسز سین نے اشارہ آن کر کے اپنی کار موڑی اور مرکزی سڑک پہ ڈال دی۔

حادثہ آنا فانا وقوع پذیر ہوا۔ مرکزی سڑک پہ لگ بھگ ایک میل جانے کے بعد مسز سین نے ایسی جگہ سے گاڑی کو اچانک بائیں سمت موڑا جہاں سے انہیں ابھی نہیں مڑنا چاہیے تھا۔ سامنے سے آنے والی کار اگرچہ لہرا کر ان کی زد سے بچتی نکل گئی لیکن اس کے ہارن کی آواز سے مسز سین اس قدر بوکھلا گئیں کہ وہ گاڑی پر قابو نہ رکھ سکیں اور کار سڑک کے کنارے نصب ٹیلی فون کے کھمبے سے جا ٹکرائی۔ فوراً ہی ایک پولیس والا حادثے کی جگہ پر آن وارد ہوا اور مسز

سین سے لائنس طلب کیا لیکن ان کے پاس تو ابھی کوئی لائنس نہ تھا۔ حواس باختہ مسز سین پولیس والے کو وضاحت کے ضمن میں بس اتنا بتا سکیں: "مسٹر سین یونیورسٹی میں ریاضی پڑھاتے ہیں۔"

حادثے سے ہونے والا نقصان بہت معمولی تھا۔ مسز سین کے ہونٹوں پہ کٹ لگا تھا اور ایلینے نے اپنی پسلیوں میں تھوڑی دیر درد کی شکایت کی تھی جبکہ کار کافینڈر^{۵۹} کسی قدر ٹیڑھا ہو گیا تھا اس لیے اسے سیدھا کروانے کی ضرورت تھی۔ پولیس والے کو خدشہ تھا کہ شاید مسز سین کے سر پہ بھی چوٹ آئی ہے لیکن ان کی مانگ میں موجود سرخی سینڈور کے سبب تھی اور ان کا سر محفوظ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مسٹر سین اپنے ایک دوست کے ساتھ جائے حادثہ پر پہنچے تو وہ کافی دیر تک پولیس والے سے بات چیت کرتے اور کچھ فارم بھرتے رہے لیکن جب وہ انہیں گاڑی میں واپس گھر لے جا رہے تھے تو انہوں نے مسز سین سے کوئی بات نہیں کی۔ گاڑی سے اترتے ہوئے مسٹر سین نے ایلینے کا سر پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا: "پولیس والا کہہ رہا تھا کہ آپ بہت خوش قسمت رہے۔ آپ کو حادثے میں خراش تک نہیں آئی۔"

جوتے اتار کر کتابوں کی چھوٹی سی الماری میں رکھنے کے بعد مسز سین نے گھر میں داخل ہوتے ہی جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے لونگ روم میں رکھی چھری اٹھا کر الماری میں رکھ دی اور بینگن کے کٹے ہوئے ٹکڑے اور اخبار کے صفحات اٹھا کر کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دیے۔ پھر انہوں نے ایک پلیٹ میں کریم والے بسکٹ رکھ کر کافی کی میز پر رکھ دیے اور ایلینے کے لیے ٹیلی ویژن آن کر دیا اور مسٹر سین سے مخاطب ہو کر وہ بولیں: "اگر اس کو مزید بھوک لگے تو فریج سے نکال کر اسے آئس کریم دے دیجیے گا۔" مسٹر سین اس وقت میز پہ بیٹھے ڈاک دیکھ رہے تھے۔ مسز سین اس کے بعد اپنی خواب گاہ میں چلی گئیں اور انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔

جب پونے چھ بجے ایلینے کی امی اس کو لینے آئی تو مسٹر سین نے اس کو حادثے کی ساری تفصیلات بتائیں اور یہ پیشکش کی کہ وہ نومبر کے لیے کی گئی ادائیگی چیک کے ذریعے واپس لے لیں۔ جب وہ چیک لکھ رہے تھے تو انہوں نے مسز سین کے طرف سے بھی معذرت کی اور بتایا کہ وہ آرام کر رہی ہیں ورنہ خود آکر سوری کرتیں۔ اگرچہ ایلینے جانتا تھا کہ مسز سین آرام نہیں کر رہیں کیونکہ جب وہ واش روم گیا تھا تو اس نے خواب گاہ سے مسز سین کے رونے کی آواز سنی تھی۔ ایلینے کی ماں مطمئن تھی اور جب وہ واپس گھر جا رہے تھے تو اس نے ایلینے سے اعتراف کیا کہ اس کے دل میں جو ایک کھٹکا سا لگا رہتا تھا اب اس سے جان چھوٹ گئی ہے۔ یہ وہ آخری شام تھی جو ایلینے نے مسز سین کے پاس گزاری یا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ آخری شام تھی جو ایلینے نے کسی بھی آیا کے ساتھ گزاری کیونکہ اس کے بعد اس کی ماں نے گھر کی ایک چابی اس کے حوالے کی اور اسے ہدایت کی کہ وہ اسکول سے آنے کے بعد خود ہی گھر آ

جایا کرے اور اگر کوئی ایمر جنسی ہو تو پڑوسیوں کو فون کر لے۔ ایلٹ نے یہ چابی ایک دھاگا ڈال کے اپنے گلے میں لٹکا لی۔ پہلے دن جب وہ اسکول سے گھر پہنچا تو ابھی کوٹ اتار ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس کی ماں اپنے دفتر سے کال کر رہی تھی۔ "ایلٹ اب آپ بچے نہیں ہو بڑے ہو گئے ہو۔ آپ ٹھیک ہونا؟ کوئی مسئلہ تو نہیں نا؟" ایلٹ نے کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی جہاں ڈھلتی شام میں سمندر کی سرمئی موجیں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر واپس سمندر میں گم ہو رہی تھیں اور اس نے دھیمے سے لہجے میں ماں کو بتایا کہ وہ ٹھیک ہے اور اسے کوئی مسئلہ نہیں!

مبارک گھر

نئے گھر میں انہیں پہلی دفعہ ایسی کوئی چیز انگلیٹھی کے اوپر بنی الماری میں سر کے کی بند بوتل کے ساتھ پڑی ملی۔ "دیکھو تو مجھے کیا ملا ہے؟" ٹوئل نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا جہاں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک سامان کے بند ڈبے قطار میں پڑے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں جو کے سر کے کی بوتل اور دوسرے میں لگ بھگ اسی جسامت جتنی چینی کی مٹی سے بنی یسوع مسیح کی سفید مورت تھی۔ سنجیو نے ٹوئل کی آواز پہ سراٹھا کے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت دیوار کے نچلے حاشیے پہ جہاں سے رنگ اکھڑ گیا تھا نشاندہی کے لیے چپکنے والے کاغذ کے پیلے ٹکڑے لگا ہوا تھا۔ "باہر پھینک دو۔"

"کس کو؟"

"دونوں کو۔"

"لیکن سر کہ تو بالکل نیا ہے میں اسے کھانا پکانے میں استعمال کر سکتی ہوں۔"

"تم نے آج تک تو سر کہ ملا کے کبھی کچھ پکایا نہیں تو اب بھلا کیسے پکا لو گی؟"

"میں کچھ کر لوں گی۔ شادی کے بعد میں نے کھانا پکانے کی ترکیبوں والی جو کتابیں خریدی تھیں ان میں سے کچھ دیکھ لوں گی۔"

سنجیو دوبارہ دیوار کے نچلے حاشیے کی طرف متوجہ ہو گیا اور دیوار سے گرے پیلے کاغذ کے ایک ٹکڑے کی جگہ دوسرا ٹکڑا اچپکاتے ہوئے کہنے لگا۔ "اچھا چلو بوتل پہ اس کے زائد المعیاد ہونے کی تاریخ ضرور دیکھ لینا۔ اور کم از کم اس کو اس پتلے کو تو باہر پھینک دو!"

"کیوں پھینکوں؟ ہو سکتا ہے یہ بے کار نہ ہو۔ کون جانے؟" ٹوئل نے مورت کو الٹا کیا، اسے اپنی انگلی سے بجا کر دیکھا اور پھر اس کے چھوٹے سے لباس کی ابھری ہوئی چھوٹی چھوٹی تہوں پہ انگلی پھیرتے ہوئے بولی: "بہت دلکش ہے یہ۔"

"ہم مسیحی نہیں ہیں!" سنجیو نے مسیحی پر زور دیتے ہوئے کہا۔ کچھ عرصے سے اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ٹوئل کو بہت عام سی باتیں بھی سمجھانی پڑتی ہیں۔ جیسے ابھی کل ہی اسے ٹوئل کو بتانا پڑا تھا کہ وہ میز کو اٹھاتے ہوئے اپنی طرف سے فرش پہ رگڑ نہ کھانے دے ورنہ چوبی فرش پہ خراشیں پڑ جائیں گی۔

"نہیں ہم مسیحی نہیں، ہم بہت اچھے ہندو ہیں!" ٹوئل نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے مورت کے سر کو

بوسہ دیا اور اسے آتش دان پہ بنی شیلف پہ رکھ دیا۔ سنجیو کے خیال میں دھول سے اٹے اس شیلف کو صفائی کی فوری ضرورت تھی۔ لیکن ہفتے کے اختتام تک بھی اس کو کسی نے جھاڑنے کی زحمت نہیں کی تاہم یہ اب ایک ایسی نمائش شیلف بن چکی تھی جس کے اوپر بھانت بھانت کے مسیحی تبرکات کی ایک بڑی تعداد جمع ہو چکی تھی۔ اس پہ اب ایک چار رنگوں میں چھپا سینٹ فرانسس^{۱۰} کا تھری ڈی پوسٹ کارڈ رکھا تھا جو ٹونکل کو ادویات والی الماری کے اندر ٹیپ سے چپکا ہوا ملا تھا۔ یہاں اب لکڑی کا بنا چابی کا وہ صلیبی چھلا بھی رکھا تھا جس پر ٹونکل کے مطالعے کے کمرے میں الماریاں لگاتے ہوئے سنجیو کا اتفاقا پاؤں آگیا تھا۔ یہاں اب تین مسیحی داناؤں^{۱۱} کی سہ رنگی فریم شدہ تصویر بھی رکھی تھی جس کا پس منظر سیاہ مخمل سے بنایا گیا تھا اور جو ایک چھوٹی سی لیلن کی بنی الماری میں جڑی تھی۔ کارنس پہ اب کھانے کے کمرے کی ایک دراز سے ملنے والا وہ چھوٹا سا ماڈل بھی رکھا تھا جس میں سپید رنگت اور سرخ بالوں والے یسوع کو ایک پہاڑی کی چوٹی پہ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے دکھایا گیا تھا۔ اس ماڈل میں یسوع داڑھی سے عاری تھے۔

"مجھے لگتا ہے اس مکان کے سابقہ مالک کٹر عیسائی تھے جو مسیح کے ذریعے روحانی پیدائش پہ یقین رکھتے ہوں گے، ہے نا؟" ٹونکل نے سنجیو سے دوسرے دن اس وقت پوچھا جب وہ شیلف پہ ایک گنبد کی شکل میں بنائے گئے پلاسٹک کے اس ماڈل کے لیے جگہ بنا رہی تھی جس میں یسوع مسیح کی پیدائش کا منظر دکھایا گیا تھا اور جو اسے کچن میں سنک کے پائپوں کے پیچھے پڑا ہوا ملا تھا۔

سنجیو اس وقت اپنی ایم آئی ٹی^{۱۲} کی کتابوں کو حروف تہجی کی ترتیب سے الماری میں جوڑ رہا تھا اگرچہ پچھلے کئی سالوں سے اسے یہ کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ گریجویشن کے بعد وہ بوسٹن سے کوئیکٹیکٹ منتقل ہو گیا تھا جہاں وہ ہارٹفورڈ^{۱۳} کے نزدیک ایک فرم میں کام کرتا تھا۔ ابھی کچھ روز قبل ہی اسے پتہ چلا تھا کہ اس فرم میں اس کا نام نائب صدر کے عہدے کے لیے زیر غور تھا۔ صرف تینتیس سال کی عمر میں ہی اس نے اس قدر ترقی کر لی تھی کہ اس کی اپنی سیکریٹری تھی اور درجن بھر لوگ اس کے ماتحت کام کرتے تھے۔ کمرے میں کالج کی کتابوں کی موجودگی اسے ماضی کے ان خوشگوار دنوں کی یاد دلاتی تھی جب وہ ہر شام میسی چیوسٹ ایونیو کے پل کو پار کر کے دریائے چارلس کے دوسرے کنارے پہ بنے اپنے محبوب ہندوستانی ریستورانٹ میں مغلائی چکن اور پالک کھانے جایا کرتا تھا اور واپس آ کے اپنے ہاسٹل کے کمرے میں دوبارہ ریاضی کی گتھیاں سلجھانے میں جت جاتا تھا۔

"یا شاید یہ لوگوں کو عیسائی بنانے کی ایک کوشش بھی ہو سکتی ہے۔" ٹونکل نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"اگر ایسا ہے تو ان کا منصوبہ کم از کم تمہاری حد تک تو کامیاب ہو گیا ہے۔"

ٹونکل نے سنجیو کی اس چوٹ پہ کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ گنبد نما پلاسٹک کے ماڈل کو الٹ کر اس میں بنی برف کے

جانوروں کی کھری پہ گرنے کا نظارہ کر رہی تھی۔

سنجیو نے آتش دان کی شیلف پہ رکھی ان چیزوں پہ ایک ایک کر کے غور کرنا شروع کیا۔ یہ بات اسے الجھا رہی تھی کہ ان میں سے ہر شے اپنے طور پر کس قدر لایعنی اور احمقانہ ہے۔ ان سب میں اسے کہیں تقدس کا کوئی پہلو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے اس امر پہ حیرت ہو رہی تھی کہ ٹوئکل، جس کا عمومی احساس جمال بہت عمدہ تھا، ان بے کار چیزوں کی طرف کیوں کھنچی چلی جا رہی ہے۔ ان چیزوں میں ٹوئکل کے لیے کشش ہو سکتی تھی لیکن سنجیو کو ان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اسے انہیں دیکھ کر چڑسی ہو رہی تھی۔ "ہمیں اسٹیٹ ایجنٹ کو فون کرنا چاہیے اور اسے بتانا چاہیے کہ پہلے رہنے والے لوگ یہ الم علم چیزیں یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ اسے کہتے ہیں کہ وہ یہ سب اٹھا کر لے جائے۔" "اوہ، سنخ!" ٹوئکل جذباتی سے لہجے میں بولی۔ "ان کو باہر پھینکتے ہوئے مجھے بہت اذیت ہو گی۔ یہ ہمارے لیے اہم نہیں ہیں لیکن ان لوگوں کے لیے تو بہت اہم تھے جو ہم سے پہلے یہاں رہتے رہے ہیں۔ ان کو پھینکتے ہوئے مجھے تو سخت بے حرمتی کا احساس ہو گا۔"

"اگر یہ اتنے ہی قیمتی اور مقدس ہیں تو وہ لوگ انہیں یوں گھر میں جگہ جگہ کیوں چھپا گئے ہیں؟ وہ انہیں ساتھ لے کر کیوں نہیں گئے؟"

"ان کے علاوہ بھی کچھ اور چیزیں ہوں گی۔" ٹوئکل بولی۔ اس کی آنکھیں کمرے کی خالی سفید دیواروں کو یوں متجسسانہ انداز میں کھوج رہی تھیں جیسے پلستر کے پیچھے بھی کچھ چھپا ہو۔ "تمہارے خیال میں ابھی ہمیں اور کیا کیا چیزیں ملیں گی؟"

جب انہوں نے سامان کے ڈبے کھول کر سردیوں کے کپڑے اور ہاتھی رتھ والے جلو سوں کی وہ ریشمی پینٹنگز جو انہوں نے بے پور میں ہنی مون کے دوران خریدی تھیں دیواروں پر لٹکانی شروع کیں تو ٹوئکل کو سخت مایوسی ہوئی کیونکہ وہ کوئی نئی چیز نہیں کھوج پائی تھی۔ یوں ہی کسی نئی دریافت کے بغیر لگ بھگ سات دن بیت گئے کہ اچانک ہفتے کی شام کو انہیں بیٹھک میں ہیٹر کے ریڈی ایٹر کے پیچھے ایک رول کیا ہوا جہازی سائز کا پوسٹر ملا۔ پوسٹر پہ واٹر کلر سے یسوع مسیح کی شبیہ بنی ہوئی تھی۔ یسوع کی آنکھوں سے موٹے موٹے شفاف آنسو بہہ رہے تھے اور ان کے سر پہ کانٹوں کا تاج تھا۔ سنجیو اسے پہلے کھڑکی کا پردہ سمجھتا رہا تھا۔

"واہ! ہمیں ضرور اسے دیوار پہ سجانا چاہیے۔ کتنی شاندار ہے نایہ پینٹنگ!" ٹوئکل نے سگریٹ سلگایا اور بڑے مزے سے اس کا کش لیتے ہوئے سنجیو کے سامنے سگریٹ کو یوں لہرایا جیسے وہ کسی آرکسٹر اوائلے کی چھڑی ہو۔ نچلی منزل سے ریکارڈر پہ مالر^{۱۳} کی پانچویں سمفونی بج رہی تھی۔

"دیکھو! میں تمہارے اس بائبل کے چڑیا گھر کی یہ چھوٹی چھوٹی چیزوں تو لونگ روم میں برداشت کر لوں گا لیکن اتنی بڑی پینٹنگ کو اپنے گھر میں نہیں سجانے دوں گا۔" سنجیو نے تصویر میں مونگ پھلی کے دانوں جتنے موٹے موٹے آنسوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ٹونکل نے گھور کر اسے دیکھا اور زور سے لمبی سانس خارج کی۔ اس کے نتھنوں سے نیلے دھوئیں کی دوپٹی لکیریں نکل کر ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔ اس نے پوسٹر کو بڑی احتیاط سے رول کیا اور اس پہ اپنی کلائی سے اتار کر ربر بینڈ چڑھا دیا۔ یہ بینڈ وہ ہر وقت اپنی کلائی پہ چڑھائے رکھتی تھی تاکہ اس کی گھنی زلفیں جب الجھنے لگیں تو وہ اس کی مدد سے ان کو سلجھا سکے۔ اس کے بالوں پہ مہندی کا رنگ غالب تھا۔ "میں اس پوسٹر کو اپنے مطالعے کے کمرے میں لگاؤں گی اس طرح تمہیں اس کو دیکھنا نہیں پڑے گا۔"

"نئے گھر کی پارٹی کا کیا کریں گے پھر؟ مہمان سارا گھر گھوم پھر کے دیکھنا چاہیں گے۔ میں نے اپنے دفتر کے لوگوں کو بھی مدعو کر رکھا ہے۔"

نچی منزل سے اٹھتی سمفونی کی دھن اب اپنے عروج پہ پہنچ چکی تھی۔

ٹونکل نے اپنی آنکھیں مکائیں اور بولی: "میں اسے دروازے کے پیچھے لگا دوں گی۔ اس طرح جب وہ کمرے میں جھانکیں گے تو انہیں یہ دکھائی نہیں دے گا۔ اب خوش؟"

یہ کہتے ہوئے ٹونکل پوسٹر کو بغل میں دبائے کمرے سے نکل گئی۔ سنجیو اسے جاتے ہوئے چپ چاپ دیکھتا رہا۔ جہاں وہ کھڑی تھی اس جگہ سگریٹ کی کچھ راکھ فرش پہ بکھر گئی تھی۔ سنجیو نے نیچے جھک کر چٹکی سے یہ راکھ اپنی دوسری ہتھیلی میں جمع کی۔ نیچے بجتی آرکسٹرا کی دھن میں اب نرمی آگئی تھی۔ ناشتہ کرتے ہوئے سنجیو نے ریکارڈ کے لیبل پہ لکھی یہ عبارت پڑھی تھی کہ موسیقار ماہلر نے اپنی بیوی کو شادی کی پیشکش اس دھن کی کمپوزیشن کا مسودہ بھیج کر کی تھی۔ سنجیو نے پڑھا تھا کہ ماہلر کی پانچویں سمفونی میں اگرچہ المیہ اور جدوجہد کے عناصر شامل تھے لیکن بنیادی طور پر اس کی موسیقی مسرت و شادمانی اور محبت کا لطیف اظہار تھی۔

سنجیو کو ٹائلٹ میں فلش کرنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ٹونکل نے چلا کر کہا: "ویسے سنجیو اگر تم لوگوں کو متاثر کرنا چاہتے ہو تو یہ دھن نہ چلانا۔ مجھے تو اسے سن کے ہی نیند آرہی ہے۔"

سنجیو راکھ گرانے ٹائلٹ پہنچا تو سگریٹ کا ٹوٹا ابھی تک پانی پہ تیر رہا تھا لیکن ٹینک چونکہ خالی تھا اس لیے دوبارہ فلش کرنے کے لیے اسے پانی کے ٹینک میں بھرنے کا انتظار کرنا پڑا۔ ٹائلٹ کی الماری پہ لگے شیشے میں اس نے اپنی لمبی پلکوں پہ نگاہ ڈالی۔ ٹونکل اسے چھیڑنے کے لیے کہتی تھی کہ اس کی پلکیں لڑکیوں کی طرح ہیں۔ اگرچہ اس کی جسمانی

ساخت بس اوسط درجے کی تھی لیکن اس کے گال بھرے بھرے تھے اور اس کو لگتا تھا کہ اس کی لمبی پلکوں اور بھرے گالوں نے اس کی ممکنہ مردانہ وجاہت کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا قد بھی میانہ تھا اور جب سے اس میں بڑھوتری کا عمل رکا تھا تب سے اس کی یہ خواہش رہی تھی کی کاش اس کا قد ایک آدھ انچ اور لمبا ہو جاتا۔ اسی وجہ سے جب بھی ٹونکل اونچی ایڑی والے جوتے پہننے پہ اصرار کرتی تو وہ چڑ جاتا تھا۔ جیسے ابھی کل ہی جب وہ شام کا کھانا باہر کھانے مین ہٹن^{۱۵} کی طرف نکلے تو ٹونکل نے اونچی ایڑی پہن کر اس کا موڈ خراب کر دیا تھا۔ نئے گھر میں منتقل ہونے کے بعد یہ ان کا پہلا ویک اینڈ تھا۔ آتش دان پہ بنی شلف مسیحی دریا فتوں سے تقریباً بھر چکی تھی اس لیے سارے رستے کار میں وہ دونوں اسی مسئلے پہ جھک جھک بک بک کرتے رہے تھے۔ لیکن پھر الفابیٹ سٹی^{۱۶} کے ایک بے نام میخانے میں وہسکی کے چار گلاس گٹکنے کے بعد ٹونکل یہ ساری تکرار بھول بھال گئی۔ وہ اسے کھینچ کر سینٹ مارک اسٹریٹ پہ ایک چھوٹی سی کتابوں کی دکان میں لے آئی جہاں لگ بھگ آدھا گھنٹہ وہ کتابیں چھانتی رہی اور جب وہ باہر نکلے تو اس کا اصرار تھا کہ وہ دنوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر راہ چلتے اجنبی لوگوں کے سامنے فٹ پاتھ پہ رقص کریں۔

وہ جب چلنے لگے تو ٹونکل سنجیو کے کندھوں پہ جھولنے لگی۔ شراب چڑھانے کے بعد تین انچ لمبی ایڑی والی جوتیوں میں سیدھا چلنا اس کے لیے محال ہو رہا تھا۔ سنجیو نے اس کی کمر کے گرد بازو جمائل کر کے اسے سہارتے ہوئے چلانا شروع کیا۔ یوں ہی چلتے چلتے وہ کئی بلاک دور واشنگٹن اسکوائر پہنچے جہاں ایک پارکنگ گیراج میں سنجیو نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ مین ہٹن میں گاڑیوں کے چوری ہونے کی اتنی کہانیاں اس نے سن رکھی تھیں کہ وہاں اپنی کار پارک کرنا اسے کسی طرح بھی ٹھیک نہ لگا تھا۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوئے تو سنجیو نے ٹونکل کے جوتوں پہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ اسے بالکل بھی آرام دہ نہیں لگ رہے اور یہ کہ اسے اتنی لمبی ایڑی نہیں پہننی چاہیے۔ اس پر ٹونکل بولی: "میں سارا دن گھر میں بیٹھنے کے علاوہ اور کرتی ہی کیا ہوں۔ مجھے ان جوتوں سے صرف اس وقت مسئلہ ہوتا ہے جب میں ٹائپنگ کر رہی ہوں۔"

سنجیو نے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن وہ دل ہی دل میں جانتا تھا کہ ٹونکل سارا دن میز پہ نہیں بیٹھی رہتی۔ جیسے اسی دوپہر جب وہ جاگنگ کر کے گھر لوٹا تو وہ اپنے بستر پہ لیٹی مطالعہ کر رہی تھی۔ اس کے پوچھنے پر کہ دن کے اس پہر بستر پہ کیوں لیٹی ہو ٹونکل کا جواب تھا کہ وہ سخت بور ہو رہی ہے۔ اس وقت سنجیو کے من میں آیا کہ وہ اسے کہہ دے کہ بور ہونے کی بجائے اٹھ کر سامان کے ڈبے کھول دو یا چھت پہ گمٹی کی صفائی کر دو یا باتھ روم کی کھڑکی کے اکھڑے پینٹ کو تازہ کر دو لیکن وہ کچھ کہہ نہیں پایا۔ یہ چیزیں ٹونکل کو پریشان نہیں کرتی تھیں۔ بکھر اسامان اور ادھورے کام

اس کے لیے قابلِ اعتناء تھے۔ اسے الماری میں جو سامنے پڑا ہوا مل جاتا پہن لیتی، جو میگزین قریب رکھا ہوتا اٹھا کر پڑھ لیتی اور ریڈیو پہ جو گانا چل رہا ہوتا وہ سن لیتی تھی۔ ٹونکل اپنے گرد پیش سے ہمیشہ مطمئن رہتی تھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس بے فکری کے باوجود اس کے اندر تجسس کا مادہ بہت تھا۔ نئی چیزیں کھوجنا اسے اچھا لگتا تھا۔ اب اس کے تجسس کا محور و مرکز گھر میں کسی نئی مسیحی شے کی دریافت تھی۔

کچھ روز بعد جب ایک دن سنجیو دفتر سے گھر لوٹا تو اس نے دیکھا کہ ٹونکل سگریٹ سلگائے فون پہ مصروف ہے۔ اس نے کیلفورنیا میں اپنی ایک دوست کو کال ملا رکھی تھی اور اس بات کی پروا کیے بغیر کہ پانچ بجے سے قبل دور کی کال کے ریٹ بہت زیادہ ہوتے ہیں وہ اپنی دوست سے خوش گپیوں میں مگن تھی۔

"بڑے ہی مذہبی لوگ تھے۔" وہ اپنی دوست کو بتا رہی تھی۔ "ہر روز مجھے لگتا ہے جیسے میں گھر میں کسے خزانے کی تلاش میں نکلتی ہوں۔ میں سنجیدہ ہوں مذاق نہیں کر رہی۔ تمہیں یہ سن کے یقین نہیں آئے گا کہ انہوں نے سوئچ بورڈوں پہ بھی انجیل کے قصوں کی تصویریں لگا رکھی تھیں۔ نوح کی کشتی اور طوفانِ نوح کے مناظر!" وہ سانس لینے کے لیے ایک لمحہ رکی اور پھر اپنی بات جاری رکھی۔ "تینوں بیڈرومز میں یہی کیفیت تھی اور میرے مطالعے کے کمرے میں بھی۔ سنجیو پہلے دن ہی ہارڈویئر اسٹور جا کے نئے سوئچ بورڈ خرید لایا اور ان کو تبدیل کر دیا۔ ایک ایک بورڈ تبدیل کیا اس نے۔"

اس تقریر کے جواب میں اب بولنے کی باری دوست کی تھی۔ ٹونکل ہوں ہاں کرتے ہوئے سر ہلا رہی تھی۔ وہ فریج کے سامنے فرش پہ کالے رنگ کی پتلون اور پیلے رنگ کی شنیل کی سویٹر پہنے ٹیڑھی میٹرھی ہو کے لیٹی تھی اور ایک ہاتھ سے لائٹر پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی جو ذرا دور لڑھک گیا تھا۔ چولہے سے اٹھتی کھانے کی مہک نے سنجیو کو اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ مکسکی ٹانگوں والے فرش پہ فون کی بکھری تار کو احتیاط سے پھلانگتا ہوا باورچی خانے کی طرف چلا۔ اس نے ایک دیگی کا ڈھکن اٹھایا تو اندر سرخی مائل بھورے رنگ کا شوربہ ابل ابل کر کناروں سے گر رہا تھا۔

"یہ مچھلی کا قورمہ بن رہا ہے۔ میں نے اس میں سرکہ شامل کیا ہے۔" ٹونکل نے دوست سے گفتگو میں ذرا تعطل کر کے سنجیو کو اطلاع دی اور پھر اپنی انگلیاں کر اس کرتے ہوئے فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "سوری، تم کیا کہہ رہی تھیں؟" وہ ایسی ہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں اسے خوشی دیتیں اور وہ پر جوش ہو جاتی تھی۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا نیا کام جیسے آئس کریم کا کوئی نیا ذائقہ پکھنے سے پہلے یا ڈاک کے ڈبے میں خط ڈالنے سے پہلے وہ غیر شعوری طور پر اپنی انگلیاں کر اس کرنے لگتی۔ اس کی اس عادت کا بھید سنجیو آج تک نہیں سمجھ پایا تھا۔ سنجیو کو لگتا تھا جیسے ٹونکل کے برعکس وہ دنیا

کی چیزوں میں چھپے رازوں کو دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا اس لیے وہ خود کو ہونق سا محسوس کرتا تھا۔
 باورچی خانے سے نکلتے ہوئے سنجیو نے ٹو نکل کے چہرے پہ نگاہ ڈالی جس کو دیکھ کر اس کو ہمیشہ ایسے لگتا تھا جیسے اس پہ
 ابھی لڑکپن کی چھاپ باقی ہے۔ ہر فکر سے آزاد اس کی آنکھیں اور چہرے کے دلکش لیکن خام سے نقش و نگار ایسا تاثر
 دیتے جیسے ان پہ ابھی کسی مستقل پختگی کا ورود ہونا باقی ہے۔ اس کا پیار کا نام بھی بچوں کی ایک نظم پہ رکھا گیا تھا اور یوں
 لگتا تھا جیسے ابھی تک وہ بچپن کے اس لطیف خول سے باہر نہیں نکل پائی۔ اب شادی کے دوسرے مہینے سنجیو کو اس کی
 کچھ عادتوں سے سخت جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔ جیسے کبھی کبھار بولتے ہوئے اس کے مونہ سے تھوک کے چھینٹے
 اڑتے تھے یا جیسے وہ رات کو سونے سے پہلے اپنا زیر جامہ اتار کر کپڑوں کی ٹوکری میں رکھنے کی بجائے وہیں بستر کے
 ساتھ پھینک دیتی تھی۔

وہ دونوں پہلی دفعہ صرف چار ماہ قبل ملے تھے۔ ٹو نکل کے والدین جو کیلیفورنیا میں مقیم تھے اور سنجیو کے ماں باپ جو
 کلکتہ میں رہ رہے تھے دونوں کے درمیان دوستی کا پرانا رشتہ تھا۔ دونوں خاندانوں نے دو براعظموں کی دوری کے
 باوجود سنجیو اور ٹو نکل کی پہلی ملاقات کا بندوبست ایک دوست کی بیٹی کی سولہویں سالگرہ کی صورت میں کیا تھا۔ سنجیو
 ان دنوں اپنے کاروبار کے سلسلے میں پالو آلٹو^{۶۷} آیا ہوا تھا۔ ریستوران میں وہ کھانے کی گول میز پہ ساتھ ساتھ بیٹھے
 تھے۔ میز پہ گھومنے والی ایک پرات رکھی تھی جس میں سور کا بھنا ہوا سینے کا گوشت، ایک رول اور چکن ونگ رکھے
 ہوئے تھے جن کو کھانے کے بعد ان دونوں کی مشترکہ رائے یہ تھی کہ تینوں ڈشوں کا ذائقہ ایک جیسا ہی تھا۔ پہلی
 ملاقات میں ہی ان کو ایک دوسرے میں بہت سے اشتراکات نظر آئے تھے۔ جیسے لڑکپن کی طرح دونوں کو ابھی تک
 ووڈ ہاؤس^{۶۸} کے ناول پڑھنے کا شوق تھا اور دونوں کو ستار بالکل اچھا نہیں لگتا تھا اور بعد میں ٹو نکل نے یہ اعتراف بھی کیا
 کہ جب سنجیو نے دوران گفتگو اس کی چائے کی پیالی کو بڑی نفاست اور کمال تا بعد اری سے دوبارہ بھرا تھا تو اسے سنجیو
 کی یہ ادا بہت اچھی لگی تھی۔

اس ملاقات کے بعد ان کے درمیان ٹیلی فون پہ بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا جس کا دورانیہ بڑھتا چلا گیا۔ پھر ملاقاتیں
 ہونے لگیں۔ پہلے سنجیو ٹو نکل سے ملنے سٹین فورڈ آنا شروع ہوا پھر ٹو نکل سنجیو کے پاس کوئیکسٹکٹ جانے لگی۔ جب
 ٹو نکل سنجیو سے مل کے واپس چلی جاتی تو وہ بالکونی سے اس کے پھونکے ہوئے سگریٹوں کے بجھے ٹوٹے اٹھا کر ایش
 ٹرے میں رکھ لیتا اور اگلی ملاقات تک، جب اس کے پاس نئے ٹوٹوں کا اسٹاک نہ آجاتا، انہیں سینت سینت کر
 رکھتا رہتا۔ ٹو نکل کے آنے سے پہلے وہ اس کے استقبال کے لیے سارے اپارٹمنٹ کی ویکيوم کلیئر سے صفائی کرتا، بستر
 کی چادریں دھوتا اور یہاں تک کہ پودوں کے پتوں سے گرد بھی جھاڑتا۔ ٹو نکل کی عمر ستائیس برس تھی اور سنجیو نے

اس کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ اسے ایک امریکی نے حال ہی میں چھوڑا تھا جو اداکار بننا چاہتا لیکن بری طرح ناکام رہا تھا۔ سنجیو بھی ٹوئکل کی طرح تنہا تھا اور اس کی آمدن اس کے اخراجات سے بہت زیادہ تھی اور وہ کبھی کسی کے عشق میں بھی مبتلا نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ دونوں کے خاندانوں کے اصرار پر انہوں نے بالآخر شادی کا فیصلہ کر لیا۔ شادی کی تقریب انڈیا میں منعقد کی گئی جہاں سنجیو کے سینکڑوں رشتہ دار اور بہی خواہ شریک ہوئے جنہیں وہ بہ مشکل ہی پہچانتا تھا۔ کلکتہ کے ماندی ویل روڈ پر برقی لڑیوں سے جگمگاتے ایک سرخ اور پیلے رنگ کے لمبے چوڑے شامیانے کے نیچے، موسم برسات کی چھم چھم برستی بارشوں تلے، وہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے تھے۔

"کیا تم نے گمٹی^{۶۹} کی صفائی کر لی ہے؟" سنجیو نے ٹوئکل سے پوچھا جو دوست سے سیر حاصل گفتگو کے بعد اب کاغذی نیپکینوں کو تہہ لگا کر پلیٹوں کے ساتھ رکھ رہی تھی۔ اس نئے گھر میں منتقل ہونے کے بعد انہوں نے سارے گھر کی صفائی کی تھی لیکن گمٹی کی صفائی ہونا بھی باقی تھی۔

"ابھی نہیں کی، لیکن میں کر دوں گی، وعدہ!" اس نے بھاپ اڑاتی دیکھی کو میز پر دھری لوہے کی چوکی پہ رکھ دیا۔ میز پر ایک چھوٹی سی ٹوکری میں اطالوی بریڈ کا ایک قتلار رکھا تھا۔ ایک پلیٹ میں سلاد کے پتے اور کٹی ہوئی گاجروں پہ بازار سے لائی گئی بوتل سے ڈریسنگ کی گئی تھی اور ایک طرف گلاسوں میں ارغوانی رنگ کی انگوری شراب سجی ہوئی تھی۔ ٹوئکل کو کھانے پکانے سے کچھ خاص رغبت نہ تھی۔ وہ سپر مارکیٹ سے مرغی کے بھنے ہوئے پارچے اور پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں بند آلو کی تیار سلاد اٹھا لاتی اور اسی سے اپنا کام چلا لیتی۔ ہندوستانی کھانے پکانا اسے بہت دقت طلب کام لگتا تھا۔ اسے لہسن چھیلنے اور ادراک کا چھلکا اتارنے جیسے کام زہر لگتے تھے اور بلینڈر کو استعمال کرنا تو اس کے لیے گویا ایک عذاب تھا اس لیے ہفتے کے اختتام پہ چھٹی والے دن سنجیو خود سرسوں کے تیل میں دار چینی اور لونگ جیسے مصالحے ڈال کے سالن تیار کیا کرتا تھا۔

لیکن آج خلاف معمول سنجیو کو ماننا پڑا کہ ٹوئکل کے ہاتھ کی پکی یہ ڈش نہ صرف دیکھنے میں دلکش تھی بلکہ اس کا ذائقہ بھی بہت شاندار تھا۔ اس کے گاڑھے سرخ رنگ کے شوربے میں مچھلی کے سفید قتلے، تازہ ٹماٹروں کی پھانکیں اور اجمود کے پتے اشتہا انگیز نظارہ دے رہے تھے۔

"تم نے کیسے بنالی یہ ڈش؟"

"میں نے اس کی ترکیب خود سے ایجاد کی ہے!"

"پر تم نے بنائی کیسے؟"

"میں نے دیکھی میں ساری چیزیں ڈال کے آخر پہ ان میں سرکہ شامل کر دیا۔"

"کتنی مقدار میں سر کہ ڈالا؟"

ٹوئکل نے اس سوال پہ کندھے اچکائے اور بریڈ کے ایک ٹکڑے کو اپنے پیالے میں ڈبونے لگی۔

"اس کا کیا مطلب ہے کہ تم نہیں جانتیں؟ تمہیں اس ترکیب کو اپنے پاس کہیں لکھ لینا چاہیے۔ اگر دوبارہ تمہیں یہ بنانے کی ضرورت پڑگئی، کسی پارٹی کے لیے یا کہیں اور، تو کیا کرو گی؟"

"مجھے یاد رہے گی۔" وہ بولی۔ اس نے روٹیوں والی ٹوکری کو دسترخوان سے ڈھانپ دیا۔ اچانک اس کی نگاہ دسترخوان پہ پرنٹ کیے گئے انجیل کے دس الہامی احکامات پر پڑی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے مسکرا کر سنجیو کو دیکھا اور میز کے نیچے اس کے گھٹنے پہ آہستہ سے چٹکی لیتے ہوئے بولی۔ "اب تومان لو، یہ گھرا بڑا برکت ہے!"

نئے گھر کی پارٹی کے لیے انہوں نے اکتوبر کے آخری ہفتے کا دن چنا تھا اور لگ بھگ تیس لوگوں کو اس میں شمولیت کی دعوت دی تھی۔ یہ سب سنجیو کے جاننے والے تھے۔ کچھ اس کے دفتر کے ساتھی تھے اور کچھ کونیکٹکٹ کے وہ ہندوستانی جوڑے تھے جو سنجیو کی شادی سے پہلے اسے ہر ہفتے اپنے گھر شام کے کھانے پر باقاعدگی سے بلایا کرتے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر سے اس کی کوئی خاص جان پہچان نہیں تھی اور وہ اکثر سوچتا تھا کہ ان لوگوں نے اسے اپنے حلقہ احباب میں بھلا کیوں شامل کر رکھا ہے۔ اس کا مزاج بھی بہ مشکل ہی ان میں سے کسی سے ملتا تھا لیکن پھر بھی ان کی دعوتوں پہ وہ ہمیشہ لبیک کہتا تھا۔ چنوں کے تیکھے سالن اور جھینگوں کے کٹلٹ اڑانے کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی گپ شپ اور سیاست پہ بحثا بحثی میں وقت اچھا کٹ جاتا تھا کیونکہ اس کے پاس ویسے بھی شام کو کرنے کرانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ جب ٹوئکل سے اس کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے ویک اینڈ کا زیادہ سے زیادہ وقت ٹوئکل کے ساتھ بتانے کے لیے ان دعوتوں سے گریز شروع کر دیا۔ چنانچہ ان واقف کاروں میں سے کوئی بھی ابھی تک ٹوئکل سے نہیں ملا تھا۔ اور جہاں تک ٹوئکل کے دوست احباب کا تعلق تھا تو سنجیو اور ایک سابقہ بوائے فرینڈ کے سوا، جو بروک فیلڈ میں مٹی سے چیزیں بنانے والے ایک اسٹوڈیو میں کام کرتا تھا، اس کا کوئی جاننے والا کونیکٹکٹ میں نہیں تھا۔ ٹوئکل سٹین فورڈ یونیورسٹی سے اپنا ایم اے کا مقالہ لکھ رہی تھی۔ وہ آر لینڈ کے کسی شاعر کے کلام پہ تحقیق کر رہی تھی۔ سنجیو نے اس سے پہلے کبھی اس شاعر کا نام نہیں سنا تھا۔

شادی کے لیے ہندوستان پرواز کرنے سے پہلے سنجیو نے یہ گھر اپنی مدد آپ کے تحت بڑی مناسب قیمت میں تلاش کیا تھا۔ یہ ایسے علاقے میں واقع تھا جہاں قرب و جوار میں بچوں کے لیے معیاری اسکول موجود تھے۔ مکان کو پہلی نظر دیکھتے ہی وہ اس کے بل کھاتے زینے اور زینوں کے آہنی جنگلے اور دیواروں کے نچلے حاشیوں پر چوبی تختہ بندی سے بہت متاثر ہوا تھا۔ عقبی باغیچے میں سدا بہار جھاڑیوں میں گھرا آفتابی کمرابھی اس کے دل میں کھب گیا تھا۔ گھر کا سامنے

کا حصہ ٹوڈر طرزِ تعمیر کی جھلک لیے ہوئے تھا اور اس کی عین پیشانی پہ پیتل کے بڑے بڑے ہندسوں میں بانیس درج تھا جو اتفاق سے سنجیو کا یوم پیدائش بھی تھا۔ گھر میں دو بڑے آتش دان چالو حالت میں تھے اور گیراج میں دو گاڑیاں باآسانی کھڑی ہو سکتی تھیں۔ گھر کی گئی بھی اس قدر بڑی تھی کہ بقول پر اپرٹی ڈیلر کے اس کو بوقتِ ضرورت ایک زائد خواب گاہ میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ گھر کو دیکھتے ہی سنجیو نے اسے خرید کر یہیں ٹوٹکل کے ساتھ ساری زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس لیے سوئچ پلیٹوں پہ چپکے انجیل کے قصوں والے اسٹکروں اور بڑی خواب گاہ کی کھڑکی کے شیشے پر چھپی کنواری مریم کی شفاف تصویر کو اس نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ گھر میں منتقل ہونے کے بعد جب سنجیو نے اس تصویر کو کھرچ کر اتارنے کی کوشش کی تو شیشے پر خراشیں پڑ گئی تھیں۔

نئے گھر کی پارٹی سے ایک ہفتہ قبل جب وہ دونوں چھٹی والے دن لان میں درختوں سے گرے پتے اکٹھے کر رہے تھے تو سنجیو کو ٹوٹکل کی چیخ سنائی دی۔ وہ اپنے ترنگل کو سنبھالتا اس کی طرف دوڑا۔ اس کا خیال تھا کہ ٹوٹکل نے کوئی مرا ہوا جانور یا سانپ دیکھ لیا ہو گا۔ اکتوبر کی تیز ٹھنڈی ہوا شائیں شائیں کرتی اس کے کانوں سے گزری اور اس کے پاؤں تلے زرد اور بھورے پتوں کے چرمرانے کی صدا بلند ہوئی۔ جب وہ ٹوٹکل کے پاس پہنچا تو وہ گھاس پہ گری خاموش ہنسی ہنس رہی تھی اور اس کے سامنے پیلے پھولوں والی ایک بے تحاشا بڑھی ہوئی جھاڑی کے پیچھے کنواری مریم کا پلاسٹر سے بنا مجسمہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اتنا بڑا تھا کہ ان کی کمر تک پہنچ رہا تھا اور اس کی نیلے رنگ میں رنگی اوڑھنی کا انداز کسی ہندوستانی دلہن جیسا تھا۔ ٹوٹکل نے اپنی ٹی شرٹ کے ایک کونے سے مجسمے کی بھنوں پہ جما گرد و غبار صاف کرنا شروع کر دیا۔

"مجھے لگتا ہے اب تم اس نئی دریافت کو ہماری خواب گاہ میں نصب کرنے کی خواہشمند ہو گے۔" سنجیو نے چوٹ کی۔ ٹوٹکل نے نگاہ اٹھا کر سنجیو کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں استعجاب تھا۔ شرٹ کا کونہ اٹھانے سے اس کا پیٹ ننگا ہو رہا تھا اور سنجیو نے دیکھا کہ اس کی ناف کے گرد گرد روئیں کھڑے تھے۔ "تمہارا خیال بالکل غلط ہے۔ ہم اسے اپنی خواب گاہ میں نہیں رکھ سکتے۔"

"نہیں رکھ سکتے؟ کیوں بھلا؟"

"نہیں رکھ سکتے سنو! احمقانہ باتیں نہ کرو۔ یہ گھر سے باہر سجانے کے لیے ہوتا ہے۔ لان میں رکھنے کے لیے۔"

"لان میں؟ نہیں ٹوٹکل خدا کے لیے ہم اسے لان میں نہیں سجا سکتے۔"

"ہمیں رکھنا پڑے گا۔ اگر ہم نے نہ رکھا تو یہ سخت بدشگونی ہوگی۔"

"لیکن لان میں تو سب پڑوسیوں کو یہ دکھائی دے گا۔ وہ سمجھیں گے ہمارا دماغ چل گیا ہے۔"

"ایسا کیوں سوچیں گے وہ بھلا؟ صرف اس لیے کہ ہمارے لان میں کنواری مریم کا مجسمہ نصب ہے؟ یہاں آس پڑوس میں ہر دوسرے گھر کے لان میں ایسا مجسمہ موجود ہے۔ ہم کیوں باقیوں سے الگ دکھیں گے؟"

"کیوں کہ ہم عیسائی نہیں ہیں۔"

"یہ بات اب تم اور کتنی دفعہ مجھے یاد دلاؤ گے؟" وہ اپنی انگلی کو تھوک سے گیلا کر کے مجسمے کی ٹھوڑی پہ رگڑنے لگی جہاں سے ایک نشان مٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے یہ مٹی چپکی ہوئی ہے یا کسی قسم کی کائی جم گئی ہے؟"

سنجیو کو اس عورت کی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ یہ عورت جس کو جانے اسے محض چار ماہ گزرے تھے اور جس سے اس نے شادی کر لی تھی اور جو اب اس کی جیون ساتھی بن چکی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بڑے تاسف سے ان لڑکیوں کے بارے میں سوچا جن کی تصویریں اس کی ماں کلکتہ سے اسے بھیجتی رہی تھی تاکہ وہ ان میں سے کسی ایک کو شادی کے لیے چن لے۔ وہ لڑکیاں جو کھانا پکانے کی کوئی کتاب پھرو لے بغیر ہر طرح کی ڈش بنا سکتی تھیں، جو سینے پرونے اور گانے کے فن سے واقف تھیں۔ سنجیو نے ان لڑکیوں کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا بھی تھا اور اپنی پسند کے مطابق ان کی درجہ بندی بھی کی تھی لیکن پھر اس کی ملاقات ٹوئکل سے ہو گئی۔

"ٹوئکل، میرے ساتھ کام کرنے والے میرے لان میں اس مجسمے کو دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ ہم اس کو یہاں نہیں رکھ سکتے۔"

"وہ کیا سوچیں گے؟ تمہیں کام سے نکال دیں گے کہ تم کنواری مریم کو مانتے ہو؟ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ تو امتیازی رویہ ہو گا۔"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"تمہیں اس بات کی اتنی فکر کیوں ہے کہ دوسرے لوگ کیا سوچیں گے؟"

"اب بس کر دو ٹوئکل پلیز!" اپنے ترنگل کے سہارے ٹیک لگاتے ہوئے وہ بولا۔ وہ تھک چکا تھا۔ ٹوئکل مجسمے کو جھاڑیوں سے کھینچتے ہوئے لیمپ والے کھمبے تک لے آئی جو اینٹوں سے بنی گزر گاہ کے کنارے نصب تھا۔

"سج دیکھو تو! یہ کتنی پیاری ہے!"

وہ کوئی جواب دیے بغیر پتوں کے اپنے ڈھیر کے پاس لوٹ گیا اور دونوں ہاتھوں سے ان کو کوڑے والے پلاسٹک کے تھیلے میں ڈالنے لگا۔ اس وقت نیلے آسمان میں کہیں کوئی بادل کا ٹکڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لان میں ابھی تک ایک درخت پہ زرد اور پیلے پتے موجود تھے اور یہ شادی کے اس شامیانے کی طرح چھایا ہوا تھا جس تلے سنجیو نے ٹوئکل کو

اپنا یا تھا۔

وہ ابھی تک نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل میں ٹوٹنکل کے لیے پیار موجود تھا یا نہیں لیکن جب ٹوٹنکل نے اس سے پہلی دفعہ یہ سوال کیا تھا تو اس کا جواب اثبات میں تھا۔ یہ پالو آٹو میں ایک شام کا قصہ تھا جب وہ دونوں ایک نیم تاریک اور تقریباً خالی تھیٹر میں فلم دیکھنے ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ جرمن زبان کی یہ فلم ٹوٹنکل کی پسندیدہ فلموں میں شامل تھی لیکن سنجیو کو اس پسندیدگی کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس کی کہانی سخت افسردگی طاری کر دینے والی تھی۔ فلم شروع ہونے سے پہلے ٹوٹنکل نے سنجیو کے اتنے قریب ہو کے، اپنی ناک کی نوک سنجیو کی ناک سے ملا کر، یہ سوال کیا تھا کہ سنجیو اس کی مسکارے سے سچی پلکوں کی پھڑپھڑاہٹ تک اپنے چہرے پہ محسوس کر سکتا تھا۔ اس شام اس نے ہاں میں جواب دیا تھا، اس نے کہا تھا کہ وہ ٹوٹنکل سے محبت کرتا ہے اور یہ سن کر ٹوٹنکل خوشی سے نہال ہو گئی تھی اور اس نے پاپ کارن کا ایک دانہ سنجیو کے منہ میں ڈالتے ہوئے کچھ دیر تک اپنی انگلی کو اس کے ہونٹوں پہ ہی رہنے دیا تھا جیسے یہ درست جواب دینے کا صلہ ہو۔

اگرچہ سنجیو نے پلٹ کر ٹوٹنکل سے یہی سوال نہیں کیا تھا اور نہ ٹوٹنکل نے ایسا کچھ کہا تھا لیکن سنجیو نے اس وقت یہی سمجھا تھا کہ وہ بھی اس سے پیار کرتی ہے لیکن اب اس کا یقین متزلزل ہو چکا تھا۔ سچائی تو یہ تھی کہ سنجیو یہی نہیں جانتا تھا کہ محبت ہوتی کیا ہے۔ اسے بس اتنا پتہ تھا کہ محبت کیا نہیں ہوتی۔ اس نے زندگی میں یہی نچوڑ نکالا تھا کہ ہر رات اپنے خالی ڈھنڈار فلیٹ میں اکیلے لوٹنا اور چھری کانٹوں کی دراز میں سے ہمیشہ سب سے اوپر والا ایک ہی کانٹا اٹھانا اور ان ڈنر پارٹیوں سے خاموشی سے لوٹ آنا جہاں دوسرے مرد اپنی بیویوں یا دوستوں کی کمروں کے گرد بازو لپیٹ کر گاہے گاہے ان کی گردنیں اور کندھے چوم رہے ہوں اور کلاسیکی موسیقی کی سی ڈیوں کی تلاش میں گانوں کی فہرستوں کو پہروں چھانٹتے رہنا، یہ سب محبت کی عدم موجودگی کا اعلان تھے۔ ٹوٹنکل سے ملاقات سے قبل سنجیو کو بڑی شدت سے یہ احساس ہونا شروع ہو چکا تھا کہ اس کی زندگی محبت سے خالی ہے۔ جب ہر ماہ کے شروع میں وہ فون پہ کلکتہ بات کرتا تو اس کی ماں اسے ہمیشہ یاد دلاتی: "تمہارے پاس بینک میں اتنا پیسہ پڑا ہے کہ تم تین خاندانوں کو پال سکتے ہو۔ تم شادی کیوں نہیں کرتے؟ تمہیں ایک بیوی کی ضرورت ہے جو تم سے پیار کرے اور تمہارا خیال رکھے۔" اور اب اس کے پاس ایک بیوی تھی، ایک خوبصورت بیوی، جو اپنے خاندان کی بھی تھی اور جو جلد ہی ماسٹرز کی ڈگری لینے والی تھی۔ پیار نہ ہونے کی بھلا کوئی وجہ تھی؟

اس شام سنجیو نے اپنے لیے پہلے شراب کا ایک گلاس بنایا اور خبریں دیکھتے ہوئے کافی دیر چسکیاں لیتا رہا۔ پھر ایک دوسرا گلاس نصف چٹھانے کے بعد وہ ٹوٹنکل کے پاس پہنچا جو غسل خانے میں ٹب کے اندر جھاگ میں لیٹی ہوئی

تھی۔ ٹوئکل نے بتایا تھا کہ لان کی صفائی کے بعد، جو اس نے زندگی میں پہلی دفعہ کی تھی، اس کا بدن دکھ رہا تھا اور اب وہ اسے سکون پہنچانے کے لیے غسل لے رہی تھی۔ سنجیو نے دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ٹوئکل نے چہرے پہ ہلکے نیلے رنگ کا ماسک لپ رکھا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا ہوا تھا اور ساتھ ساتھ ٹھنڈی وہسکی کی چسکیاں بھی لیتی جا رہی تھی۔ وہ کاغذی جلد والی ایک موٹی سی کتاب کے صفحے پلٹ رہی تھی۔ کتاب کا نچلا حصہ پانی کے چھینٹوں کے باعث سیاہی مائل ہو چکا تھا اور نمی سے اس کے صفحے مڑ رہے تھے۔ سنجیو نے کتاب کے سرورق پر نظر ڈالی۔ اس پہ گہری سرخ پرنٹنگ میں صرف "سونٹس" کا لفظ لکھا ہوا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور پھر قدرے ٹھہر ٹھہر کر ٹوئکل کو اطلاع دی کہ اپنا مشروب ختم کرنے کے بعد وہ جوتے پہن کر باہر جائے گا اور سامنے کے لان سے کنواری مریم کے مجسمے کو ہٹا دے گا۔

"وہاں سے ہٹا کے کہاں رکھو گے؟ ٹوئکل نے خوابناک سے لہجے میں اس سے پوچھا۔ اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ ٹب کی جھاگ میں سے اس نے ایک ٹانگ نکالی اور خم دے کر اسے پھیلا دیا۔

"فی الحال تو میں اسے گیراج میں رکھوں گا لیکن کل صبح کام پہ جاتے ہوئے اسے ساتھ لے جاؤں گا اور کہیں کچرے کے ڈھیر پہ پھینک آؤں گا۔"

"خبردار جو ایسا سوچا بھی!" وہ ایک دم ٹب سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کتاب اس کے ہاتھ سے پانی میں جا گری۔ اس کی رانوں سے جھاگ کے بلبلے نیچے ٹپک رہے تھے۔ "مجھے تم سے نفرت ہے، نفرت!" اس نے دھاڑ کے کہا۔ "نفرت" کا لفظ کہتے ہوئے اس نے آنکھیں غصے سے میچ لی تھیں۔ اس نے سرعت سے اپنا نہانے کا جامہ پہنا، پیٹی کو کس کے کمر پہ باندھا اور خمدار زینوں سے دھپ دھپ کرتی چوبی فرش پہ اپنے پاؤں کے گیلے نشان چھوڑتی نیچے اتر گئی۔ جب وہ داخلی ہال تک پہنچی تو سنجیو نے آواز دی۔ "کیا تم اس طرح گھر چھوڑ کر جانے کا منصوبہ بنائے بیٹھی ہو؟" اسے اپنی کنپٹیوں پہ خون کی تیز گردش کی دھمک سنائی دی اور جب وہ بولا تو اس کی آواز میں ایک ایسی غراہٹ در آئی تھی جو خود اس کے اپنے لیے بھی اجنبی تھی۔

"کسے پرواہ ہے؟ کسے پرواہ ہے کہ میں کس طرح گھر چھوڑ کر جاؤں؟"

"وقت دیکھا ہے تم نے؟ تم اس وقت آخر گھر چھوڑ کر کہاں جانے کا سوچ رہی ہو؟"

"تم وہ مجسمہ باہر نہیں پھینک سکتے، میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔" اس کے چہرے پہ ماسک اب سوکھ کر اور گہرا ہو چکا تھا اور اس کے بالوں سے ٹپکتا پانی اس پہ لحظہ لحظہ گر رہا تھا۔

"میں ایسا کروں گا، میں اسے اٹھا کر باہر پھینکوں گا۔"

"نہیں!" ٹونکل نے جواب دیا۔ اچانک اس کی آواز مدھم پڑ گئی۔ "یہ ہمارا گھر ہے۔ ہم دونوں کا مشترکہ گھر ہے۔ یہ مجسمہ بھی ہماری پراپرٹی کا، ہمارے گھر کا حصہ ہے۔" وہ اب کانپ رہی تھی۔ اس کے پاؤں تلے پانی کا ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ سنجیو نے داخلی ہال کی کھلی ہوئی کھڑکی بند کر دی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ٹھنڈ سے ٹونکل بیمار نہ پڑ جائے۔ اس نے غور سے ٹونکل کے چہرے کو دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ اس کے سخت نیلے چہرے پہ گرتے پانی کے قطروں میں آنسو بھی شامل تھے۔

"اوہ خدایا! ٹونکل پلینز، میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔" اس نے اس سے قبل کبھی ٹونکل کو روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، کبھی اس کی آنکھوں میں اسے ایسی اداسی نہیں دکھی تھی۔ ٹونکل وہیں جی کھڑی رہی۔ نہ اس نے منہ موڑا نہ اپنے بہتے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی بلکہ اب اس کا آنسوؤں سے ترتر چہرہ عجب طور پر پرسکون ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اپنی پوٹے بند کر لیے جو اس کے نیلے ماسک تلے چھپے باقی چہرے کے مقابلے میں بہت زرد اور بہت غیر محفوظ سے دکھائی دے رہے تھے۔ سنجیو کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان نہ رہی ہو، جیسے وہ اچانک بیمار پڑ گیا ہو۔

ٹونکل آگے بڑھ کر سنجیو کے پاس آئی اور اس کی گردن میں اپنی بانہیں جمائل کرتے ہوئے اس کے سینے پہ سر رکھ کے ہچکیاں لینے لگی۔ سینے کے باہر سنجیو کی شرٹ بھیگ رہی تھی اور سینے کے اندر اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ اس جھڑپ کا اختتام آخر کار اس سمجھوتے پر ہوا کہ مجسمے کو مکان کے بغلی حصے میں دیوار کے ساتھ اس طرح رکھا جائے گا کہ راہ چلتے لوگوں کی تو نظر نہ پڑے لیکن گھر میں آنے والوں کو صاف دکھائی دے۔

پارٹی کا مینو نسبتاً سادہ تھا۔ شیمپین کا ایک کریٹ، ہارٹ فورڈ کے ایک ہندوستانی ریستوران کے سمو سے اور ایرانی شیریں پلاؤ کی بڑی بڑی پراتیں! سنجیو صبح سے دوپہر تک انہی چاولوں کی تیاری میں جتا رہا تھا۔ اس نے اس سے قبل کبھی اتنے لوگوں کے لیے پارٹی کا اہتمام نہیں کیا تھا اس لیے وہ گھبرا رہا تھا کہ کہیں کوئی چیز کم نہ پڑ جائے۔ چنانچہ حفظ ماتقدم کے طور پر وہ شیمپین کا ایک اور کریٹ بھی اٹھالایا تھا۔ اس کی ہڑبڑاہٹ کا یہ عالم تھا وہ ایک پرات چاول بھی جلا بیٹھا تھا اور اسے ان کی جگہ مزید چاول بنانے پڑے تھے۔ ٹونکل نے گھر کے فرش صاف کیے تھے اور ریستوران سے سمو سے اٹھانے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی تھی کیونکہ اسے اپنے مینی کیور اور پیڈی کیور کے لیے اسی سمت جانا تھا۔ سنجیو کا ارادہ تھا کہ وہ ٹونکل سے آتش دان کی شیف پہ سب سے مسیجی تبرکات کو صرف پارٹی کے وقت تک کے لیے ہٹانے کو کہے گا لیکن وہ ابھی غسل خانے میں نہا ہی رہا تھا کہ ٹونکل گھر سے نکل گئی تھی اور وہ پورے تین گھنٹے لگا کر گھر واپس آئی تھی اس لیے صفائی کے باقی ماندہ کام بھی سنجیو کو ہی کرنے پڑے تھے۔

ساڑھے پانچ بجے تک سارا گھر جگ جگ مگ مگ کر رہا تھا۔ شیلف پہ رکھی چیزوں کو عطربیز موم بتیاں، جو ٹونکل ہارٹ فورڈ سے خاص اسی دن کے لیے خرید لائی تھی، جگمگا رہی تھیں اور گملوں کی مٹی میں لگی اگر بتیوں کی خوشبو نے سارے گھر کو مہکار کھا تھا۔ جب بھی سنجیو شیلف کے پاس سے گزرتا اس کی تیوری چڑھ جاتی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ اس کے مہمانوں کی نگاہ جب چینی کی مٹی سے بنے ان جگمگاتے سنتوں اور مریم ویوسف کی صورتوں میں ڈیزائن کی گئی نمک دانیوں پر پڑے گی تو وہ ضرور ناک بھوں چڑھائیں گے۔ لیکن اس خوف کے باوجود اسے یقین تھا کہ اس کے جاننے والے اس گھر کی خوبصورتی سے ضرور متاثر ہوں گے۔ اسے یقین تھا کہ شمشین کی چسکیاں لیتے ہوئے اور چٹنی میں ڈبو ڈبو کر سمو سے کھاتے ہوئے وہ باہر کی سمت کھلتی بڑی بڑی کھڑکیوں، چمکتے چوبی فرش، بل کھاتے ہوئے دلکش زینوں اور دیواروں کے حاشیوں پہ مہاگنی تختہ بندی کو ضرور تحسین کی نظر سے دیکھیں گے۔

مہمانوں میں پہلی آمد ڈگلاس کی ہوئی جو اپنی دوست نورا کے ساتھ آیا تھا۔ ڈگلاس کو سنجیو کی فرم میں بطور کنسلٹنٹ آئے تھوڑی ہی مدت گزری تھی۔ ڈگلاس اور نورا دونوں دراز قامت اور سرخ و سپید تھے اور ان کے بال سنہری تھے۔ دونوں نے ایک ہی جیسے باریک فریم والے چشمے اور لمبے سیاہ اوور کوٹ پہن رکھے تھے۔ نورانے سیاہ رنگ کا ہی ہیٹ پہن رکھا تھا جس پہ سچے پتلے پتلے پنکھ اس کے چہرے کے پتلے پتلے نقوش سے لگا کھا رہے تھے۔ اس کا بایاں ہاتھ ڈگلاس کے ہاتھ میں تھا اور دائیں ہاتھ میں اس نے برانڈی کی بوتل اٹھا رکھی تھی جس کی گردن کے گرد سرخ ربن بندھا ہوا تھا۔ یہ بوتل اس نے ٹونکل کو تھما دی۔

"تمہارا لان تو بڑا زبردست ہے سنجیو!" ڈگلاس نے ملتے ہی اپنی رائے پیش کی اور پھر نورا کی طرف دیکھ کر بولا: "ہمیں بھی اپنے لان کے لیے ایک ایسا ہی ترنگل خریدنا پڑے گا سوئیٹ۔ اور یہ غالباً۔۔۔۔۔"

"یہ میری بیوی ہے، تانیا۔"

"آپ مجھے ٹونکل کہہ سکتے ہیں!"

"کتنا انوکھا سا نام ہے ٹونکل!" نورا بولی۔

ٹونکل نے کندھے اچکائے۔ "اتنا بھی انوکھا نہیں ہے۔ بمبئی میں ایک اداکارہ کا نام ڈمپل کپاڈیہ بھی ہے اور اس کی ایک اور بہن کا نام ہے سمپل!"

ڈگلاس اور نورا دونوں نے یہ سن کر بہ یک وقت اپنی بھنویں بلند کیں اور پھر کچھ سمجھتے ہوئے اپنے سر آہستہ سے اثبات میں ہلانے لگے یوں جیسے وہ ناموں کی اس انوکھے پن کو ہضم کر رہے ہوں۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ٹونکل!" نورا بولی۔

"آئیے شیمپین سے لطف لیجیے۔ آپ کے لیے ڈھیروں شیمپین رکھی ہے۔" سنجیو نے مہمانوں کی رہنمائی کرتے ہوئے کہا۔

"میری بات کا برا نہ ماننا سنجیو۔" ڈگلاس بولا۔ "لیکن میں نے باہر ایک مجسمہ دیکھا ہے۔ کیا آپ لوگ مسیحی ہو؟ میرا خیال تھا کہ آپ لوگ ہندوستانی ہیں۔"

"ہندوستان میں بھی مسیحی رہتے ہیں۔" سنجیو نے جواب دیا۔ "لیکن ہم مسیحی نہیں ہیں۔"

"مجھے تمہارا ڈریس بڑا اچھا لگا ہے ٹو نکل!" نورانے ٹو نکل کے لباس کا سر سے پیر تک جائزہ لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"اور مجھے آپ کا ہیٹ بہت ہی دلکش لگا ہے۔ کیا میں آپ کو گھر کی سیر کرواؤں؟"

دروازے کی گھنٹی بار بار بجتی رہی اور ایک کے بعد ایک مہمان آتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا گھر لوگوں سے اور ان کی گفتگوؤں سے اور انجانی خوشبوؤں سے بھر گیا۔ عورتوں نے ریشم و شیفون سے بنے چھوٹے چھوٹے سیاہ اسکرٹ پہن رکھے تھے اور ان کے پاؤں میں اونچی ایڑی والی جوتیاں تھیں۔ وہ اپنے کوٹ سنجیو کو تھماتی رہیں جو انہیں بڑی احتیاط سے ہینگروں پہ لٹکا کر کوٹ والی وسیع و عریض الماری میں ٹانگتا رہا۔ کچھ ہندوستانی عورتوں نے سنہری تاروں سے کڑھی ہوئی ساڑھیاں بھی زیب تن کر رکھی تھیں اور ان ساڑھیوں کے تہہ دار پلو بڑی نفاست سے ان کے کندھوں پہ دھرے تھے۔ مردوں نے ٹائیاں اور جیکٹس پہن رکھی تھیں اور ان سے آفٹر شیو لوشن کی ترش خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ مہمانوں کی آمد کے ساتھ داخلی ہال میں چیری کی لکڑی سے بنامیز ایک ایک کر کے تحفوں سے بھرتا چلا گیا۔

سنجیو کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان سب لوگوں نے اس کے لیے اور اس کے گھر کے لیے اور اس کی بیوی کے لیے اس قدر تردد اٹھا کے اپنی محبت و مودت کا اظہار کیا ہے۔ سنجیو کی زندگی میں صرف ایک ہی اور ایسا موقع گزرا تھا جب وہ ایسی ہی کیفیات سے گزرا تھا اور وہ موقع اس کی شادی کا تھا۔ لیکن یہ دن اس سے بھی مختلف تھا۔ شادی کے برعکس اس کی پارٹی میں شامل ہونے والے لوگ اس کے رشتہ دار نہ تھے بلکہ ان میں سے زیادہ تر تو ایسے تھے جو اسے سرسری طور پہ ہی جانتے تھے یعنی ان میں سے کوئی بھی رشتوں کی ڈور سے بندھی ہوئی مجبوری کے تحت نہیں آیا تھا۔ مہمانوں میں سے ہر ایک نے اس کو نئے گھر کی مبارک باد دی اور اس کے ساتھ مل کے اچھی اچھی باتیں کیں۔ لسٹرنے، جو سنجیو کے ساتھ کام کرتا تھا، پیش گوئی کی کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو مہینوں میں کمپنی میں نائب صدر کے عہدے پہ متمکن ہو جائے گا۔ لوگوں نے سمو سے کھاتے ہوئے گھر کی تازہ پیٹ سے سبھی دیواروں اور چھت کی تعریفیں کیں، انہوں نے گملوں میں لٹکتے پودوں، باہر کو کھلنے والی جہازی ساز کی کھڑکیوں اور بے پور سے لائی گئی ریشمی پینٹنگز کی جی بھر کے تحسین و آفرین کی۔ لیکن جو ہستی ان کی سب سے زیادہ تعریف و توصیف کا محور ٹھہری وہ ٹو نکل تھی۔ اس کی

کا مدار شلوار قمیص جو نارنجی رنگ کا شیڈ لیے ہوئے تھی اور جس کی پشت سے کٹاؤ ذرا زیادہ تھا اور سفید گلاب کی پتیوں کی پتی سی مالا جو اس نے سر کے گرد بڑی نفاست سے پلیٹ رکھی تھی اور اس کے گلے پہ سجا سفید موتیوں کا گلوبند جس کے درمیان میں نیلم جڑا تھا ان سب کی توجہ کامرکز تھی۔ انہوں نے ٹوئکل کے گرد ایک دائرہ سا بنارکھا تھا اور اس کے بیان کردہ قصوں اور جملوں کا لطف لیتے ہوئے بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ ریکارڈ پہ جاز کی مدھر موسیقی سریں بکھیر رہی تھی۔ ان دھنوں کا انتخاب بھی ٹوئکل نے خود کیا تھا۔ سنجیو نے سموسوں اور شمپین کا محاذ سنبھال رکھا تھا۔ وہ تیزی سے خالی ہوتی ہوئی پلیٹوں کو اوون میں گرم کیے ہوئے تازہ سموسوں سے بھر رہا تھا اور شمپین کی بوتلیں کھول کھول کر مہمانوں کے آگے رکھتا جا رہا تھا۔ جہاں گلاس برف سے خالی ہونے لگتے وہ برف کے مزید ٹکڑے لے آتا۔ اس ہماہمی میں اسے لوگوں کے سوالوں کے جواب میں بار بار یہ وضاحت بھی کرنی پڑ رہی تھی کہ وہ مسیحی نہیں ہیں۔ مہمانوں کو گھر کی تفصیلی سیر کروانے کا بیڑہ بھی ٹوئکل نے اٹھایا۔ عقبی لان کا منظر، بل کھاتے زینوں سے چڑھ کر بالائی منزل کا نظارہ اور تہہ خانے کی تنگ سیڑھیوں سے نیچے اتر کر مشروبات کے ذخیرے کی جھلک دکھانے کے لیے وہ انہیں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں اپنی رہنمائی میں گھماتی رہی۔ اسی دوران ایک دفعہ اس کی سنجیو سے مڈ بھیڑ ہوئی تو وہ اس کی کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے فاتحانہ لہجے میں بولی: "تمہارے دوستوں کو میرے مطالعہ کے کمرے میں لگا یسوع مسیح کا پوسٹر بہت پسند آیا ہے۔"

جب مہمانوں میں سموسوں اور شمپین کی طلب میں کچھ ٹھہراؤ آیا تو سنجیو موقع غنیمت جانتے ہوئے باورچی خانے میں آگھسا۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے کاؤنٹر پہ رکھی ٹرے میں سے ایک چکن کا ٹکڑا اٹھایا اور یہ یقین کرنے کے بعد کہ کوئی نہیں دیکھ رہا چھری کانٹے کے تردد میں پڑے بغیر ہاتھوں سے کھانے لگا۔ ایک کے بعد اس نے دوسری بوٹی ایسے ہی ختم کی اور پھر انہیں معدے تک دھکیلنے کے لیے شراب کی بوتل سے براہ راست بڑے بڑے گھونٹ غٹا غٹ پی گیا۔

"بہت شاندار گھر ہے اور کیا ہی زبردست چاول بنائے تم نے سنجیو!" سنیل نے باورچی خانے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے انیسستھیو لو جسٹ تھا اور سنجیو کو اپنے ہاں دعوتوں پہ بڑی باقاعدگی سے بلایا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈسپوزیبل پلیٹ تھی اور وہ چیچ سے پلاؤ کھا رہا تھا۔ "کیا مزید شمپین مل جائے گی؟" ابھی اس کا سوال مکمل نہیں ہوا تھا کہ اس کے پیچھے پیچھے پر بل آدھمکا۔ پر بل پیشے کے لحاظ سے یا لے یونیورسٹی میں فزکس کا پروفیسر تھا اور ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ وہ بولا: "تمہاری بیوی تو بڑے کمال کی ہے سنجیو!" ایک لمحے کے لیے سنجیو کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ وہ خالی خالی نظروں سے پر بل کو دیکھتا رہا پھر اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ

ایک پارٹی میں پر بل نے یہی الفاظ صوفیہ لورین اور آڈری ہیپ برن جیسی اداکاراؤں کے لیے بھی کہے تھے۔ "کیا تمہاری بیگم کی کوئی بہن بھی ہے؟" سنیل نے چاولوں کی ٹرے میں سے کشمش کا ایک دانہ اٹھاتے ہوئے لقمہ دیا: "کیا ٹوئکل کے نام کا اگلا حصہ لٹل سٹار ہے!" اس پر وہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اور اپنی ڈسپوزیبل چمچوں کی مدد سے ٹرے میں سے مزید چاولوں پہ ہاتھ صاف کرنے لگے۔ سنجیو نے شراب کی کچھ اور بوتلیں لانے کے لیے تہہ خانے کا رخ کیا۔

واپسی پہ وہ چند لمحوں کے لیے سیڑھیوں پہ ٹھہر گیا، شیمپین کا دوسرا کریٹ اس نے سینے پہ اٹھا رکھا تھا اور سیلن زدہ سیڑھیوں پہ بڑی میٹھی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اوپر پارٹی کی گہما گہمی کے مقابلے میں یہ جگہ کس قدر پرسکون تھی۔ جب اس نے شیمپین کا کریٹ کھانے کی میز پہ لا کر رکھا تو اسے لونگ روم سے ٹوئکل کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"ہاں بالکل۔۔۔ ساری چیزیں۔۔۔ ہمیں یہ ساری چیزیں گھر میں ایسی جگہوں سے ملی ہیں جہاں ہمارا گمان بھی نہیں تھا۔ بلکہ سچ پوچھو تو ابھی بھی ان دریافتوں کا سلسلہ جاری ہے۔"

"نہیں!"

"ہاں! ہر دن ایسا ہی ہے جیسے ہم خزانے کی کھوج میں نکلے ہوں۔ یہ کتنا اچھا ہے نا! خدا جانے ابھی ہمیں اور کیا کیا ملنا باقی ہے۔ خدا کا نام میں مذاق میں نہیں لے رہی، میں سنجیدہ ہوں۔"

ٹوئکل کے یہ وہ الفاظ تھے جنہوں نے سارے گھر میں ایک ڈھنڈیا مچا دی۔ جیسے کسی ان کہے معاہدے کے تحت سب مہمان تبرکات کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ایک ایک کمرے کو چھاننا شروع کیا۔ ایک ایک الماری کو کھولتے، کرسیوں اور کشنوں کے نیچے جھانکتے، پردوں کو جھٹکتے اور کتابوں کو الماریوں سے ہٹا کر ان کے پیچھے کھوجتے وہ جیسے کسے مقدس مشن پہ نکلے ہوئے تھے۔ کھوجیوں کی یہ ٹولیاں چھلیں کرتی اور اچھلتی کودتی زینوں سے اوپر نیچے آ جا رہی تھیں۔

"ابھی تک ہم نے گمٹی کو نہیں چھانا۔" اچانک ٹوئکل نے جیسے گولا پھوڑ دیا۔ سب اس کے گرد جمع ہو گئے اور لگے سوال کرنے۔

"ہم گمٹی میں پہنچیں گے کیسے؟"

"داخلی ہال میں ایک جگہ چھت پہ جگہ ہے وہیں ہوگی سیڑھی۔"

اس متجسس ہجوم کے پیچھے پیچھے سنجیو بھی تھکا ماندہ گھسٹ رہا تھا تا کہ انہیں سیڑھی کی جگہ کے بارے میں بتا سکے لیکن

ٹوئل نے، جو اس سارے ہجوم کی رہنمائی کر رہی تھی، اس سے پہلے ہی اپنی مطلوبہ جگہ تلاش کر لی۔ "دیکھو میں نے پالیا!" اس نے ارشمیدس کی طرح خوشی سے نعرہء مستانہ بلند کیا۔^{۴۲}

ڈگلاس نے زنجیر کھینچ کر سیڑھی نیچے اتاری۔ جوش سے اس کا سرخ چہرہ مزید سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے نوراکا پروں والا ہیٹ اپنے سر پہ سجا رکھا تھا۔ ایک ایک کر کے سب مہمان سیڑھی پہ چڑھتے گمٹی کے اندر غائب ہوتے گئے۔ پہلے عورتوں نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ مرد عورتوں کی مدد کر رہے تھے کیونکہ سیڑھی کے تنگ تختوں پہ اپنی اونچی ایڑی والی جوتیوں کو سنبھالنا عورتوں کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ ہندوستانی عورتوں نے اپنی قیمتی ساڑھیوں کے آزاد پلو کمر بند میں اڑس لیے تھے تاکہ ان کی وجہ سے انہیں اوپر چڑھنے میں دقت نہ ہو۔ عورتوں کے بعد مردوں کی باری آئی اور وہ ایک ایک کر کے گمٹی میں غائب ہوتے گئے یہاں تک کہ صرف سنجیو نیچے اکیلا کھڑا رہ گیا۔ ان کی پیروی میں گمٹی پہ چڑھنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسے اپنے اوپر چھت پہ قدموں کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر چھت گر جائے تو کیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے اس نے تصور میں نشے میں دھت سب مہمانوں کے خوشبوؤں سے معطر جسموں کو سر کے بل نیچے گرتے اور اپنے ارد گرد اڑے تڑچھے پڑے ہوئے دیکھا۔ اسی لمحے اسے ایک چیخ سنائی دی اور پھر دھڑ دھڑ قدموں کی آوازوں کے ساتھ بے ہنگم قہقہے بلند ہوئے۔ کسی چیز کے گرنے اور پھر کچھ ٹوٹنے کی آواز اٹھی۔ سنجیو سن رہا تھا کہ وہ کسی صندوق کے بارے میں بڑے پر جوش ہو رہے تھے۔ پھر دھمک سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اسے کھولنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

سنجیو سوچ رہا تھا کہ ابھی ٹوئل اسے مدد کے لیے بلائے گی لیکن کوئی بلاوانہ آیا۔ اس نے نیچے ہال پہ نگاہ دوڑائی۔ میزوں پہ جابجا شمشین کے گلاس، ادھ کھائے سمو سے اور لپ اسٹک کے نشانوں سے اٹے نیکپن بکھرے پڑے تھے۔ یوں ہی پھرتے پھرتے اس کی نگاہ سیڑھی کے عین نیچے ٹوئل کے جوتوں پہ جا گئی۔ گمٹی پہ جلدی چڑھنے کی ہبڑ دبڑ میں وہ اپنے جوتے یہیں اتار گئی تھی۔ سیاہ رنگ کے چمکتے دکتے چرمی جوتے پیچھے سے کھلے تھے اور ان کی ایڑیاں گولف کی ٹی کی مانند تھیں۔ جوتوں کے اندر لگا ہوا ریشمی لیبل ٹوئل کے تلوؤں کی وجہ سے کچھ ٹیالا ہو چلا تھا۔ اس خیال سے کہ گمٹی سے اترتے ہوئے کسی کا پاؤں ان پہ نہ رپٹ جائے سنجیو نے انہیں اٹھا کر مرکزی خواب گاہ کی دہلیز پہ رکھ دیا۔

وہ واپس لوٹا تو گمٹی سے اسے کسی چیز کے چرچر کر آہستہ آہستہ کھلنے کی آواز آئی۔ لوگوں کا شور تھم چکا تھا اور اس کی جگہ باتوں کی محض بھنبھناہٹ سی سنائی دے رہی تھی۔ سنجیو کو یوں لگا جیسے گھر میں وہ اکیلا کھڑا ہے۔ موسیقی کی آواز بھی تھم گئی تھی اور اگر وہ غور سے سنتا تو اسے ریفریجریٹر کے چلنے کی آواز اور باہر درختوں پہ آخری پتوں کی سرسراہٹ اور ان کی شاخوں کے کھڑکیوں سے ٹکرانے کی کھڑکھڑاہٹ صاف سنائی دیتی۔ اس نے سوچا کہ وہ چشم

زدن میں اس سیڑھی کو واپس گئی میں کھینچ کر واپسی کا رستہ بند کر سکتا ہے اور وہ سب لوگ اس وقت تک نیچے نہ اتر پائیں گے جب تک وہ دوبارہ زنجیر کھینچ کر سیڑھی کو کھول نہیں دے گا۔ اس نے وہ ساری باتیں سوچیں جو وہ ایسا کرنے کے بعد بغیر کسی رکاوٹ کے سرانجام دے سکتا تھا۔ وہ ٹونکل کے شلف پہ سبے سب تبرکات کو کوڑے کے تھیلے میں ڈال کر اپنی گاڑی کی ڈگی میں بھر کے دور کسی کچرے کے ڈھیر پہ پھینک سکتا تھا۔ وہ گریہ کنناں یسوع مسیح کے پوسٹر کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا تھا اور کنواری مریم کے مجسمے کو ہتھوڑے سے پارہ پارہ کر سکتا تھا۔ یہ سب کرنے کے بعد وہ خالی گھر میں لوٹ کر آتا اور پارٹی کی وجہ سے بکھری ہوئی پلیٹوں اور گلاسوں کو ایک گھنٹے میں سنبھال لیتا اور پھر اپنے لیے ایک تنگڑا سا پیگ بنا کر گرم چاول کھاتے ہوئے وہ بے ایس باک کی نئی سی ڈی لگا کر اس کی دھن سے لطف اندوز ہوتا اور کمپوزیشن کو بہتر طور پہ سمجھنے کے لیے وہ سی ڈی کے کور پہ درج معلومات کو پڑھتا جاتا۔ ان خیالات کی رو میں اس نے سیڑھی پہ آہستہ سے ہاتھ رکھا لیکن وہ فرش پہ مضبوطی سے ٹکی ہوئی تھی۔ اسے ہلانے کے لیے زور لگانے کی ضرورت تھی۔

"اوہ میرے خدا یا! مجھے سگریٹ کی طلب ہو رہی ہے۔" اسے گئی سے ٹونکل کی آواز سنائی دی۔

سنبیو کو اپنی گردن کی پشت پہ گرہیں سی پڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اسے لگا جیسے اگر وہ نیچے نہ بیٹھا تو چکر کے گر جائے گا۔ وہ تیزی سے خواب گاہ کی طرف بڑھاتا کہ بستر پہ جا کے لیٹ جائے لیکن خواب گاہ کے دروازے میں ٹونکل کے جوتوں کا رخ اپنی طرف دیکھ کر ٹھٹھک کے رک گیا۔ اس کا دماغ الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ اس نے تصور میں ٹونکل کو اپنے پاؤں میں یہ جوتے پہنتے ہوئے دیکھا۔ جب سے وہ دونوں اس نئے گھر میں منتقل ہوئے تھے وہ ہمیشہ ٹونکل سے ایڑی والے جوتے پہنتے پہ شاک رہا تھا، اسے ہمیشہ ان کو دیکھ کر جھنجھلاہٹ ہوتی تھی لیکن اب اس جھنجھلاہٹ کی جگہ ایک عجیب سے درد نے لے لی تھی۔ اس درد کی انگلی پکڑ کر اس نے چشم تصور سے ٹونکل کو ان جوتوں میں بل کھاتے زینوں سے تیزی سے نیچے اترتے، لڑکھڑاتے اور چوبنی فرش پہ ایڑیوں سے خراشوں کے نشان چھوڑتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سوچا کہ وہ ابھی دوڑ کے واش روم میں جا کے اپنی لپ اسٹک تازہ کر کے مہمانوں کو ان کے کوٹ ایک ایک کر کے پکڑاتی جائے گی اور رسم مشایعت ادا کرنے کے بعد جب سب مہمان رخصت ہو چکے ہوں گے وہ دوڑ کے چیری کے اس میز تک آئے گی جہاں نئے گھر کے لیے تحائف کا انبار پڑا ہے اور ایک ایک کر کے سب تحفے کھولتی چلی جائے گی۔ سنبیو کے جسم و جاں میں درد کی اٹھنے والی یہ لہر بالکل ویسی ہی تھی جیسے شادی سے قبل ٹونکل سے فون پر بات ختم کرنے کے بعد اسے محسوس ہوتی تھی یا جب وہ اسے ایئر پورٹ پہ اتارنے کے بعد واپسی پہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ہر ٹیک آف کرنے والے جہاز کو دیکھ کر محسوس کرتا تھا کہ شاید اس میں اس کی ٹونکل بیٹھی ہوگی۔

اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ٹوٹا: "سج! تم یقین نہیں کرو گے!" وہ سیڑھی سے اُلٹے قدموں نیچے اتر رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پہ کچھ سہار رکھا تھا جو ابھی تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے کندھوں کا وہ حصہ جو برہنہ تھا اس پہ پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

"تم نے سنبھال لیا ٹوٹنے؟" اوپر سے کسی نے پوچھا۔

"ہاں سنبھال لیا۔ اب آپ چھوڑ دو۔"

اب سنجیو کو دکھائی دیا کہ ٹوٹنے نے دونوں ہاتھ یسوع کے ایک نیم تن مجسمے کے گرد لپیٹ رکھے تھے۔ اس ٹھوس نفرتی مجسمے کا سر سنجیو کے سر سے با آسانی تین گنا بڑا تھا۔ اس کی ناک کے ابھار میں ایک شاہانہ پن تھا، سر کے گھنگریالے بال گردن تک طویل تھے اور ہنسی کی ہڈی بہت نمایاں تھی۔ اس کی فراخ پیشانی میں ارد گرد کی دیواروں، دروازوں اور لیمپوں کے چھوٹے چھوٹے عکس دکھائی دے رہے تھے۔ چہرے پر اعتماد کی جھلک تھی یوں جیسے اسے اپنے عقیدت مندوں کی وفاداری کا کامل یقین ہو۔ اس کے ہونٹ بھرے بھرے اور زندگی سے بھرپور تھے۔ مجسمے کے سر پہ نور کا پروں والا ہیٹ بھی ٹکا ہوا تھا۔ جیسے ٹوٹنے کی سیڑھیوں پہ اترنے لگی سنجیو نے اس کی کمر کو اپنے ہاتھوں سے سہارا دیا تاکہ مجسمے کے وزن سے اس کا توازن گڑبڑانہ جائے۔ جوں ہی ٹوٹنے نے فرش پہ قدم رکھا سنجیو نے اس سے مجسمہ لے لیا۔ یہ اچھا خاصا وزنی تھا۔ غالباً تیس پاؤنڈ کے آس پاس رہا ہو گا۔ ٹوٹنے کے بعد باقی مہمان بھی اس تلاش سے تھکے ہارے ایک ایک کر کے گمٹی سے نیچے اتر آئے اور نیچے اترتے ہی ان میں سے کچھ مشروب کی طلب میں دائیں بائیں پھیل گئے۔

ٹوٹنے نے لمبی سانس لی، بھنویں اچکائیں اور اپنی انگلیوں کو کراس کرتے ہوئے سنجیو سے کہنے لگی: "کیا تمہیں بہت برا لگے گا اگر ہم اسے شیلف پہ سجادیں؟ صرف آج کی رات؟ میں جانتی ہوں تمہیں اس سے نفرت ہے۔"

اسے واقعی اس سے نفرت تھی۔ اسے اس مجسمے کے بے تحاشا حجم، اس کی بے عیب، صیقل سطح سے نفرت تھی۔ اسے اس کی قدر و قیمت سے نفرت تھی۔ اسے اس بات سے نفرت تھی کہ یہ اس کے گھر میں ملا تھا اور وہ اس کا مالک تھا۔ اس سے پہلے انہیں جو جو چیزیں ملی تھیں ان کے برعکس اس آدھے دھڑ کے مجسمے میں سنجیو کو اک وقار، اک سنجیدگی اور یہاں تک کہ حسن کی جھلک بھی دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن وہ حیران تھا کہ مجسمے کی ان خصوصیات نے اس کے دل میں اس کے لیے مزید نفرت پیدا کر دی تھی۔ اس کی نفرت کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ جانتا تھا ٹوٹنے کو اس سے محبت ہے۔

"میں کل سے اسے اپنے مطالعے کے کمرے میں رکھ لوں گی۔" ٹوٹنے کی التجا جاری تھی۔ "میں وعدہ کرتی ہوں۔"

وہ جانتا تھا کہ یہ وعدہ کبھی ایفا نہیں ہوگا، وہ کبھی اسے اپنے مطالعے کے کمرے میں لے کر نہیں جائے گی۔ وہ جانتا تھا کہ اب جب تک وہ دونوں اکٹھے ہیں ٹونکل اسے لونگ روم کے آتش دان پہ بنے شیف کے درمیان میں رکھے گی اور اس مجسمے کے دائیں بائیں اس کی باقی دریافت شدہ تبرکات سچی رہیں گی۔ وہ جانتا تھا کہ اب جب بھی ان کے گھر کوئی مہمان آئیں گے ٹونکل ان کو اس کی دریافت کا قصہ سنائے گی اور وہ یہ کہانی سنتے ہوئے ٹونکل کی تعریفیں کریں گے۔ سنجیو نے ٹونکل کے بالوں میں گلاب کی ریزہ ریزہ پتیوں کو دیکھا، اس کے گلے میں موتیوں اور نیلم والے گلوبند پہ نگاہ دوڑائی، اس کے ناخنوں پہ چمکتی قرمزی پالش پہ نظر کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ چیزیں ٹونکل کی ان خصوصیات میں شامل تھیں جنہیں دیکھ کر پر بل نے رائے دی تھی کہ اس کی بیوی کمال ہے۔ سنجیو کا سر شراب سے بھاری ہو رہا تھا اور اس کے ہاتھ مجسمے کے وزن سے دکھ رہے تھے۔ وہ بولا: "میں نے تمہارے جوتے خواب گاہ میں رکھ چھوڑے ہیں۔" "شکریہ! لیکن میرے پاؤں اب ان اونچی ایڑی والے جوتوں سے عاجز آگئے ہیں۔" ٹونکل نے اپنا جسم سنجیو کی کہنی سے آہستہ سے دباتے ہوئے کہا اور لونگ روم کی طرف چل دی۔

سنجیو مجسمے کے قوی ہیکل، نفرتی چہرے کو اپنی پسلیوں پہ سہارتے اور اس کے سر پہ رکھے پروں والے ہیٹ کو سنبھالتے ہوئے ٹونکل کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

بی بی ہلدار کا علاج

اپنی انتیس سالہ زندگی کا بڑا حصہ بی بی ہلدار نے ایک ایسے مرض سے لڑتے ہوئے گزارا تھا جس نے اس کے خاندان اور عزیز واقارب کے ساتھ ساتھ پروہتوں، جو تیشیوں، دست شناسوں، نگ شناسوں، رمالوں، سیانے حکیموں اور سادہ لوح قصبے والوں کو چکر اکر رکھ دیا تھا۔ ہماری بستی کے سیانوں نے بی بی ہلدار کے علاج کے لیے اسے سات مقدس دریاؤں کا پوتر پانی بھی لا کر دیا تھا لیکن بی بی کا مرض کم ہونے کی بجائے بڑھتا جا رہا تھا! جب رات کو ہمارے کانوں میں اس کی درد و کرب میں ڈوبی ہوئی چیخیں گونجتیں اور جب اس کی کلاںیاں رسیوں سے باندھ کر جڑی بوٹیوں کا لیپ اس کے ماتھے پہ لگایا جاتا تو ہم دل ہی دل میں اس کے جلد ٹھیک ہونے کی پرار تھنا کرتے۔ قصبے کے سمجھ دار لوگوں نے سفیدے کے پتوں سے بنے بام کو بی بی ہلدار کی کنپٹیوں پہ رگڑنے سے لے کر اس کے چہرے کو جڑی بوٹیوں سے بنے قہوے کی دھونی دینے تک سب حیلے کر کے دیکھ لیے تھے۔ ایک اندھے عیسائی کی تجویز پر اسے ٹرین کے ذریعے سنتوں اور شہیدوں کے مزارات پہ حاضری کے لیے بھی لے جایا گیا تھا۔ نظر بد سے بچانے کے لیے اس کے بازوؤں اور گلے میں تعویذ باندھے گئے تھے اور اس کی انگلیاں رنگ برنگے پتھروں والی انگوٹھیوں سے بھری رہتی تھیں۔

بی بی ہلدار کے لیے ڈاکٹروں کے تجویز کردہ کل علاج مرض کو ٹھیک کرنے کی بجائے مزید بگاڑ رہے تھے۔ ایلو پیتھی، ہو میو پیتھی، آیور ویدک سب طریقہ ہائے علاج آزما کر دیکھ لیے گئے تھے۔ ہر ڈاکٹر اور وید کی اپنی تشخیص اور اپنی رائے تھی۔ درجنوں ایکسروں، انجیکشنوں اور معائنوں کے بعد کچھ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ بی بی کو اس مرض سے نجات کے لیے اپنا وزن بڑھانا چاہیے جبکہ کچھ دوسروں کی رائے وزن گھٹانے کے حق میں تھی۔ اگر ایک اسے سورج نکلنے کے بعد تک سونے سے منع کرتا تو دوسرے کا اصرار ہوتا کہ اسے دن چڑھے تک سوتے رہنا چاہیے۔ کوئی اسے سر کے بل کھڑے ہونے کی نصیحت کرتا تو کوئی دوسرا سارا دن ویدوں سے اشلوک چپنے کو ہی اس کے مرض کا علاج بتاتا۔ کچھ کی رائے یہ تھی کہ اسے ہسپتالزم کے لیے کلکتہ لے جایا جائے تو شاید کچھ بہتری ہو جائے۔ یوں ایک ڈاکٹر سے دوسرے ڈاکٹر تک دھکے کھاتی بی بی ہلدار کو اتنے علاج تجویز کیے گئے تھے کہ ان کی فہرست بنانا بھی ممکن نہیں۔ ڈاکٹروں، حکیموں اور ویدوں کی بھانت بھانت کی تجویزوں پہ اس نے لہسن کھانا ترک کر دیا اور کریلوں کا رس، ناریل کا پانی، دودھ میں پھینٹے لٹخ کے کچے انڈے پینے سے لے کر مراقبہ کرنے تک ہر ہر صلاح پر جی جان سے عمل کیا۔ الغرض بی بی کی زندگی کا اگر نچوڑ نکالا جائے تو وہ ایک نسخے کی ناکامی سے لے کر دوسرے نسخے تک کے سفر کا ایک غیر مختتم سلسلہ تھا۔

بی بی ہلدار کو کسی پیشگی آثار یا علامات کے بغیر یکدم دورہ پڑ جاتا تھا اس لیے اس کے مرض کی نوعیت نے اس کی دنیا کو بس اسی رنگ و روغن سے مبرا چار منزلہ عمارت تک محدود کر دیا تھا جہاں اس کا واحد رشتہ دار اس سے بڑی عمر کا ایک کزن اپنی بیوی کے ساتھ دوسری منزل پہ کرائے کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ جب بی بی پہ دورہ پڑتا تو وہ اپنے گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر ہدیائی کیفیت میں چلی جاتی اور اکثر ہوش کھو بیٹھتی تھی اس لیے کسی مدد کے بغیر عمارت سے باہر نکلنا، تنہا سڑک پار کرنا یا ٹرام میں بیٹھنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ سارا دن ہماری اس چار منزل عمارت کی چھت پہ بنے اسٹور روم میں بیٹھی رہتی۔ یہ کمرہ اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں بیٹھا تو جاسکتا تھا لیکن سہولت سے کھڑے ہونے کی جگہ نہ تھی۔ اس کے ایک طرف ملحقہ لیٹرین کی دیوار تھی اور اس کے دروازے کی جگہ پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی واحد کھڑکی سلاخوں سے عاری تھی اور اس کی الماریاں پرانے دروازوں کے کوڑا ڈال کر بنائی گئی تھیں۔ بی بی ہلدار یہیں سارا دن ایک بوری پہ آلتی پالتی مارے بیٹھی رہتی اور اپنے کزن ہلدار کی کاسمیٹکس کی دکان میں بیچی جانے والی چیزوں کی فہرست تیار کرتی رہتی۔ یہ دکان ہماری اس چار منزلہ عمارت کے احاطے کے شروع میں ہی بنی ہوئی تھی۔ بی بی کو ان خدمات کے بدلے میں کوئی پیسہ تو نہیں ملتے تھے تاہم اس کا کزن اس کے کھانے پینے اور کپڑے جوتے کی ضروریات پوری کرتا تھا۔ رات کو وہ نیچے کزن کے فلیٹ میں ترپال سے بنی کھاٹ پہ سو جاتی تھی جسے اس کے اٹھتے ہی تہہ کر دیا جاتا۔

صبح ہوتے ہی بی بی بی بی چھت پہ بنے اس اسٹور روم پہنچ جاتی۔ اس کے پاؤں میں پلاسٹک کے پھٹے ہوئے جوتے اور جسم پہ ایک چمنا نما ڈھیلا ڈھالا جامہ ہوتا جس کی لمبائی اس کے گھٹنوں سے بھی نیچے جارہی ہوتی تھی۔ اس لمبائی کے لباس پہننا ہم نے پندرہ سال کی عمر میں ہی ترک کر دیا تھا۔ گھٹنوں سے نیچے اس کی ٹانگوں پہ بال بالکل نہ تھے تاہم ان پہ چھوٹے چھوٹے پیلے داغ بڑی کثرت سے پھیلے ہوئے تھے۔ جب ہم اپنے کپڑے سکھانے کے لیے یا مچھلی کے چھلکے اتارنے کے لیے چھت کا رخ کرتے تو وہ اکثر اپنی بدنصیبی اور اپنے ستاروں کی بے ڈھبی چال کا ماتم کیا کرتی تھی۔ شکل صورت اس کی کچھ ایسی دلکش نہ تھی۔ اوپری ہونٹ بہت پتلے اور دانت بہت چھوٹے تھے۔ جب بات کرتی تو اس کے مسوڑھے دکھائی دیتے تھے۔

"ارے میں تم سے پوچھتی ہوں بھلا یہ کوئی انصاف ہے کہ ایک لڑکی اپنی ساری عمر، اپنی جوانی کا سارا زمانہ، چیزوں کی فہرستیں بناتے بیٹھے بیٹھے گزار ڈالے اور کوئی اس کی طرف توجہ نہ دے؟" اس کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند ہوتی یوں جیسے اس کا مخاطب بہر اہو۔

"کیا میرا تم لوگوں پہ رشک کرنا غلط ہے؟ ان سب لڑکیوں پہ رشک کرنا جو دلہنیں بنیں اور اب مائیں بن چکی ہیں، جو

اپنی اپنی زندگیوں کے معمولات میں کھو چکی ہیں؟ کیا میرا اپنی پلکوں پہ مسکارا اور بالوں میں خوشبودار تیل ڈالنے کی خواہش کرنا غلط ہے؟ کیا میری اپنا بچہ پالنے اور اس کی تربیت کرنے کی آرزو بالکل فضول ہے؟

ہر روز وہ اسی طرح اپنی محرومیوں کا لاوا ہم پہ انڈیلتی رہتی یہاں تک کہ ہم سب پہ یہ اچھی طرح واضح ہو گیا تھا کہ بی بی کو کسی مرد کی طلب ہے! وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کا ہاتھ تھامے، اس کی دیکھ بھال کرے اور اس کی زندگی کی بے سمت گاڑی کو پٹری پہ چڑھا دے۔ ہم سب کی طرح اس کی بھی چھوٹی چھوٹی آرزوئیں تھیں۔ اپنے گھر والوں کے سامنے کھانا چننے کی آرزو، نوکروں کو کام نہ کرنے پہ جھڑکنے کی آرزو اور خرچے میں سے تھوڑے تھوڑے پیسے بچا کر الماری میں ایک طرف رکھنے کی آرزو تا کہ ہر دو تین ہفتوں کے بعد چائیز بیوٹی پارلر جا کے اپنی بھنویں بنوائی جاسکیں۔ وہ ہم سے ہماری شادی کی تفصیلات کرید کرید کر ہمیں زچ کرتی رہتی۔ زیور میں کیا کیا تھا، دعوت نامے کیسے بنوائے گئے تھے اور سیج پہ لگے پھولوں کی خوشبو کیسی تھی، اس کے سولات کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوتا۔ جب اس کے بار بار اصرار پہ ہم اسے اپنی شادی کا البم دکھاتے تو وہ ان تصویروں میں جیسے کھوسی جاتی۔ خاص طور پر وہ منظر جہاں اس بندھن کی رسموں کو کیمرے کی آنکھ نے قید کر لیا تھا اسے مبہوت کر دیتے۔ جب وہ آگ کے الاؤ میں مکھن چھڑکنے، دلہا دلہن کے ایک دوسرے کو ورمالا پہنانے، سیندور سے سبھی مچھلی^۳ اور چاندی کے سکوں والی نمائشی تھالی کی تصاویر دیکھتی تو جیسے اس پہ سحر طاری ہو جاتا۔ "اتنے زیادہ مہمان!" وہ لوگوں کی تصویروں پہ انگلی پھیرتے ہوئے کہتی۔ "جب میری شادی ہوگی تو تم سب لوگوں نے اس میں لازمی شریک ہونا ہے!"

شوہر کی خواہش اور اس سے وابستہ امیدوں کے سہانے خواب کبھی کبھی اس کے دماغ کو اس شدت سے جکڑ لیتے کہ اس پہ پھر دورا پڑنے کا خطرہ منڈلانے لگتا۔ اس کا جسم وہیں اسٹور روم کے فرش پہ ٹالکم پاؤڈر کے ڈبوں اور بالوں میں لگائی جانے والی پنوں کے بکسوں کے درمیان مڑنے تڑنے لگتا اور اس کے مونہ سے بے ربط جملے نکلنے لگتے۔ "میرے پاؤں پہ کبھی مہندی نہیں لگے گی۔۔۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔۔۔ میرے چہرے پہ کبھی صندلی پاؤڈر نہیں لگے گا۔۔۔۔۔ مجھے بھلا کون ابٹن لگائے گا؟۔۔۔۔۔ میرا نام۔۔۔۔۔ میرا نام کبھی سرخ روشنائی سے کسی شادی کا رڈ پہ نہیں چھپے گا۔"

جذبات سے مغلوب بی بی کی یہ خود کلامیاں اس کی خود ترحمی کا نہایت بھونڈا اظہار ہوتی تھیں اور اس عالم میں اس کا اضطراب اس کے انگ انگ سے یوں پھوٹتا ہوا محسوس ہوتا جیسے اس کا جسم شدید بخار میں پھنک رہا ہو۔ جب اس کی کڑھن حد سے بڑھ جاتی تو ہم اس کے مونہ پر پانی کے چھینٹے مارتے، اس کو شالوں میں لپیٹتے اور اس کے لیے دہی کے گلاس اور عرق گلاب لے کر آتے۔ جب اس کا غیظ و غضب کم ہوتا تو ہم اسے اپنے ساتھ درزی کے پاس چلنے کی

دعوت دیتے تاکہ وہ اپنے پھٹے ہوئے بلاؤز اور ساڑھی کی سلائی کروا سکے۔ ہمارا ایک مقصد تو یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے چمٹے رہنے کی بجائے کہیں آگے پیچھے چلے پھرے اور ہوا خوری کرے تاکہ اس کا دماغ شانت رہے اور دوسرا مقصد یہ بھی ہوتا کہ کچھ سجنے سنورنے سے شاید اس کی شادی کا کوئی امکان پیدا ہو جائے۔

"کوئی بھی مرد کسی ایسی عورت سے شادی نہیں کرنا چاہتا جس کا لباس برتن دھونے والیوں جیسا ہو!" ہم اسے سمجھاتے۔ "کیا تم چاہتی ہو کہ تمہارے کپڑے یوں ہی پڑے پڑے کیڑوں کی نذر ہو جائیں؟"

وہ یہ سن کر مونہ بسورتی، تلملاتی اور آہ بھر کر کہتی: "میں کس کے لیے باہر جاؤں؟ کس کے لیے نئے کپڑے پہنوں؟" اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ در آتی۔ "مجھے بھلا کون سینما دکھانے اور چڑیا گھر گھمانے لے جائے گا؟ مجھے بھلا کون لیمن سوڈا اور کاجو دلوائے گا؟ آپ مانو گی کہ کپڑے اچھے یا برے پہننے سے میری تقدیر نہیں بدلنے والی! میں کبھی اس بیماری سے چھٹکارا نہیں پاسکوں گی، کبھی میری شادی نہیں ہوگی!"

لیکن تب ہی ایک روز بی بی کے لیے ایک نیا علاج تجویز کیا گیا۔ اب تک آزمائے گئے تمام علاجوں میں یہ سب سے غیر روایتی بلکہ عجیب و غریب تھا۔ ہوا یوں کہ ایک شام جب بی بی چھت سے نیچے فلیٹ میں کھانا کھانے جا رہی تھی تو تیسری منزل کے زینے پہ پہنچتے ہی اس پہ دورا پڑا اور وہ گر گئی۔ اس کی درد بھری چیخیں جب زینوں پہ گونجیں تو ہم لوگ اپنے اپنے فلیٹوں سے نکل کر بھاگ بھاگ وہاں پہنچے۔ بی بی کی مٹھیاں بھنجی ہوئی تھیں اور وہ زور زور سے پاؤں فرش پہ مار رہی تھی۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا اور وہ اپنے ارد گرد سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ ہم نے اسے شانت کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ دستی پنکھے سے ہوا دیتے ہوئے اس کے سر پہ فریج کے بج بسترے پانی کے کٹورے انڈیلے گئے اور اس کے مونہ میں گڑ کی ڈلی رکھی گئی۔ ہمارے بچے زینے کے جنگلے سے چپکے بی بی کے تشنج کی اس کیفیت کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ہم نے اپنے ملازموں کو بی بی کے کزن ہلدار کو بلانے کے لیے بھیجا۔ دس منٹ کے بعد ہلدار اپنی دکان سے برآمد ہوا۔ اس کے چہرے پہ تشویش کی کوئی رمتی نہیں تھی۔ اس نے ہمیں کہا کہ ہمیں بی بی کے لیے اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پھر اس نے بی بی کو اٹھا کر رکشے میں ڈالا اور اسے پولی کلینک لے گیا۔ اس نے اپنے چہرے پہ پھیلی حقارت کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ پولی کلینک میں خون کے یکے بعد دیگرے بہت سے ٹیسٹ لینے کے بعد تھکے ہارے ڈاکٹر نے یہ نتیجہ نکالا کہ بی بی کے مرض کا واحد علاج اس کی شادی ہے!

بی بی کے لیے تجویز کردہ اس عجیب علاج کی خبر دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح ساری عمارت میں پھیل گئی۔ کبھی کھڑکیوں میں کھڑے ہو کر، کبھی تار پہ کپڑے ڈالتے ہوئے اور کبھی چھت کی منڈیر سے لگ کر، جو کبوتروں کی بیٹوں سے اٹی ہوئی تھی، بی بی کی اس نئی تشخیص کے بارے میں چہ مہ گوئیاں ہونے لگیں۔ اگلی صبح تک تین مختلف

نجوی بی بی کا ہاتھ دیکھ کر یہ تصدیق کر چکے تھے کہ اس کی لکیروں میں جلد ملاپ کی نشانی واضح طور پر موجود ہے۔ کباب کی دکان پر کچھ آوارہ مزاج لوگوں نے بی بی کی اس تشخیص کے بارے میں اخلاق سے گری ہوئی نازیبا سرگوشیاں بھی کیں۔ بڑی بوڑھیاں جنتریاں کھول کر بیٹھ گئیں تاکہ بی بی کی شادی کا شبھ مہورت نکالا جاسکے۔ اس خبر کے کئی دن بعد تک جب ہم اپنے بچوں کو اسکول چھوڑنے جاتے یا دھوبی سے کپڑے اٹھانے لگتے یا راشن کی دکان پہ قطار میں لگے ہوتے تو ہمارے درمیان بی بی کی شادی کے موضوع پر ہی کھسر پھسر ہوتی رہی۔ اب ہم سب کو بھی لگنے لگا تھا کہ بی بی بے چاری کو بھی مصروف رہنے کا کوئی بہانہ ملنا چاہیے۔ پہلی دفعہ ہم نے بی بی کے ڈھیلے ڈھالے لباس تلے چھپے اس کے جسمانی خدو خال کا تصور کر کے یہ تعین کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی مرد کے لیے حظ کے کیا کیا سامان مہیا کر سکتی ہے۔ پہلی دفعہ ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ بی بی کا رنگ تو بہت صاف ہے، اس کی پلکیں تو لمبی اور آنکھوں میں تو اک نمار سا ہے اور اس کے ہاتھوں کی بناوٹ بھی کتنی نفیس اور دلکش ہے!

"کہتے ہیں کہ بی بی کے ٹھیک ہونے کی یہ ہی واحد امید ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ یہ جذبات کے ہیجان کا مسئلہ ہے!" یہاں پہنچ کر ہمارے تبصرے رک جاتے اور ہمارے گال شرم سے سرخ ہو جاتے۔ "شادی کا بندھن اس کے ہیجان کو لگام ڈال دے گا!"

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بی بی اپنے مرض کی اس تشخیص سے بہت خوش تھی اور اس نے فوراً ہی شادی کا جوڑا پہننے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنے کزن ہلدار کی دکان سے کا سمیٹکس کے کچھ خراب شدہ مال کی مدد سے اس نے اپنے پاؤں کی انگلیوں پہ پالش سجالی اور اپنی ایڑیوں کو رگڑ رگڑ کے نرم کرنا شروع کر دیا۔ بی بی اپنے کام یعنی ہلدار کے لائے گئے نئے سامان کی فہرست بنانے کو یکسر نظر انداز کر کے دن رات ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر کھانوں کی ترکیبیں سیکھنے کے لیے پڑی رہتی۔ اس نے سویاں اور پیستے کا سالن بنانے کی ترکیبیں اپنی ٹیڑھی میڑھی لکھائی میں اس رجسٹر میں نوٹ کر لیں جہاں وہ دکان کے سامان کا حساب کتاب لکھا کرتی تھی۔ اس نے اپنی شادی میں شریک ہونے والے مہمانوں کی فہرست، اس میں پیش کیے جانے والے کھانوں کی فہرست اور ان تفریحی مقامات کی فہرست بھی بنا ڈالی جہاں ہنی مون منانے کے لیے وہ جانا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹوں پہ گلیسرین لگانی شروع کر دی تاکہ یہ نرم ہو جائیں اور میٹھا کھانے سے گریز کرنے لگی تاکہ اس کا وزن کم ہو سکے۔ ایک دن اس نے ہم میں سے ایک کو درزی کے ہاں ساتھ چلنے کے لیے کہا تاکہ وہ جدید فیشن کی امبریلاکٹ شلوار قمیص سلوا سکے۔ وہ ہم لوگوں کو کئی دن تک جیولری کی دکانوں میں کھینچے کھینچے پھرتی رہی۔ وہ شیشے کے کیسوں میں سبز تاج اور لاکٹ کے ڈیزائن بڑے اشتیاق سے دیکھتی اور ہم سے ان کے بارے میں رائے طلب کرتی جاتی۔ ساڑھیوں کی دکانوں میں ایک ایک ساڑھی کے پاس ٹھہر کر

اس کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد اس کی نظر انتخاب سلک کی ہلکے ارغوانی، فیروزہ اور ہلکے نارنجی رنگ کی تین بنارسی ساڑھیوں پر ٹھہری اور وہ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی: "میں اپنی شادی کی تقریبات میں پہلے یہ ساڑھی پہنوں گی، پھر یہ اور آخر میں یہ!"

شادی کے لیے بی بی کے اس جوش و خروش کا اس کے کزن ہلدار اور ہلدار کی بیگم پر کوئی اثر نہ تھا۔ ان کی رائے بی بی کی رائے کے عین الٹ تھی۔ بی بی کی خواہشات اور ہمارے خدشات سے بے پروا وہ اپنے معمول کے دھندوں میں مگن تھے۔ اپنی چھوٹی سی دکان میں دھنسنے ہوئے، جس کی تین دیواریں مہندی، بالوں کے تیل، ایڑیاں رگڑنے والے پتھروں اور رنگ گورا کرنے والی کریموں سے اٹی ہوئی تھیں، وہ کہتے: "ہمارے پاس ایسی فضول تجویزوں کے لیے کوئی وقت نہیں!" جب کبھی کوئی بی بی کی صحت کے نازک موضوع کو چھیڑنے کی کوشش کرتا تو ہلدار اس کو وہیں ٹوک دیتا: "جس بیماری کا علاج نہ ہو سکے اسے برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ بی بی نے پہلے ہی ہمیں بڑی پریشانیاں دی ہیں۔ اس کی بیماری پہ ہم پہلے ہی بہت پیسا برباد کر چکے ہیں۔ اس نے خاندان کا نام بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔" ہلدار کی اس رائے سے اس کی موٹی تازی بیگم، جو اس کے ساتھ ہی شیشے کے چھوٹے سے کاؤنٹر کے پیچھے پھنسی ہوئی اپنے گلے پہ پنکھا جھلا رہی ہوتی تھی، کلی طور پر اتفاق کرتی۔ اس کے گلے پہ جبے ہوئے پاؤڈر کی موٹی تہہ سے لکیریں سی بنی ہو تیں اور گلے سے نیچے اس کی جلد میں چھوٹے چھوٹے سرخ دھبے واضح دکھائی دیتے تھے۔ "اگر تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ شادی کرنے سے بی بی کا مرض ٹھیک ہو جائے گا تو اس سے بھلا شادی کرے گا کون؟ یہ کسی چیز کے بارے میں کچھ نہیں جانتی، ڈھنگ سے دو چار جملے تو یہ بول نہیں سکتی، عمر اس کی تیس کو جا پہنچی ہے، چولہا جلانا تک اسے آتا نہیں، چاول بھی ابالنا اس کے بس کا کام نہیں، اور تو اور یہ سونف اور زیرے میں فرق بھی نہیں کر سکتی۔ اب ایسے میں سوچو اگر اسے کسی مرد کے لیے کھانا بنانا پڑے تو کیا عالم ہو گا!"

ہلدار اور بیگم ہلدار کی ان باتوں میں بڑا وزن تھا۔ بی بی کو کبھی عورت بننے کے گن سکھائے ہی نہیں گئے تھے۔ اس کی بیماری نے اسے عملی زندگی کے ہنر سیکھنے کی دوڑ میں بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا اس لیے وہ سادہ لوح کی سادہ لوح ہی رہ گئی تھی۔ ہلدار کی بیگم کو پکا یقین تھا کہ بی بی پہ جنات کا سایہ ہے اس لیے وہ اسے آگ اور چولہے کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیتی تھی۔ بی بی کو سوئیاں اٹکائے بغیر ساڑھی پہننے کا ہنر کسی نے نہیں سکھایا تھا، نہ وہ غلافوں پہ کڑھائی کا فن جانتی تھی اور نہ ہی اسے شمال بننے کا سلیقہ آتا تھا۔ اسے ٹیلی ویژن تک دیکھنے کی اجازت نہیں تھی کیوں کہ اس کے کزن ہلدار کا خیال تھا کہ ٹیلی ویژن اسکرین سے نکلنے والی شعاعیں بی بی کی ہجیان انگیزی کو بڑھاوا دیں گی۔ یوں بی بی باہر کی دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات اور تفریح کے ذرائع سے مکمل بے خبر تھی۔ روایتی تعلیم میں بھی وہ بس

نویں جماعت تک ہی اسکول جایا تھی۔

بی بی کے لیے ہمارے دل میں سچی ہمدردی تھی اس لیے ہم نے اس کے لیے برڈھونڈنے کے حق میں دلائل دیے: "بی بی کی بھی تو ایک مدت سے یہی خواہش تھی! اس میں آخر برائی کیا ہے؟" لیکن ہلدار اور اس کی بیگم کو کسی دلیل سے قائل کرنا ممکن نہ تھا۔ بی بی کے لیے ان کے دلوں میں جو تلخی اور غصہ بھرا ہوا تھا وہ ان کے ہونٹوں پہ آنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا۔ جب ہم نے یہ رائے دی کہ ڈاکٹر کے تجویز کردہ اس نئے علاج کو آزما کر دیکھ لینا چاہیے تو وہ جھلا کر بولے: "بی بی کو نہ اپنی عزت کا خیال ہے نہ اسے اپنے آپ پہ قابو ہے، یہ اپنی بیماری کا ڈرامہ بڑھا چڑھا کر اس لیے کرتی ہے تاکہ لوگوں کی توجہ حاصل کر سکے۔ اس کا بہترین علاج یہی ہے کہ اسے مصروف رکھا جائے تاکہ یہ گڑبڑ کرنے سے دور رہے۔"

"پھر اس کی شادی ہی کیوں نہ کر دی جائے؟ تمہاری بھی اس سے جان چھوٹ جائے گی!"

"یعنی میں نے دکان میں جو کمایا ہے اس کی شادی پہ اڑا دوں؟ اس کے لیے چوڑیاں بنانے، جہیز خریدنے اور مہمانوں کو کھانے کھلانے پہ ہی سب کچھ لٹا دوں؟"

ہلدار اور بیگم ہلدار کے اس دو ٹوک جواب کے باوجود بی بی کا مطالبہ نہ صرف جاری رہا بلکہ اس میں مزید شدت آتی گئی۔ ایک روز دن چڑھے وہ ہلکے جامنی رنگ کی شیفون کی ساڑھی میں ملبوس پاؤں میں فینسی جوتے پہنے لڑکھرائی سنبھلتی ہلدار کی دکان میں جادھمکی۔ ساڑھی پہنانے میں ہم نے اس کی بخوشی مدد کی تھی اور اس کے پاؤں میں موجود جوتے بھی اس خاص موقع کے لیے اسے مہیا کیے تھے۔ بی بی نے دکان میں داخل ہوتے ہی ہلدار سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اسے فوٹو اسٹوڈیو لے جائے تاکہ باقی لڑکیوں کی طرح اس کی بھی تصویر کھینچ کر شادی کے خواہشمند لڑکوں کے گھروں میں گھمائی جاسکے۔ بالکونیوں میں کھڑے ہو کر اپنی کھڑکیوں سے ہم لوگ بی بی کو دیکھ رہے تھے۔ پسینے کے باعث اس کی بغلوں کے نیچے دائرے سے بن گئے تھے اور وہ ہلدار کو کہہ رہی تھی: "ایکس رے کے علاوہ میری کبھی تصویر نہیں اتاری گئی۔ میرے ہونے والے سرالیوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ میں کیسی دکھتی ہوں؟" جواب میں ہلدار کا انکار بہت صاف اور واضح تھا۔ وہ کہنے لگا کہ جسے تم کو دیکھنا ہو گا وہ یہاں آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ تم کیسے چیختی چلاتی اور روتی پیٹتی رہتی ہو۔ تم ہمارے کاروبار کے لیے ایک نحوست ہو۔ تمہاری وجہ سے ہمارے گاہک ٹوٹ جاتے ہیں، ہمیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ تم ہم پر ایک مستقل بوجھ ہو۔ یہ سب باتیں جاننے کے لیے کس کو بھلا تمہارے فوٹو کی ضرورت ہوگی؟

ہلدار کے اس صاف انکار کے بعد بی بی نے اگلے دن احتجاجاً رجسٹر میں چیزوں کے اندراج کا کام مکمل بند کر دیا اور اس

کی بجائے سارا دن ہمیں ہلدار اور اس کی بیگم کے بارے میں اندر کی چٹ پٹی باتیں بتاتی رہی: "ہر اتوار کو ہلدار اپنی بیگم کی ٹھوڑی سے بال اکھیڑتا ہے۔ یہ لوگ اپنے پیسے فریج میں چھپا کے اور فریج کو تالہ لگا کے رکھتے ہیں۔" وہ چھت پہ اکڑا کڑ کر ایک طرف سے دوسری طرف چل رہی تھی اور اس قدر چیخ کر بول رہی تھی کہ اس کی آواز ارد گرد کی چھتوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اس کی ہر چیخ کے ساتھ اس کے سامعین کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ "یہ موٹی غنسل خانے میں گھس کر اپنے بازوؤں پہ بیسن لپیتی رہتی ہے۔ ایسا کرنے سے اسے لگتا ہے کہ وہ گوری ہو جائے گی۔ اس کے دائیں پاؤں کی تیسری انگلی سرے سے ہے ہی نہیں! اور پتہ ہے یہ لوگ دوپہر کو اتنی دیر تک کیوں سوئے رہتے ہیں؟ کیوں کہ اس بھینس کی کبھی نیند پوری نہیں ہوتی! یہ سارا دن بھی سوئی رہے تو اس کو تسکین نہیں ملتی!"

بی بی کی زبان بندی کے لیے ہلدار نے مقامی اخبار میں ضرورت رشتہ کا ایک سطری اشتہار دیا جس کی عبارت یوں تھی: "ایک لڑکی کو، جس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے، قد ۱۵۲ سنٹی میٹر ہے، رشتے کی تلاش ہے۔" اشتہار میں مذکور لڑکی کی شناخت کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی، ہمارے علاقے کے سب لڑکوں کی مائیں اس سے آگاہ تھیں اور کوئی بھی خاندان اس بھاری ذمہ داری کا بوجھ اٹھا کر کوئی خطرہ مول لینے پر آمادہ نہ تھا۔ ویسے لڑکوں کی ماؤں کو مورد الزام ٹھہرانا مناسب بھی نہیں کیونکہ بی بی کے بارے میں باتیں ہی ایسی مشہور تھیں کہ ماؤں کا خوف سمجھ میں آتا تھا۔ مثلاً بہت سے لوگ بڑے وثوق سے کہتے تھے کہ بی بی اپنے آپ سے ایک ایسی جناتی زبان میں باتیں کرتی رہتی ہے جو اور کسی کو سمجھ نہیں آتی اور یہ کہ بی بی نے کبھی سوتے میں خواب نہیں دیکھا۔ اوروں کو تو چھوڑیں اکیلے زندگی گزارتے اس رنڈوے موچی کو بھی بی بی کے لیے رشتہ بھیجنے پہ قائل نہ کیا جاسکا جس کے محض آگے کے چار دانت بچے تھے اور جو ہمارے دستی بیگوں کی مرمت کر کے گزر بسر کرتا تھا۔

بحر حال بی بی کو مصروف رکھنے کے لیے ہم نے اسے سگھڑ بیوی بننے کی ٹریننگ دینا شروع کر دی۔ "یوں تیوری پہ بل ڈالے پھر وگی تو کوئی مرد تمہارے پاس نہیں پھٹکے گا۔ مردوں کو وہ عورتیں اچھی لگتی ہیں جن کی نظروں میں پیار ہو!" ہم نے بی بی کو اس کے ممکنہ شوہر سے پہلی دفعہ آمناسا منا ہونے کی صورت میں گفتگو کے لیے تیار کرنے کے واسطے یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے ارد گرد موجود مردوں سے چھوٹی موٹی بات چیت کیا کرے۔ مثلاً جب ماشکی سب کا پانی بھرنے کے بعد آخر میں اسٹور روم کا پانی بھرنے چھت پہ آئے تو ہم نے بی بی کو ہدایت کی کہ وہ اس کا حال چال پوچھے۔ اسی طرح جب کوئلے والا چھت پہ کوئلوں کی بالٹیاں خالی کر رہا ہو تو بی بی کو ہماری نصیحت تھی کہ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور موسم کے بارے میں ایک آدھ جملہ بول دے۔ اپنے ذاتی تجربات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے بی بی کو شادی کے انٹرویو کے لیے بھی ہدایات دیں: "دلہا اپنی ماں یا باپ کے ساتھ، دادا یا دادی اور اپنے کسے چچا یا چچی کے

ساتھ تمہیں دیکھنے آئے گا۔ وہ لوگ تمہیں سر سے پاؤں تک گھور گھور کر دیکھیں گے اور بہت سے سوال کریں گے۔ وہ تمہارے پاؤں کے تلووں اور تمہارے بالوں کی چوٹیوں کی موٹائی کا جائزہ لیں گے۔ وہ لوگ تم سے ملک کے پردھان منتری^{۴۴} کا نام پوچھیں گے، تمہیں کویتا^{۴۵} سنانے کو کہیں گے اور یہ پوچھیں گے کہ تم درجن بھر بھوکے لوگوں میں آدھار درجن انڈے کیسے تقسیم کرو گی۔"

جب دو ماہ اسی طرح گزر گئے اور اشتہار کے جواب میں کہیں سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو ہلدار اور اس کی بیگم کو اپنا موقف حق بجانب ثابت ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ "کیا اب آپ لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ یہ شادی کے لیے موزوں نہیں ہے؟ کیا اب بھی آپ لوگ نہیں دیکھ سکتے کہ کوئی ہوش مند مرد اسے ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کرے گا۔"

جب تک بی بی کا باپ زندہ تھا بی بی کے لیے حالات اس قدر اتر نہ تھے۔ اس کی ماں تو اسے جنم دیتے ہی چل بسی تھی۔ اس کے باپ نے، جو ہمارے ایلیمینٹری اسکول میں ریاضی کا استاد تھا، اپنی زندگی کے آخری سالوں میں خود کو بیٹی کے اس عجیب مرض کی گتھی سلجھانے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ بیٹی کی کل علامات کا بڑی جانفشانی سے ریکارڈ مرتب کر رہا تھا تاکہ اس بیماری کی کوئی منطقی وجہ دریافت کی جاسکے۔ جب کبھی ہم اس سے اس تحقیق میں کسی پیش رفت کے بارے میں سوال کرتے تو وہ جواب دیتا: "ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل موجود ہوتا ہے۔ اس مسئلے کا حل بھی نکل آئے گا!" وہ بی بی کو ہمیشہ تسلی دیتا تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ ایک دفعہ تو اس نے ہم سب کو بھی یقین دلایا تھا کہ بی بی کا مرض لا علاج نہیں۔ وہ انگلستان کے ڈاکٹروں کو خط لکھتا رہتا اور اپنی شاہیں لائبریریوں میں اس بیماری سے متعلق کتابیں کھنگالنے میں گزار دیتا۔ اس نے دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے جمعہ کے دن ماس کھانا بھی ترک کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ بالآخر اس نے اپنی نوکری چھوڑ کر گھر میں بچوں کو یوشن دینے کا کام بھی محض اسی لیے شروع کر دیا تاکہ وہ ہر وقت بی بی کے پاس رہ کر اس کی بیماری پر نظر رکھ سکے۔ لیکن اپنی جوانی میں اعداد کی بہت سی گتھیاں محض اپنی یادداشت کے بل پر سلجھا کر بہت سے انعام جیتنے والا یہ بد قسمت بوڑھا اپنی بیٹی کے مرض کا معمہ حل کرنے میں ناکام رہا۔ اس کی تمام تر کوششوں اور مرتب شدہ ریکارڈوں کے نتیجے میں وہ بس اتنا سمجھ پایا تھا کہ بی بی کو سردیوں کے مقابلے میں گرمیوں میں زیادہ دورے پڑتے تھے اور اس کو اب تک کل تقریباً پچیس بڑے دورے پڑ چکے تھے۔ اس نے بی بی کے دورے کی علامتوں کا ایک چارٹ بنا کر نیچے وہ تدابیر بھی درج کیں جن سے بی بی کو شانت کیا جاسکتا تھا اور پھر یہ چارٹ آس پڑوس کے سب گھروں میں تقسیم کر دیا۔ لیکن یہ سب ہدایت نامے جلد ہی غائب ہو گئے۔ کچھ کو ہمارے بچوں نے بارش میں کشتیاں بنا کر بہا دیا اور کچھ کی الٹی طرف ہم نے کریانے کے حساب کتاب لکھ کر انہیں استعمال کر لیا۔

بی بی کو تنہائی سے بچانے کے لیے اسے اپنی صحبت میں بٹھانے اور اس کے غموں پر زبانی کلامی مرہم رکھنے کے سوا اور کچھ ایسا نہ تھا جو ہم اس کی حالت بدلنے کے لیے کر سکتے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کے وجود سے جڑی اس بے چارگی اور بے بسی کو سمجھنے کے قابل نہ تھا۔ ہم دن کو جب قیلولہ کر کے اٹھتے تو چھت پہ آکے بی بی کے بال سنوارتے اور ہر کچھ دن بعد اس کی مانگ بدلتے رہتے۔ اس کی فرمائش پہ ہم اس کے گلے پہ پاؤڈر لگاتے، اس کی آنکھوں میں کاجل کی لکیر کھینچتے اور اسے اپنے ساتھ مچھلیوں کے تالاب کنارے لے جاتے جہاں ہمارے بچے شام کو کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ بی بی اب بھی پر عزم تھی کہ وہ کسی نہ کسی مرد کو اپنے طرف مائل کرنے میں ضرور کامیاب ہوگی!

"میری اس بیماری کے علاوہ مجھے اور کوئی مسئلہ نہیں میں بالکل صحت مند ہوں۔" ایک دن اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ہم لوگ ایک بیچ پہ بیٹھنے لگے تھے جو پیدل چلنے والوں کے لیے بنائے گئے رستے کے کنارے نصب تھا۔ سامنے پریمی جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مٹر گشت کر رہے تھے۔ "مجھے زندگی میں کبھی نزلہ یا زکام نہیں ہوا نہ کبھی یرقان ہوا، مجھے کبھی پیٹ میں مروڑ نہیں اٹھے نہ مجھے کبھی بد ہضمی ہوئی ہے!"

بعض اوقات اس خوش خرامی کے دوران ہم بی بی کو مکئی کے بھنے ہوئے بھٹے لے کر دیتے جن پہ لیموں کا رس چھڑکا ہوتا تھا یا پھر وہ ٹافیاں خرید کر دیتے جو دو پیسے کی ایک آتی تھی۔ جب کبھی وہ ہمیں کہتی کہ فلاں آدمی اسے تاڑ رہا ہے تو ہم ہنستے ہنستے اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے۔ جب وہ ادا اس ہوتی تو ہم اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن اپنی تنہائی میں ہم یہ سوچ کر شکر کرتے کہ جو بھی ہو وہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے!

ماہ نومبر میں ہم نے سنا کہ ہلدار کی بیوی پیٹ سے ہے۔ اُس صبح اسٹور روم میں بیٹھی بی بی بے طرح رو دی۔ "وہ کہتی ہے کہ میرا مرض چچک کی طرح متعدی ہے، کہتی ہے میں اس کے بچے کو بھی بیمار کر دوں گی!" اس کی سانس اتھل پتھل ہو رہی تھی اور اس کی نظریں دیوار پہ ایک ایسے نکتے پہ مرکوز تھیں جہاں سے کچھ پینٹ اکھڑا ہوا تھا۔ "اب میرا کیا ہو گا؟" اخبار میں دیے گئے اشتہار کا بھی ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ "کیا اتنی سزا کافی نہیں تھی کہ میں اس شراپ کو اکیلے اٹھائے پھروں؟ کیا اب مجھ پہ کسی دوسرے کو یہ بیماری چمٹانے کا بھی الزام لگے گا؟"

ہلدار کے گھر میں بی بی کو لے کر اختلافات گہرے ہونے لگے۔ ہلدار کی بیوی کو یقین تھا کہ بی بی کی موجودگی اس کے ہونے والے بچے کو بھی بیمار کر دے گی۔ چنانچہ اس نے اپنے پھولے ہوئے پیٹ کے گرد اونی کمبل لپیٹنے شروع کر دیے۔ غسل خانے میں بی بی کا صابن اور تولیہ الگ کر دیے گئے۔ گھر میں برتن مانجنے والی مائی نے یہ بھی بتایا کہ اب بی بی کے برتن باقی برتنوں کے ساتھ نہیں دھوئے جاتے!

انہی حالات میں ایک شام بغیر کسی پیشگی نشانی کے بی بی پہ دوبارہ دورہ پڑا۔ مچھلیوں کے تالاب کنارے بی بی چلتے چلتے

فٹ پاتھ پہ گر گئی۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ اس کے سارے جسم پہ شدید لرزہ طاری تھا اور وہ اپنے ہونٹ بری طرح کاٹ رہی تھی۔ لوگوں کا ایک ہجوم اس تڑپتی لڑکی کے گرد اکٹھا ہو گیا اور ہر کوئی اپنی تئیں اس کی مدد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ سوڈے کی بوتلیں بیچنے والے ریڑھی بان نے اس کے بازوؤں کو نیچے دبایا اور کٹے ہوئے کھیرے بیچنے والے کنجڑے نے اس کی بند مٹھیوں کو کھولنے کی کوشش کی۔ ہم میں سے ایک نے تالاب سے پانی لا کر اس کے مونہ پہ انڈیلا اور ایک دوسری نے اس کے مونہ کو اپنے معطر رومال سے پونچھا۔ جیک فروٹ بیچنے والے نے اس کے سر کو دبار کھا تھا کیوں کہ وہ دائیں بائیں زور زور سے سر مارنے کی کوشش کر رہی تھی اور گنے کے رس والا اپنے اس دستی پتکھے سے، جو وہ کھیاں اڑانے کے لیے استعمال کرتا تھا، زور زور سے بی بی کو ہوا جھل رہا تھا۔ ہجوم میں سے طرح طرح کی آوازیں آرہی تھیں۔

"کیا یہاں کوئی ڈاکٹر موجود ہے؟"

"دیکھنا یہ اپنی زبان نہ کاٹ لے!"

"کسی نے ہلدار کو اطلاع دی ہے؟"

"اس کا جسم تو کوئلوں سے بھی زیادہ دھک رہا ہے!"

ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود بی بی پر طاری تشنج کی یہ کیفیت کم نہ ہوئی۔ اپنے اس انجان دشمن سے نبرد آزما، درد سے جو جھتی بی بی دانت پیس رہی تھی اور اس کے مڑے ہوئے گھٹنے مسلسل جھٹکے کھا رہے تھے۔ دو منٹ سے زائد وقت اسی کیفیت میں گزر گیا۔ ہم بے بسی سے بی بی کو دیکھ دیکھ کر دکھی اور پریشان ہو رہے تھے۔ ہمیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کریں۔

"چمڑا!" اچانک کسی نے چلا کر کہا۔ "اسے چمڑے کی کوئی چیز سنگھاؤ!" تب ہمیں بھی یاد آیا کہ بی بی کو جب آخری دفعہ دورہ پڑا تھا تو اس کی ناک کے نیچے گائے کے چمڑے سے بنے سینڈل رکھے گئے تھے تب ہی وہ اس اذیت کی کیفیت سے باہر نکل پائی تھی۔

"بی بی! کیا ہوا؟ ہمیں بتاؤ کیا ہوا ہے؟" جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ہم نے اس سے سوال کیا۔

"مجھے سخت حدت محسوس ہوئی تھی پھر یہ بڑھتی چلی گئی۔ میرے آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا۔ مجھے ساری دنیا تاریک لگنے لگی تھی۔ کیا تم لوگوں نے میری یہ حالت نہیں دیکھی؟"

ہمارے شوہروں میں سے کچھ مل کر بی بی کو لے کر گھر کی طرف چلے۔ اس وقت شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، مندروں سے سنکھ بجنے کی آوازیں آرہی تھیں اور ہوا پوچا پاٹ کے لیے جلائی جانے والی اگر بتیوں کی تیز خوشبو سے

بو جھل تھی۔ بی بی پہلے تو مونہ ہی مونہ میں کچھ بڑبڑائی لیکن پھر کچھ کہے بغیر لڑکھڑاتے ہوئے چل پڑی۔ اس کے گالوں پہ ناخنوں کی خراشیں اور جا بجا چھوٹے چھوٹے گھاؤ دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے سر کے بال اجڑے بچڑے سے لگ رہے تھے، کہنیاں مٹی سے لتھڑی ہوئی تھیں اور سامنے کے ایک دانت کا چھوٹا سا حصہ ٹوٹ کر گر گیا تھا۔ ہم ان کے پیچھے پیچھے، محفوظ فاصلہ رکھے، اپنے بچوں کے ہاتھ پکڑے چل رہے تھے۔

بی بی کو اس وقت زخموں کے لیے مرہم پٹی، آرام کے لیے کمبل اور نیند کے لیے سکوں اور گولیوں کی ضرورت تھی۔ اسے کسی خیال رکھنے والے کی ضرورت تھی لیکن جب ہم اپنی رہائشی عمارت کے احاطے میں پہنچے تو ہلدار اور اس کی بیگم نے بی بی کو اپنے فلیٹ لے جانے سے انکار کر دیا۔

"ایک ماں بننے والی عورت کے ساتھ کسی ہسٹیریا کے مریض کا رہنا میڈیکل کی رو سے اتنا بڑا خطرہ ہے کہ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔" ہلدار نے اپنے فیصلے کے حق میں حتمی دلیل دیتے ہوئے کہا۔

اُس رات بی بی چھت پہ بنے اسٹور روم میں پہلی دفعہ سوئی!

جون کے آخر میں ہلدار کے ہاں ایک بچی کی پیدائش ہوئی۔ دورانِ پیدائش ڈاکٹروں کی مدد کی ضرورت پڑی کیوں کہ کچھ پیچیدگیاں در آئی تھیں۔ اُس وقت تک بی بی نے دوبارہ نیچے فلیٹ میں سونا شروع کر دیا تھا اگرچہ اب بھی اس کی ترپال سے بنی کھاٹ فلیٹ کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی رکھی رہتی تھی اور بچی کو براہ راست چھونے کی اس کو قطعاً اجازت نہ تھی۔ ہر روز ہلدار اسے چھت پہ بنے اسٹور روم میں بھیج دیتا جہاں وہ صبح سے لے کر دن کے کھانے تک دکان کی چیزوں کا اندراج کرتی رہتی۔ دن کو ہلدار اسے کھانے کے لیے ایک پلیٹ چنے کی دال اور دن بھر دکان میں فروخت ہونے والی چیزوں کی بہت سے رسیدیں تمھا جاتا۔ یوں شام تک وہ چیزوں کی فہرستیں بنانے میں جتی رہتی۔ شام کو وہ تنہا سیڑھیوں پہ بیٹھ کے سوکھی روٹی کے ساتھ دودھ کا ایک پیالہ پی لیتی۔ اسے چھت پہ ایک کے بعد ایک دورا پڑا لیکن کوئی اس کا خیال رکھنا والا نہ تھا۔

جب ہم نے بی بی کی اس دگرگوں حالت کا ذکر ہلدار سے کیا تو اس نے ٹکسا جواب دے دیا۔ اس نے کہا کہ ہمارا اس معاملے سے کچھ لینا دینا نہیں ہے اور وہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ اس ظلم کے خلاف بطور احتجاج ہم نے ہلدار سے چیزیں خریدنا بند کر دیں۔ ہمارے پاس ہلدار سے بدلہ لینے کا کوئی اور طریقہ تھا بھی نہیں۔ ہمارے بائیکاٹ کا یہ اثر ہوا کہ چند ہفتوں میں ہی دکان کی الماریوں میں چیزوں پہ پڑے پڑے دھول جمنے لگی۔ چیزوں کے نام دھندلانے لگے اور کولون کی شیشیاں خراب ہونے لگیں۔ شام کو اس کی دکان کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم دیکھتے کہ وہ اکیلا بیٹھا اپنی چپل سے مکھیاں مار رہا ہوتا۔ اب اس کی بیگم اس کے ساتھ دکان میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی تھی۔

ان کے برتن مانجنے والی ملازمہ سے ہمیں پتہ چلا کہ وہ ابھی بھی بستر پہ پڑی رہتی ہے۔ غالباً زچگی کے دوران پیدا ہونے والی پیچیدگیوں نے اس کی صحت کو بری طرح متاثر کیا تھا۔

موسم خزاں کی آمد کے ساتھ ہی قصبے میں رونقیں بڑھنے لگیں۔ لوگ اکتوبر کی چھٹیوں کے لیے خریداریاں کر رہے تھے اور گھومنے پھرنے کے نئے نئے منصوبے بنا رہے تھے۔ درختوں پہ ٹنگے سپیکروں سے سارا دن فلمی گانے بجتے رہتے اور بازار میں دکانیں چوبیس گھنٹے کھلی رہتیں۔ ہم نے اپنے بچوں کو رنگ برنگے غبارے لے کر دیے، ڈھیروں مٹھائیاں خرید خرید کر لائے اور ٹیکسیوں میں لد کر اپنے ان رشتہ داروں کے ہاں جا جا کر ملاقاتیں کیں جن سے ہم سارا سال نہیں مل پائے تھے۔ اب دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہو رہی تھیں۔ ہوا میں خنکی بڑھتے ہی ہم نے سوئٹریں پہن لیں اور جرابیں چڑھالیں۔ سردی کی پہلی لہر کے ساتھ ہی ہمارے گلے دکھنے لگے تھے۔ ہم اپنے بچوں کو موسمی بخار سے بچانے کے لیے گرم پانی میں نمک ڈال کر غرارے کرواتے اور ان کی گردنوں کے گرد مفلر لپیٹے رکھتے۔ لیکن موسم کی اس تبدیلی سے ہلدار کی بیٹی نہ بچ سکی۔ اسے بیماری نے جکڑ لیا۔

آدھی رات کو ایک ڈاکٹر کو بلا یا گیا تا کہ وہ بخار سے پھٹکتی بچی کا کچھ علاج کرے۔ "میری بچی کو کسی طرح ٹھیک کر دو!" ہلدار کی بیوی کی ڈاکٹر سے التجا اتنی بلند تھی کہ اس کے شور سے ہم لوگ نیند سے جاگ اٹھے۔ "آپ جو کہیں گے ہم آپ کو دیں گے بس ہماری اس ننھی سی جان کو ٹھیک کر دیں۔" ڈاکٹر نے بچی کو کچھ اسپرین کی گولیاں ہاون دستے میں پیس کر پلائیں، اس کے لیے گلوکوز کی ایک بوتل لکھی اور ان کو کہا کہ وہ بچی کو رضائی اور چادروں میں لپیٹ کر رکھیں۔

پانچ دن یوں ہی گزر گئے لیکن بچی کی حالت میں سر مو فرق نہ پڑا۔ وہ ابھی تک بخار سے جل رہی تھی۔ "یہ بی بی کی وجہ سے ہے!" ہلدار کی بیوی ایک شام گریہ کرتے ہوئے چیخ اٹھی۔ "اسی کا یہ کیا دھرا ہے، اسی نے ہماری بیٹی کو بیمار کیا ہے۔ ہمیں اس کو یہاں نیچے نہیں آنے دینا چاہیے تھا، ہمیں اس کو واپس گھر میں گھسنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔"

یوں بی بی نے دوبارہ راتیں اسٹور روم میں کاٹنی شروع کر دیں۔ ہلدار نے اپنی بیوی کے اصرار پر بی بی کی ترپال والی کھاٹ اور ٹین سے بنے اس صندوق کو بھی چھت پر لاپھینکا جس میں بی بی کا سامان پڑا رہتا تھا۔ ہلدار نے بی بی کے لیے کھانا بھی چھلنی سے ڈھک کر سیڑھیوں پہ ہی رکھنا شروع کر دیا۔

دوسری صبح جب ہم بی بی کے پاس چھت پہ گئے تو وہ اپنے ٹین کے صندوق سے سامان نکال رہی تھی۔ "مجھے برا نہیں لگا۔ ان سے دور رہنا اور اپنا گھر خود بنانا ہی میرے لیے اچھا ہے۔" اس نے صندوق سے اپنی چیزیں نکال کر خالی

الماریوں میں ترتیب سے رکھتے ہوئے کہا۔ سامان کیا تھا کچھ قمیصیں، اس کے باپ کی ایک فریم شدہ تصویر، سینے پر ونے کے کچھ لوازمات اور کچھ ان سلے کپڑے۔ ہفتے کے اختتام تک بچی کی حالت میں کافی سدھار آچکا تھا لیکن بی بی کو نیچے فلیٹ میں سونے کے لیے نہیں بلایا گیا۔ ایک دن ہمارے چہرے متفکر دیکھ کر وہ بولی: "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے مجھے چھت پہ قید تھوڑی کر دیا ہے۔ دنیا ان سیڑھیوں سے نیچے شروع ہوتی ہے۔ اب میں اپنی زندگی کو جیسے چاہوں گزارنے کے لیے آزاد ہوں۔"

لیکن بی بی کے اس دعوے کے باوجود حقیقت یہ تھی کہ اس نے کہیں باہر آنا جانا بالکل ترک کر دیا۔ جب ہم اسے مچھلیوں کے تالاب کنارے سیر کرنے یا مندروں کی سجاوٹ دیکھنے کے لیے ساتھ چلنے کی دعوت دیتے تو وہ یہ کہتے ہوئے انکار کر دیتی کہ وہ اسٹور روم کے دروازے پہ لٹکانے کے لیے نیا پردہ سی رہی ہے۔ اسٹور روم میں بیٹھ بیٹھ کر اس کی رنگت پیلی پڑتی جا رہی تھی۔ اسے تازہ ہوا کی ضرورت تھی۔ "اگر تم سارا دن یہاں بیٹھی رہو گی تو کسی مرد کو اپنی طرف کیسے مائل کر پاؤ گی؟ کیا تم نے شوہر تلاش نہیں کرنا؟" ہم اسے ساتھ چلنے کے لیے اکساتے لیکن کوئی حربہ کارگر ثابت نہ ہوتا۔ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوتی تھی۔

دسمبر کے وسط تک ہمارے اپنی کا سمیٹکس کی دکان کا وہ سامان جو بکنے سے رہ گیا تھا الماریوں سے نکال کر ڈبوں میں بند کیا اور ان ڈبوں کو کھینچ کھانچ کر اوپر اسٹور روم میں پہنچا دیا۔ ہمارے بائیکاٹ نے اسے کاروبار سے نکال باہر کیا تھا۔ سال کے اختتام سے قبل ہی ہمارے فیملی اپنا فلیٹ چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو گئی۔ جاتے جاتے وہ بی بی کے دروازے کے نیچے ایک لفافہ رکھ گئے تھے جس میں تین سو روپے پڑے تھے۔ اس کے بعد ان کی کبھی کوئی خبر نہیں ملی۔

ہم میں سے کسی ایک کے پاس بی بی کے ایک رشتہ دار کا پتہ موجود تھا جو حیدر آباد میں رہتے تھے۔ چنانچہ ان کو ساری صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے خط لکھا گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ خط جوں کا توں واپس آ گیا۔ اس پتے پر کوئی موجود نہ تھا۔

جاڑے کی رگوں میں خون منجمد کرنے والی سردی پڑنے سے پہلے ہم نے اسٹور روم کی کھڑکی کے کواڑ مرمت کروا دیے اور دروازے کے فریم میں ٹین کی چادر لگوا دی تاکہ بی بی کو کچھ خلوت تو میسر ہو۔ کسی ایک نے بی بی کو مٹی کے تیل سے چلنے والی بتی عطیہ کی تو کسی دوسری نے اسے پرانی مچھر دانی اور بن ایڑیوں والی جرابوں کا ایک جوڑا بطور امداد دیا۔ ہر موقع پر ہماری یہ کوشش ہوتی کہ ہم بی بی کو یہ احساس دلا سکیں کہ ہم اس کے پاس موجود ہیں اور اسے جب بھی کوئی مشورہ لینا ہو ہو یا کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ بے جھجک ہمارے پاس آ سکتی ہے۔ ہم شام کو اپنے بچوں کو کھیلنے کے لیے چھت پہ بھیج دیتے تھے تاکہ اگر بی بی کو دورا پڑے تو وہ ہمیں خبردار کر سکیں۔ لیکن رات کو بی بی کے پاس

کوئی نہ ہوتا تھا۔

کچھ مہینے ہی گزر گئے۔ بی بی ایک گہری اور طویل خاموشی کی گود میں اترتی چلی جا رہی تھی۔ ہم نے اسے کھانا دینے کے لیے بار بار مقرر کر رکھی تھیں لیکن اس نے کھانا پینا بہت کم کر دیا تھا اور اس کے چہرے پر ہر وقت ایسی کیفیت طاری رہتی جو اس کی عمر سے میل نہ کھاتی تھی۔ شام کے دھندلکے میں وہ چھت کی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک دو چکر لگاتی لیکن اس نے چھت سے اتر کر نیچے آنا جانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ رات پڑتے ہی وہ اسٹور روم میں ٹین کے دروازے کے پیچھے گم ہو جاتی اور کچھ بھی ہو جائے باہر نہ نکلتی تھی۔ ہم بھی اس کے آرام میں خلل انداز نہ ہوتے۔ ہم میں کچھ کے ذہنوں میں یہ سوال اٹھتے رہتے تھے کہ کیا بی بی آہستہ آہستہ مر رہی ہے جب کہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہے۔

موسم بدلتے ہی اپریل کی ایک صبح جب ہم چھت پہ میدے سے بنے پاڑ سکھانے کے لیے رکھنے گئے تو ہم نے دیکھا کہ پانی کی ٹونٹی کے پاس کسی نے قے کی ہے۔ جب دوسری صبح بھی یہی قصہ نظر آیا تو ہم نے بی بی کے ٹین کے دروازے پہ جادستک دی۔ کوئی جواب موصول نہ ہوا تو ہم دروازہ باہر کی طرف کھول کر اندر داخل ہوئے کیونکہ دروازے کی کوئی کنڈی نہ تھی۔ اندر بی بی اپنی ترپال کی کھاٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ لگ بھگ چار ماہ کی حاملہ تھی۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ اس پر کیا بتی تھی۔ وہ ہمیں یہ بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ یہ کس کا کیا دھرا تھا۔ ہم اس کے لیے سوچی کا حلوہ، کشمش اور گرم دودھ لے کر آئے لیکن وہ پھر بھی اس مرد کی شناخت بتانے پہ آمادہ نہ ہوئی۔ تھک ہار کر ہم نے خود اس زیادتی کی نشانیاں ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن کمرے میں ہر شے ترتیب سے پڑی تھی کہیں کسی زبردستی کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ کھاٹ کے ساتھ نیچے فرش پہ وہ رجسٹر کھلا پڑا تھا جس میں کبھی بی بی دکان کی چیزوں کی فہرستیں بنایا کرتی تھی۔ رجسٹر کے کھلے صفحے پہ بی بی کی ٹیڑھی میڑھی لکھائی میں ناموں کی ایک فہرست بنی ہوئی تھی۔

بی بی نے پورے نو ماہ تک بچے کو کوکھ میں رکھنے کے بعد ستمبر کی ایک شام ایک بیٹے کو جنم دیا۔ زچگی میں ہم نے اس کی بھرپور مدد کی تھی۔ ہم نے بی بی کو سکھایا کہ بچے کو دودھ کیسے پلانا ہے، اسے نہلانا کیسے ہے اور لوری دے کے سلانا کیسے ہے۔ ہم بچے کے نیچے بچھانے کے لیے موم جامہ لے کر آئے اور بچے کے کپڑے اور سرہانوں کے غلاف سینے میں بی بی کا ہاتھ بٹایا۔ بی بی کئی سالوں سے جو ان سلعے کپڑے اپنے صندوق میں جوڑتی رہی تھی اس موقع پر وہ بہت کام آئے۔ ایک ماہ کے اندر اندر ہی بی بی کی صحت بحال ہو گئی اور اس نے ہلدار کے چھوڑے ہوئے تین سو روپوں سے اسٹور روم میں سفیدی پھر والی اور دروازے اور کھڑکیوں میں کنڈیاں لگا کر تالے لٹکا دیے۔ پھر اس نے الماریوں کو

جھاڑ جھوڑ کے ہلدار کی چھوڑی ہوئی کریموں اور لوشنوں کو آدھی قیمت پر فروخت کرنے کے لیے سجا دیا۔ اس کے کہنے پر ہم نے سب لوگوں کو اس نئی "دکان" کے بارے میں آگاہ کیا۔ ہم نے خود بھی بی بی سے صابن، سرمے، کنگھیاں اور پاؤڈر خریدے اور جب بی بی کا سب سامان بک گیا تو وہ ٹیکسی میں سوار منافع سے حاصل ہونے والی رقم سے مزید سامان تھوک بازار سے اٹھالائی اور اسے اپنی الماریوں میں سجا دیا۔ اس طرح اسٹور روم میں بیٹھ کر کاروبار چلاتے ہوئے بی بی نے اپنے بیٹے کی پرورش کی اور اس کی مدد کے ضمن میں ہم سے جو بن پڑا ہم نے کیا۔ کئی سال تک ہم یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتے رہے کہ بھلا قصبے میں کون ہے جس نے بی بی کی عصمت دری کی تھی۔ ہمارے کئی نوکروں سے پوچھ گچھ چلتی رہی، چائے کے اسٹالوں اور بس اسٹاپ پر مشتبہ ناموں پہ بحث کے بعد سب کو ایک ایک کر کے رد کیا جاتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ موضوع گفتگوؤں سے غائب ہو گیا۔ اس تفتیش کو جاری رکھنے کی کوئی وجہ باقی نہ تھی۔ بی بی، ہمارے اندازے کے مطابق، اپنی بیماری سے ہمیشہ کے لیے شفا پا چکی تھی۔

تیسرا اور آخری برا عظم

میں نے اپنے وطن انڈیا کو ۱۹۶۴ء میں الوداع کہا۔ اس وقت میرے پاس تعلیم کے نام پر کامرس میں ایک سرٹیفکیٹ اور زادِ راہ کے طور پر جیب میں، اس وقت کے حساب سے، دس ڈالر کے برابر رقم تھی۔ میں ایک اطالوی بحری جہاز "ایس ایس روما" پہ سوار ہو کر سوئے برطانیہ عازم سفر ہوا۔ اس کارگو جہاز پہ میرا تھرڈ کلاس کین انجن کے بالکل ساتھ تھا۔ ہم تین ہفتے بحیرہ عرب، بحیرہ احمر اور بحیرہ روم کے پانیوں پہ تیرتے بالآخر انگلستان جا پہنچے۔ میں نے شمالی لندن کے علاقے فنزبری پارک میں اپنے سینک ایک ایسے گھر میں جاسموئے جہاں میری ہی طرح کے لگ بھگ درجن بھر قلاش بنگالی نوجوان پہلے سے رہ رہے تھے۔ یہ سب اپنی تعلیم بہتر کرنے اور دیارِ غیر میں اپنے قدم جمانے کی تگ و دو میں جتے ہوئے تھے۔

میں لندن سکول آف اکنامکس کے لیکچروں میں بیٹھتا اور یونیورسٹی کی لائبریری میں کام کر کے جیسے تیسے گزر بسر کرتا تھا۔ گھر میں ہر کمرے میں تین سے چار لڑکے رہتے اور ایک ہی مشترکہ ٹائلٹ استعمال کرتے جو برف کی طرح بخ بستہ ہوتا تھا۔ کھانے پکانے کی باریاں بندھی ہوئی تھیں اور زیادہ تر انڈے کا شوربے والا سالن پکتا جو ہم کھانے کی میز پر بچھے پرانے اخبار کے صفحات پہ رکھ کے کھایا کرتے تھے۔ ابھی تک ہمیں چھری کانٹے سے کھانے کی عادت نہیں پڑی تھی۔ اپنی اپنی نوکریوں کے علاوہ ہم سب پہ کوئی اور قابل ذکر ذمہ داریاں نہ تھیں۔ اس لیے ہم لوگ ہفتے کے اختتام پر چھٹی کے دن ازار بند والے پاجامے چڑھائے، ننگے پیر لاؤنچ میں دراز ہو کر چائے پیتے اور سگریٹ پھونکتے رہتے تھے یا پھر لارڈز کے میدان میں کرکٹ میچ دیکھنے نکل جاتے تھے۔ بعض چھٹی کے دنوں میں گھر کچھ مزید بنگالیوں سے بھر جاتا۔ یہ ہمارے وہ نئے شناسا ہوتے تھے جن سے سبزی کی دکانوں پہ خریداری کرتے ہوئے یا زیر زمین ٹرینوں پہ دوران سفر ہماری ہیلو ہائے ہو جاتی تھی۔ ان کی آمد پہ ہم انڈوں کے شوربے والے سالن کی مقدار بڑھا دیتے تھے اور گرندگ^۶ کے ٹیپ ریکارڈر پہ مکیش کے گانے سن کر مست ہوتے تھے۔

چھٹروں کے اس ہاسٹل نما گھر سے ہر کچھ عرصے بعد ایک آدھ پنچھی کسی ایسی لڑکی کے ساتھ رہنے کے لیے پرواز کر جاتا جس سے کلکتہ میں رہنے والے اس کے والدین اس کی شادی کے لیے بضد ہوتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں جب میں عمر کی چھتیس بہاریں دیکھ چکا تھا تو یوں ہی میری شادی کی بات بھی چل نکلی۔ اسی زمانے میں مجھے امریکا میں ایم آئی ٹی کی ایک لائبریری میں کل وقتی ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ تنخواہ اس قدر تھی کہ میں اس میں بیوی کو ساتھ رکھ سکتا تھا اور ایک شہرہ آفاق یونیورسٹی میں کام کرنا میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھا اس لیے میں نے جھٹ پٹ اقامتی گرین

کارڈ حاصل کیا اور امریکا پرواز کرنے کے لیے کمر باندھنے لگا۔

انگلستان میں چار پانچ سال کی عرق ریزی کے بعد میں اب اس قابل ہو چکا تھا کہ امریکا جانے کے لیے بحری کی بجائے ہوائی جہاز کا انتخاب کر سکوں۔ چنانچہ میں پہلے کلکتہ پہنچا جہاں میرے سر شادی کا سہرا باندھا گیا اور اس کے ایک ہفتے بعد میں بوسٹن کے لیے محو پرواز ہوا جہاں میں نے نئی ملازمت شروع کرنی تھی۔ دوران پرواز میں "طلبہ کے لیے شمالی امریکا کا رہنما کتابچہ" پڑھتا رہا۔ میں اگرچہ طالب علم نہیں تھا لیکن میرے مالی حالات طالب علموں جیسے ہی تھے۔ کاغذی جلد والی یہ گائیڈ بک میں نے لندن کو الوداع کہنے سے قبل سات شیلنگ اور چھ پنس کے عوض ٹوٹن ہیم کورٹ روڈ کے علاقے سے خریدی تھی۔ کتابچے سے مجھے پتہ چلا کہ امریکی گاڑیوں کو سڑک کے بائیں ہاتھ کی بجائے دائیں ہاتھ پہ چلاتے ہیں اور وہ لفٹ کو ایللی ویٹر اور فون مصروف ہونے کی صورت میں اسے انگلیج کی بجائے بڑی کہتے ہیں۔ "آپ کو جلد ہی یہ احساس ہو گا کہ شمالی امریکا میں زندگی کی رفتار برطانیہ سے مختلف ہے۔" کتابچے میں درج تھا۔ "یہاں ہر کوئی ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ میں جتا ہوتا ہے اس لیے آپ برطانیہ جیسی متحمل مزاجی اور مہمان نوازی کی توقع امریکا میں مت کریں۔" جب جہاز بوسٹن کی بندر گاہ سے گزرتے ہوئے نیچے اترنے لگا تو پائلٹ نے وقت اور موسم کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ یہ خوش خبری بھی دی کہ دو امریکیوں کے چاند پر قدم رکھنے کی خوشی میں صدر نکسن نے قومی تعطیل کا اعلان کیا ہے۔ یہ سن کر بہت سے مسافروں نے اظہار مسرت کیا اور ایک نے زور سے نعرہ مارا: "گاڈ بلیس امیریکا"۔ نشستوں کی قطار کے درمیان میں نے دیکھا کہ ایک عورت دعا کے لیے ہاتھ باندھے ہوئے ہے!

میں نے پہلی شب کیمبرج میں سنٹرل سکوائر میں واقع وائی ایم سی اے^۸ میں گزاری۔ اس سستی رہائش کا پتہ مجھے میرے رہنما کتابچے سے ملا تھا۔ ایم آئی ٹی سے یہ جگہ پیدل مسافت کی دوری پہ تھی اور اس کے نزدیک ہی ڈاکخانہ اور ایک سپر مارکیٹ بھی تھی جسے "پورٹی سپریم" کہا جاتا تھا۔ وائی ایم سی اے میں میرے رہائشی کمرے میں ایک عدد پلنگ اور ایک میز کرسی دھرے تھے اور دیوار پہ ایک چھوٹا سا صلیب کا چوبی نشان ٹنگا تھا۔ دروازے پہ انتباہی علامت چسپاں تھی جس کے مطابق کمرے میں کھانا پکانا سختی سے منع تھا۔ پردوں سے عاری کمرے کی اکلوتی کھڑکی میسی چیوسٹ ایونیو کی طرف کھلتی تھی اور اس چوڑی چمکی رابطہ سڑک پر دو رویہ ٹریفک ہمہ وقت رواں دواں تھی۔ گاڑیوں کے چیختے دھاڑتے ہارن مسلسل سامعہ خراشی کر رہے تھے اور ایمر جنسی گاڑیوں کے تیزی سے قریب آتے اور دور جاتے سائرنوں کی آوازیں گویا کبھی نہ ختم ہونے والی انہونیوں کا اعلان تھیں۔ ساری رات سڑک سے ایک کے بعد ایک بس گزرتی رہی اور ان کے دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی تیز سنسنائیں میرے کانوں میں گویا

بیوسٹ ہوتی رہیں۔ ٹریفک کا یہ شور مسلسل مجھے پریشان کرتا رہا اور کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا جیسے اس ہنگامے میں میرا دم گھٹ چلا ہے۔ مجھے یہ آوازیں اپنی پسلیوں میں بالکل ویسے ہی کھبتی ہوئی محسوس ہوئیں جیسے پہلی دفعہ انڈیا سے انگلستان آتے ہوئے "ایس ایس روما" کے چنگھاڑتے ہوئے انجن کی آوازیں محسوس ہوئی تھیں۔ لیکن اب جہاز کا کوئی عرشہ نہ تھا جہاں میں اس شور سے بھاگ کر پناہ لے سکتا، جہاں میں سمندر کے چمکتے دکتے پانیوں کو دیکھ کر اپنی روح کو شاد کام کر سکتا، جہاں میں بادِ صبا کے نرم جھونکوں کی خنکی اپنے چہرے پہ محسوس کر پاتا اور جہاں میں کسی بشر سے ہم کلام ہو سکتا۔ میں سفر سے اس قدر تھک چکا تھا کہ کمرے سے نکل کر وائی ایم سی اے کی نیم تاریک راہداریوں میں پاجامے میں چہل قدمی کرنا بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ میں ساری رات کرسی پہ بیٹھا کھڑکی سے باہر سٹی ہال کیمرج کی عمارت اور اس سے ملحقہ چھوٹی چھوٹی دکانوں کی قطاروں کو گھورتا رہا۔

صبح میں نے ڈیوئی لائبریری^۹ میں اپنی ملازمت کی جگہ پر جا کر حاضری دی۔ لائبریری کی قلعہ نما خاکستری عمارت میموریل ڈرائیو^{۱۰} کے ساتھ ہی تھی۔ یہاں سے فراغت کے بعد میں نے اپنا بینک اکاؤنٹ کھلوایا، خط و کتابت کے لیے ڈاکخانے میں ایک بکس کرائے پہ حاصل کیا اور دول ور تھ اسٹور^{۱۱} سے ایک پلاسٹک کا بڑا پیالہ اور چیچ خریدا۔ اس اسٹور کے نام سے میری شناسائی لندن سے ہی تھی۔ اس کے بعد میں پیورٹی سپریم کے برآمدوں میں یہاں سے وہاں مٹر گشت کرتا اور اونس کو گرام میں تبدیل کر کے چیزوں کی قیمتوں کا لندن سے موازنہ کرتا رہا۔ آخر کار میں نے دودھ کا ایک چھوٹا ڈبہ اور دلیے کا ایک پیکٹ لیا۔ یہ امریکا میں میرا پہلا کھانا تھا جو میں نے اپنے کمرے میں میز پہ تنہا بیٹھ کر کھایا۔ اس وقت میں اس عاجزانہ کھانے کے علاوہ صرف ہم برگریاٹ ڈاگ ہی خرید سکتا تھا جو میسی چیوسٹ ایونیو کی کافی کی دکانوں میں دستیاب تھے لیکن میں نے دلیے اور دودھ کو ترجیح دی۔ ویسے اس وقت تک میں نے ابھی گوشت خوری شروع بھی نہیں کی تھی۔ امریکا میں میرے لیے سب کچھ نیا تھا۔ دودھ خریدنے کا سادہ سا کام بھی مجھے بالکل نیا لگتا تھا کیونکہ لندن میں ہر صبح گھر پہ ہمیں دودھ کی بوتلیں مل جایا کرتی تھیں۔

ایک ہفتے کے اندر اندر میں امریکا میں اپنی زندگی کو جیسے تیسے ایک خاص ڈھب پہ ڈھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں صبح و شام دودھ میں دلیہ ڈال کے پیٹ پوجا کر لیتا اور کبھی کھانے میں ذرا تنوع لانے کے لیے کیلے خرید لاتا اور چیچ سے ان کے چھوٹے چھوٹے قتلے کاٹ کر دلیے میں ڈال لیتا۔ چائے کے بندوبست میں میں کچھ ٹی بیگ اور ایک فلاسک خرید لایا۔ دول ور تھ اسٹور پہ جب میں فلاسک خریدنے پہنچا تو سیلزمین کی زبانی مجھے علم ہوا کہ یہاں فلاسک کو تھرما س کہا جاتا ہے اور فلاسک کا لفظ صرف وہسکی رکھنے والے جار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے اس وقت تک ابھی وہسکی کو بھی مونہ نہیں لگایا تھا۔ اب میرا معمول یہ تھا کہ میں صبح کام پر جاتے ہوئے کافی کی ایک دکان سے ایک کپ

چائے کی قیمت میں گرم گرم پانی اپنی فلاسک میں بھروالیتا اور دن بھر اس کی مدد سے چائے کے چار کپ بنا کر چسکیاں لیتا رہتا۔ میں نے ہاسٹل کے کمرے میں دودھ کا ایک کارٹن خرید کر کھڑکی کی سل پہ اس طرف رکھ لیا تھا جہاں دھوپ نہیں پڑتی تھی۔ دودھ کو خراب ہونے سے بچانے کی یہ حکمت عملی میں نے وائی ایم سی اے کے ہی ایک اور مکیں کی دیکھا دیکھی سیکھی تھی۔ شام کو وقت گزاری کے لیے میں نیچے مطالعے کے کمرے میں چلا جاتا اور بوسٹن گلوب پڑھتا رہتا۔ رنگ برنگے شیشوں کی کھڑکیوں والے اس وسیع و عریض کمرے میں شہ سرخیوں اور کالموں سے لے کر اشتہارات تک اخبار کے ہر حصے کو میں بڑی باریکی سے چھانتا تھا تاکہ امریکا کے طرز ہائے زندگی سے جلد از جلد پوری طرح واقف ہو سکوں۔ جب لفظوں کا پیچھا کرتے کرتے میرے آنکھیں تھک جاتیں تو میں سو جاتا۔ لیکن چین کی نیند ان دنوں مجھ سے گویا روٹھ گئی تھی۔ ہر رات مجھے کھڑکی کھلی رکھنی پڑتی تھی کیوں کہ اس گھٹن زدہ کمرے میں یہی تازہ ہوا کا واحد ذریعہ تھی لیکن مصیبت یہ تھی کہ کھڑکی کھلتے ہی تازہ ہوا کے ساتھ ٹریفک کا شور بھی کمرے میں در آتا تھا۔ میں اپنے پلنگ پہ دونوں کانوں میں انگلیاں ڈال کر اس اعصاب شکن شور سے بچ کے سونے کی کوشش کرتا لیکن جیسے ہی نیند کے جھونکوں سے میرے ہاتھ جھول کر کانوں سے ہٹتے میں شور سے ہڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ ساری رات نیند کے ساتھ میری یہ آنکھ مجبوری جاری رہتی تھی۔ کھلی کھڑکی سے کبوتروں کے چھوٹے چھوٹے بال و پر بھی ہوا میں تیرتے ہوئے کمرے میں بکھرتے رہتے تھے۔ ایک شام جب میں نے کارٹن میں سے دودھ کا پیکٹ نکال کر دلیے میں دودھ انڈیلا تو مجھے پتہ چلا کہ یہ خراب ہو چکا ہے۔

ان سب مشکلات کے باوجود میں نے تنہیہ کیا ہوا تھا کہ کم از کم چھ ہفتے، جب تک میری بیوی کا پاسپورٹ اور گرین کارڈ تیار نہیں ہو جاتے، میں وائی ایم سی اے میں ہی ٹکا رہوں گا۔ جب وہ یہاں پہنچ جاتی تو پھر مجھے رہنے کے لیے کوئی ڈھنگ کا اپارٹمنٹ کرائے پہ لینا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں اخبار کے کلاسیفائیڈ اشتہارات پہ وقتاً فوقتاً نظر دوڑاتا رہتا اور دن کھانے کے وقفے میں ایم آئی ٹی کے ہاؤسنگ آفس میں بھی چکر لگا آتا تاکہ کم قیمت پہ دستیاب کسی معقول رہائش کا پتہ لگا سکوں۔ اسی تلاش کے دوران ایک دن مجھے ایک گھر میں خالی کمرے کا پتہ چلا جو آٹھ ڈالر فی ہفتہ کے حساب سے دستیاب تھا۔ میں نے دیا ہوا فون نمبر اپنی گائیڈ بک میں لکھ لیا اور ایک پے فون سے نمبر ملا یا۔ فون میں سکہ ڈالتے ہوئے مجھے اس سکہ سے نامانوسیت سی محسوس ہو رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ امریکی سکے شیلنگ کے مقابلے میں سائز میں چھوٹے اور وزن میں ہلکے ہیں اور ہندوستانی پیسے کے مقابلے میں ذرا زیادہ بھاری اور چمکدار ہیں۔

"کون بول رہا ہے؟" فون پہ دوسری طرف کوئی خاتون تھی۔ اس کی تحکمانہ آواز ضرورت سے زیادہ بلند تھی۔

"جی! دوپہر بخیر میڈم! میں نے کمرہ کرائے پر لینے کے لیے کال کی ہے!"

"ہارورڈ یا ٹیک؟"

"معافی چاہتا ہوں میں سمجھا نہیں؟"

"کیا تم ہارورڈ سے ہو یا ٹیک سے؟"

تب مجھے یاد آیا کہ ٹیک سے مراد میسی چیوسٹ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی ہے۔ میں نے جواب دیا: "میں ڈیوی

لابیریری میں کام کرتا ہوں" پھر کچھ ہچکچاتے ہوئے اضافہ کیا: "ٹیک میں!"

"میں صرف ہارورڈ اور ٹیک کے لڑکوں کو کمرے کرائے پہ دیتی ہوں!"

"جی درست میڈم!"

مجھے ایک پتہ لکھوایا گیا اور شام کو سات بجے آنے کے لیے کہا گیا۔ میں مطلوبہ وقت سے آدھا گھنٹہ قبل جیب میں اپنی گائیڈ بک ڈالے سانسوں کو ماؤتھ واش سے معطر کیے دیے گئے پتے کی طرف روانہ ہو گیا۔ چلتے چلتے میں میسی چیوسٹ ایونیو کی متوازی ایک گلی میں مڑا جس پہ گھنے درختوں نے سایہ کیا ہوا تھا اور فٹ پاتھ کی درزوں سے خود رو گھاس کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اگرچہ موسم گرم تھا لیکن میں نے کوٹ اور ٹائی کا بالکل ایسے ہی اہتمام کیا تھا جیسے میں کہیں انٹرویو دینے جا رہا ہوں شاید اس لیے کہ کسی غیر ہندوستانی مالک مکان سے یہ میرا زندگی میں پہلا آمناسا منا تھا۔ مطلوبہ گھر کی عمارت ہلکے سفید رنگ کی اور اس کے کنارے گہرے بھورے رنگ کے تھے اور اس کے اطراف میں کڑی دار باڑ نصب تھی۔ لندن میں جس گلی میں میری رہائش تھی وہاں سب گھر ایک دوسرے سے متصل تھے اور ان پہ ایک ہی جیسے رنگ کا استر پھرا ہوا تھا لیکن یہاں یہ مکان باقی مکانوں سے جدا تھا۔ اس کی چھت پہ چوبی ٹائلیں نصب تھیں اور اس کے سامنے والی سمت اور دونوں اطراف میں آرائشی پودوں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ جب میں نے دروازے پہ لگی گھنٹی دبائی تو اندر سے فون والی عورت کی آواز اس زور سے بلند ہوئی کہ مجھے لگا جیسے وہ دروازے کے پیچھے ہی کھڑی ہے "ایک منٹ پلیز!"

ایک منٹ کی بجائے کافی دیر کے بعد ایک منحنی سی بے حد ضعیف عورت نے دروازہ کھولا۔ اس کے برف کی طرح سفید بال سر پہ یوں اکٹھے تھے جیسے اس نے سر پہ چھوٹا سا تھیلا اٹھا رکھا ہو۔ جب میں نے گھر کے اندر قدم رکھا تو وہ زینے کے ساتھ ایک چوبی بیچ پر بیٹھ گئی۔ یہ زینہ تنگ سا تھا اور اس پہ قالین بچھی ہوئی تھی۔ بیچ پہ جہاں وہ بیٹھی تھی سفید روشنی کا ایک ہالہ سا بن گیا تھا اور اس ہالے میں سے وہ مجھے مسلسل غور سے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ایک لمبی چوڑی سیاہ رنگ کی اسکرٹ پہن رکھی تھی جو کسی تنے ہوئے خیمے کی طرح فرش تک پھیلی ہوئی تھی اور اس پہ سفید رنگ کی کلف لگی شرٹ زیب تن کر رکھی تھی جس کے گلے اور کف پہ سلوٹیں پڑ چکی تھیں۔ گود میں

رکھے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پہ پیلاہٹ نمایاں تھی اور ان کے جوڑ سوچے ہوئے تھے۔ اس کے ناخن سخت کھر درے اور پیلے تھے۔ عمر رواں نے اس کے چہرے کے نسوانی نقش و نگاریوں مٹا دیے تھے کہ اب وہ کسی مرد کا ہی چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں ایک تیز چمک سی تھی اور اس کی ناک کے دونوں طرف جھریاں بہت نمایاں تھیں۔ اس کے معدوم ہوتے بے رنگ ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور بھنوں کا تو خیر نام و نشان بھی نہ تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود اس کے چہرے سے تند خوئی ہویدا تھی۔

"کنڈی چٹھا دو!" اس نے مجھے زور سے حکم دیا۔ میں اگرچہ اس سے چند فٹ کے فاصلے پہ ہی کھڑا تھا لیکن اس کی آواز بہت بلند تھی یوں جیسے میں بہت دور کھڑا ہوں اور وہ مجھے کچھ کہہ رہی ہو۔ "زنجیر چڑھا کر دروازے کی ہتھی پہ اس بٹن کو زور سے دبا دو! گھر میں داخل ہوتے ہی تمہیں ہر روز پہلا کام یہ کرنا ہوگا، سمجھ گئے؟"

میں نے دروازے کو اس کی ہدایت کے مطابق لاک کر دیا اور گھر کا جائزہ لینے لگا۔ بچ کے پاس ہی، جس پر وہ خاتون بر اجمان تھی، ایک چھوٹا سا گول میز تھا جس کی ٹانگیں اس عورت کی ٹانگوں ہی کی طرح ایک جہاں والے کپڑے میں ملفوف تھیں۔ میز پر ایک لیمپ، ایک ریڈیو، نقرئی بینڈل والا ایک چرمی بٹو اور ایک ٹیلی فون سیٹ دھرا تھا۔ میز کے سہارے ایک موٹی سی لکڑی کی لاٹھی بھی فرش پہ ٹکی تھی اور اس پہ میل کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میرے دائیں طرف مہمان خانہ تھا جس کی دیواروں کے ساتھ ایک دوسرے سے متصل کتابوں کی الماریاں کھڑی تھیں اور کمرے میں پرانی طرز کا خستہ حال فرنیچر بھرا ہوا تھا۔ مہمان خانے کے ایک کونے میں ایک بڑا بیانو بند پڑا تھا اور اس کے اوپر کاغذوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ بیانو کے سامنے بیٹھنے والا بیٹج غائب تھا۔ شاید یہ خاتون اسی بچہ بیٹھی ہوئی تھی۔ گھر کے کسی کونے سے گھڑیاں نے سات دفعہ ٹن ٹن کی آواز سے سات بجنے کا اعلان کیا تو وہ بولی:

"تم وقت کے پابند دکھائی دیتے ہو۔ امید ہے کہ کرایہ بھی اسی پابندی کے ساتھ ادا کرو گے!"

"میرے پاس ایک لیٹر ہے میڈم!" میرے کوٹ کی جیب میں میری ایم آئی ٹی کی ملازمت کا ایک تصدیقی خط تھا جو میں حفظ ماتقدم کے طور پر ساتھ لے آیا تھا کہ مبادا مجھے ایم آئی ٹی سے اپنا تعلق ثابت کرنا پڑ جائے تو کام آئے۔

اس نے غور سے خط کو دیکھا پھر بڑی احتیاط سے مجھے واپس کر دیا۔ خط واپس کرتے ہوئے اس کی انگلیوں کی گرفت کاغذ پہ ایسے مضبوط تھی جیسے اس نے کاغذ کی بجائے کھانے سے بھری ہوئی کوئی پلیٹ اٹھا رکھی ہو۔ اس نے عینک نہیں لگا رکھی تھی اور مجھے یقین نہیں تھا کہ اس نے اس خط کا ایک لفظ بھی پڑھا ہوگا۔

"تم سے پہلے جو کرائے دار لڑکا تھا وہ کرایہ دینے میں ہمیشہ دیر کر دیتا تھا۔ ابھی بھی میرے آٹھ ڈالر اس کی طرف باقی ہیں۔ اب ہارورڈ کے لڑکے بھی ویسے نہیں رہے جیسے کبھی ہوا کرتے تھے۔ میں تو صرف ہارورڈ اور ٹیک والوں کو ہی

اس گھر میں رکھتی ہوں۔ ٹیک کے کیا حالات ہیں لڑکے؟

"بہت اچھے ہیں!"

"تم نے دروازے پہ لاک کی تسلی کر لی؟"

"جی میڈم!"

اس نے بچہ اپنے ساتھ خالی جگہ کو ہاتھ سے تھپتھپا کر مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ ایک لمحے تک وہ خاموش رہی پھر جیسے ناک میں گنگناتے ہوئے بولی: "امریکی پرچم چاند پہ پہنچ چکا ہے!" اس کا انداز ایسا تھا جیسے یہ راز صرف وہی جانتی ہو۔

"جی میڈم!"

اس وقت تک میں نے امریکا کے چاند پر قدم رکھنے کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں سوچا تھا اگرچہ اس پہ اخبارات میں روزانہ کالم در کالم صفحات سیاہ کیے جا رہے تھے۔ میں نے پڑھا تھا کہ خلا نورد چاند میں موجود تصوراتی سمندر کے کنارے پہ اترے تھے۔ انسانی تہذیب کے ارتقائی سفر میں یہ طویل ترین فاصلہ تھا جو انسان نے پہلی دفعہ طے کیا تھا۔ خلا نورد کچھ گھنٹے چاند کی سطح کو کھوجتے رہے تھے، انہوں نے کچھ پتھر کنکر اپنی جیبوں میں بھرے تھے، اپنے ارد گرد کے ماحول کی تصویر کشی کی تھی، فون پہ صدر سے ہم کلام ہوئے تھے اور چاند کی سطح پہ انہوں نے ایک امریکی پرچم گاڑ کر تاریخ رقم کی تھی۔ ایک خلا نورد کے الفاظ میں چاند ایک شاندار ویرانہ ہے۔ اس سفر کو نسل انسانی کی اب تک کی سب سے بڑی کامیابی گردانا جا رہا تھا۔ میں نے بوسٹن گلوب میں پورے پورے صفحوں پہ چھپی خلا نوردوں کی وہ تصویریں دیکھی تھیں جن میں انہوں نے پھولے ہوئے خلائی لباس پہن رکھے تھے۔ میں نے اخبار میں وہ سلسلہ بھی پڑھا تھا جس میں بوسٹن کے کچھ لوگوں نے اتوار کی اس شام کی اپنی مصروفیات بتائی تھیں جب خلا نورد چاند کی سطح پر پہلی دفعہ قدم رکھ رہے تھے۔ ایک آدمی نے بتایا تھا کہ وہ اس سے پہلے گارڈن کے تالاب میں کشتی رانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور اس نے اپنا ریڈیو کان سے لگا رکھا تھا، ایک عورت نے بتایا کہ وہ اس وقت اپنے پوتوں پوتیوں کے لیے رول پکار رہی تھی۔

خاتون میرے جواب سے مطمئن نہ ہو کر زور سے دھاڑی: "چاند پہ ایک پرچم کا نصب ہونا، لڑکے! میں نے ریڈیو پہ یہ خبر سنی ہے۔ کیا یہ شاندار کامیابی نہیں ہے؟"

"جی، میڈم!"

لیکن وہ اب بھی مطمئن نہ تھی چنانچہ مجھے جیسے حکم دیتے ہوئے بولی: "زور سے کہو، شاندار!"

میں اس کی اس فرمائش سے کچھ بوکھلا گیا اور مجھے اپنی ہتک کا بھی احساس ہوا۔ اس کے اندازِ تکلم نے مجھے میرا بچپن یاد

دلادیا جب میں تولی گنج کے ایک کمرے پہ مشتمل اسکول میں فرش پہ آلتی پالتی مارے، جوتوں اور پنسلوں سے بے نیاز، اپنے استاد کے پیچھے پیچھے پہاڑے دہرایا کرتا تھا۔ اس نے مجھے میری شادی کا دن بھی یاد دلادیا جب میں پنڈت کی اقتدا میں سنسکرت کے وہ بے انت اشلوک دہراتا چلا گیا تھا جن کے مطلب کا مجھے کچھ علم نہ تھا اور جنہوں نے مجھے میری بیوی سے ہمیشہ کے لیے جوڑ دیا تھا۔ بہر حال میں کچھ بھی نہیں بولا۔

"کہو، شاندار!" وہ خاتون دوبارہ دھاڑ کر بولی۔

"شاندار!" میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ پھر ذرا زور دے کر دوبارہ یہی لفظ دہرایا تاکہ وہ سن سکے۔ میں فطرتاً نرم گفتار ہوں اس لیے ایک ایسی بوڑھی عورت کے سامنے اونچی آواز میں بولنے سے ہچکچا رہا تھا جس سے ملے ہوئے مجھے چند لمحے ہی گزرے ہوں لیکن اس خاتون نے میرے زور سے بولنے کا برا نہیں منایا بلکہ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے شاندار بولنے سے خوش ہوئی ہے کیونکہ اس کا اگلا حکم حوصلہ افزا تھا۔

"جاؤ، اپنا کمرہ دیکھ لو!"

میں بیچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس تنگ سے زینے سے اوپری منزل پہ پہنچا جہاں ایک اتنے ہی تنگ سے برآمدے میں پانچ دروازے کھل رہے تھے۔ آمنے سامنے دو دروازے تھے اور برآمدے کے آخری سرے پر ایک دروازہ تھا۔ ان پانچوں دروازوں میں سے ایک نیم وا تھا۔ اس کمرے میں ایک چھوٹا پلنگ، بھورے رنگ کا ایک بیضوی غالیچہ، ایک درازوں والی چھوٹی الماری اور ایک واش بیسن موجود تھا جس کا پانی والا پائپ سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے کی چھت ترچھی تھی اور داخلی دروازے کے علاوہ دو اور دروازے تھے۔ ایک دروازہ، جس پہ سفید رنگ کیا گیا تھا، ٹائلٹ میں کھلتا تھا جہاں ایک ٹب بھی پڑا تھا اور دوسرا دروازہ کپڑوں جوتوں کی بڑی الماری میں کھلتا تھا۔ کمرے کی دیواریں سرمئی اور ہلکے سفید رنگ کے دھاری دار وال پیپر سے مزین تھیں۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس پہ پڑا جالی دار پردہ نرم روہو اسے لرز رہا تھا۔ میں نے پردہ ہٹا کر باہر نگاہ دوڑائی۔ کھڑکی چھوٹے سے عقبی صحن میں کھلتی تھی جہاں کچھ پھل دار درخت اور کپڑے لٹکانے والی خالی تار دکھائی دے رہی تھی۔ میں مطمئن ہو گیا۔ سیڑھیوں کے نیچے سے اس خاتون کی آواز سنائی دی: "کیا فیصلہ ہے تمہارا؟ کمرہ پسند آیا؟"

جب میں نے نیچے اتر کر اسے اپنی آمادگی سے آگاہ کیا تو وہ اپنا چرمی بٹوا کھول کر اس میں سے کچھ تلاش کرنے لگی۔ آخر بٹوے میں سے ایک پتلی سی تار والے چھلے سے جڑی چابی برآمد کر کے اس نے میرے حوالے کی اور مجھے بتایا کہ باورچی خانہ گھر کے عقبی حصے میں ہے جس تک جانے کے لیے مہمان خانے سے گزرنا پڑتا ہے۔ مجھے باورچی خانے کا چولہا استعمال کرنے کی اجازت تھی لیکن اس کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھنا میری ذمہ داری تھی۔ بستر کی چادریں اور

تولیے دستیاب تھے لیکن ان کو دھونے کی ذمہ داری بھی میری اپنی تھی۔ کراہیہ ہر جمعے کی صبح کو واجب الادا تھا جو مجھے پیانو کے اوپر بنی شیلف پہ رکھ دینا تھا۔ اور بڑھیا کی آخری تنبیہ بہت اہم تھی: "کسی خاتون ملاقاتی کو لانے کی اجازت نہیں ہے!"

"میں شادی شدہ آدمی ہوں، میڈم!" یہ پہلی دفعہ تھا جب میں نے امریکا میں کسی کے سامنے اس خبر کا اعلان کیا تھا۔ لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی اور دوبارہ زور دے کر بولی: "کوئی خاتون مہمان یہاں نہیں آئے گی!" اس نے اپنا تعارف مسز کرافٹ کے نام سے کروایا۔

میری شادی جس لڑکی سے ہوئی اس کا نام مالا تھا۔ یہ رشتہ میرے بڑے بھائی اور بھابھی نے کروایا تھا۔ میں نے شادی کی اس پیشکش پہ نہ تو کوئی اعتراض کیا تھا اور نہ ہی کسی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہر مرد کی طرح یہ وہ فریضہ تھا جس کو بہ احسن و خوبی ادا کرنے کی توقع مجھ سے کی جا رہی تھی۔ مالا پہلے گھاٹا کے ایک اسکول ٹیچر کی بیٹی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ کھانا پکانے اور سلائی کڑھائی کے علاوہ مناظرِ فطرت کی سینٹلز بھی بنا سکتی تھی اور ٹیگور کی نظمیں بھی گنگنا سکتی تھی۔ لیکن اس کے ان سب گنوں کو اس کی رنگت نے گہنا رکھا تھا جو کچھ صاف نہیں تھی۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے بہت سے مردوں نے اس کے منہ پر اسے شادی کے لیے مسترد کر دیا تھا۔ اس کی عمر ستائیس سال کو پہنچ چکی تھی اس لیے اس کے والدین کو یہ خوف ستانے لگا تھا کہ کہیں وہ ہمیشہ کے لیے کنواری نہ رہ جائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو خود سے ہزاروں میل دور میرے ساتھ دیارِ غیر بھیجنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

شادی کے بعد پہلی پانچ راتوں تک ایک ہی بستر ہم دونوں کی آرام گاہ تھا۔ ہر رات سونے سے پہلے مالا اپنی جلد پہ کوئلہ کریم لگانے کے بعد اپنے بالوں کی چوٹی کو سیاہ رنگ کے ریشمی پراندے سے باندھ دیتی اور لیٹ کر مونہ دوسری طرف پھیرے رونا شروع کر دیتی۔ اسے اپنے ماں باپ بہت یاد آتے تھے۔ اگرچہ میں چند دنوں میں امریکا روانہ ہونے والا تھا لیکن ریت رواج کے مطابق مالا کو چھ ہفتوں تک سسرال یعنی میرے بھائی کے گھر رہ کر گھر کے کام کاج، صفائی ستھرائی، کھانے پکانے اور مہمانوں کو چائے مٹھائی پیش کرنے کے فریضے نبھانے تھے۔ میں مالا کو جی بھر کے رونے دیتا اور اسے دلاسا دینے کی بالکل کوشش نہ کرتا۔ بستر پہ اپنی طرف لیٹا میں ٹارچ کی روشنی میں گائیڈ بک پڑھتا رہتا اور آنے والے سفر کے بارے میں سوچتا رہتا۔ کبھی کبھی میں دیوار کی دوسری طرف اپنی مرحومہ ماں کے چھوٹے سے کمرے کے بارے میں سوچنے لگ جاتا۔ اب یہ کمرہ خالی پڑا تھا اور لکڑی کی وہ کھاٹ جس پہ کبھی میری ماں سوتی تھی اب اس پہ صندوق اور پرانے بستروں کا انبار لدا ہوا تھا۔ لگ بھگ چھ سال پہلے، لندن جانے سے قبل، میں نے اپنی ماں کو اسی کھاٹ پہ آخری سانسیں لیتے دیکھا تھا۔ زندگی کے آخری دنوں میں وہ اسی کھاٹ پہ اپنے دل

موٹر میں لت پت پڑی رہتی تھی۔ اس کی ار تھی اٹھنے سے قبل میں نے اس کے ناخنوں میں پھنسے گند کو بالوں میں لگانے والی ایک پن کی مدد سے صاف کیا تھا اور میرا بھائی چونکہ یہ برداشت نہ کر پا رہا تھا اس لیے بڑے بیٹے کا کردار ادا کرتے ہوئے ماں کی چتا کو اگنی بھی میں نے ہی دکھائی تھی تاکہ اس کی غموں سے کلپتی آتما کو سورگ میں جا کر شانتی مل سکے۔

اگلی صبح میں مسز کرافٹ کے گھر اپنے کرائے کے کمرے میں منتقل ہو گیا۔ جب میں دروازے کو لاک کر چکا تو میں نے دیکھا کہ وہ کل کی طرح اسی پیانو والے بچہ بیٹھی تھی۔ اس نے وہی سیاہ اسکرٹ اور کلف لگی سفید شرٹ پہن رکھی تھی اور اس نے بالکل اسی انداز میں ہاتھ باندھ کر گود میں رکھے ہوئے تھے۔ سب کچھ کل کی طرح تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ ساری رات اسی بچہ ایسے ہی تو نہیں بیٹھی رہی۔ میں نے اپنا سوٹ کیس اپنے کمرے میں جا کر رکھا، اپنی فلاسک کو باورچی خانے میں جا کر کھولتے پانی سے لبالب بھرا اور دفتر کے لیے نکل گیا۔ اس شام جب میں یونیورسٹی سے گھر واپس لوٹا تو وہ تب بھی اسی جگہ اسی انداز سے بیٹھی تھی۔

"یہاں بیٹھو، لڑکے!" اس نے اپنے ساتھ بچہ جگہ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ میں اس کے ساتھ بچہ اٹک گیا۔ میرے پاس سامان کا تھیلا تھا جس میں دودھ کے ڈبے، دلیے کے پیکٹ اور کچھ کیلے تھے جو میں دفتر سے واپسی پہ خرید لایا تھا کیونکہ صبح باورچی خانے کے معائنے میں میں نے دیکھ لیا تھا کہ کھانا پکانے کے لیے برتن موجود نہیں ہیں۔ اس ضمن میں باورچی خانے کی کل کائنات دو دیگچیاں اور ایک پیتل کی کیتلی تھی۔ دونوں دیگچیاں ریفریجریٹر میں رکھی تھیں اور ان کے اندر نارنجی رنگ کا سوپ موجود تھا جبکہ کیتلی چولہے پہ دھری تھی۔

"شام بخیر، میڈم!"

اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے لاک کی تسلی کر لی ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ایک لمحے کے لیے وہ خاموش رہی پھر اچانک اس نے پچھلی شام کی طرح حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ گویا اعلان کیا: "امریکی پرچم چاند پہ پہنچ چکا ہے، لڑکے!"

"جی، میڈم۔"

"چاند پہ پرچم کا پہنچنا! کیا یہ بہت شاندار خبر نہیں؟"

میں نے سر ہلایا۔ "جی، میڈم۔" اس کے بعد اس نے جو کہنا تھا اس کا خیال کر کے میں دل ہی دل میں خوفزدہ ہو رہا تھا۔

"کہو، شاندار!"

میں نے ذرا توقف کیا اور گھر میں دائیں بائیں نظر دوڑائی کہ کہیں کوئی مجھے سن نہ لے اگرچہ میں اچھی طرح جانتا تھا گھر میں ہم دو کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ اس لمحے میں نے خود کو بالکل گھامڑ محسوس کیا۔ لیکن خیر بڑھیا کا مطالبہ کچھ اتنی بڑی بات نہ تھی جو میں کرنے سکتا اس لیے میں زور سے چلایا: "شاندار!"

کچھ دنوں میں ہی یہ ہمارا معمول بن گیا۔ صبح جب میں لائبریری کے لیے نکل رہا ہوتا تو مسز کرافٹ یا تو اپنی خواب گاہ میں ہوتی یا پھر بیچ پہ بیٹھی میری موجودگی سے بے نیاز ریڈیو پہ خبریں یا کلاسیکی موسیقی سن رہی ہوتی۔ لیکن ہر شام جب میں لوٹتا تو سوال جواب کا پرانا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ وہ بیچ کو تھپتھپا کر مجھے ساتھ بیٹھنے کو کہتی، پھر اعلان کرتی کہ امریکی پرچم چاند پہ پہنچ چکا ہے اور پھر اس خبر کو شاندار قرار دیتی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے دھرتا کہ یہ بات بہت شاندار ہے اور پھر ہم دونوں خاموش بیٹھ جاتے۔ اس وقت مجھے اک عجب سی بے چینی گھیر لیتی اور یوں لگتا جیسے یہ خاموشی کبھی نہیں ٹوٹے گی لیکن مسز کرافٹ سے میری یہ روزانہ کی ملاقات محض دس منٹ پہ محیط ہوتی تھی کیونکہ وہ امریکی پرچم کے چاند پہ ہونے کو شاندار قرار دلوانے کے بعد جلد ہی نیند کے جھکولے کھانے لگتی اور اس کا سر سینے کی طرف جھکتا چلا جاتا۔ میرے لیے یہ اس آزادی کا اشارہ ہوتا کہ میں اپنے کمرے میں جا سکتا ہوں۔ اس وقت تک چاند پہ کوئی امریکی پرچم نہ تھا کیونکہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ خلا نوردوں نے چاند سے واپس زمین کی طرف سفر شروع کرنے سے پہلے پرچم اتار لیا تھا۔ لیکن مسز کرافٹ کو یہ بتانے کا حوصلہ میرے اندر موجود نہیں تھا۔

جمعے کی صبح کو جب میرے پہلے ہفتے کا کرایہ واجب الادا ہوا تو میں مہمان خانے میں پیانو کے اوپر بنے شیلف پہ کرایہ رکھنے گیا۔ پیانو کی کلیدیں بدرنگ اور خستہ حال تھیں۔ میں نے ایک کلید کو دبایا لیکن پیانو سے کوئی سربرآمد نہ ہوا۔ میں ایک لفافے میں مسز کرافٹ کا نام لکھ کر اس میں آٹھ ڈالر کے نوٹ رکھ کر لایا تھا لیکن اب پیانو کے اوپر بنے شیلف پہ ان کو یوں لاوارث رکھنا مجھے کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے مسز کرافٹ کے تنبو نما اسکرٹ کا ہیولا نظر آرہا تھا۔ وہ حسب معمول بیچ پہ براجمان ریڈیو سے خبریں سن رہی تھی۔ اسے وہاں سے پیانو تک بلانا غیر ضروری اور ناموزوں لگ رہا تھا۔ میں نے اسے کبھی چلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور گول میز سے ٹکی لاٹھی کو دیکھ کر میرا اندازہ تھا کہ اس کے لیے چلنا ایک مشکل کام ہو گا۔ اس لیے میں کرایہ لیے اس کے پاس بیچ تک پہنچا تو اس نے مجھے غور سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے زور سے پوچھا: "کیا کام ہے؟"

"کرایہ، میڈم۔"

"پیانو کے اوپر بنے شیلف پہ رکھ دو!"

"میں یہاں لایا ہوں۔" میں نے لفافہ اس کی طرف بڑھایا لیکن اس کے گود میں رکھے بند ہاتھوں کی انگلیوں میں کوئی

حرکت نہ ہوئی۔ میں نے تھوڑا آگے جھک کر لفافہ اس کے ہاتھوں کے اتنے نزدیک کر دیا کہ وہ آسانی سے پکڑ سکے۔ ایک لمحے کے بعد اس نے لفافہ لے کر سر ہلا دیا۔

اس شام جب میں گھر لوٹا تو اس نے بیچ کو تھپتھپا کر مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا لیکن میں حسب عادت اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے لاک کے بارے میں تسلی لی لیکن چاند پہ امریکی پرچم کا کوئی ذکر نہیں چھیڑا بلکہ اس کی بجائے وہ بولی:

"تم نے بہت مہربانی کی!"

"معاف کیجیے گا میں آپ کی بات سمجھا نہیں، میڈم؟"

"بہت مہربانی!"

اس نے میرا دیا ہوا لفافہ ابھی تک ہاتھوں میں دبا رکھا تھا!

اتوار کے روز میرے کمرے کے دروازے پہ کسی نے دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی جس نے اپنا تعارف مسز کرافٹ کی بیٹی کے طور پر کروایا۔ اس کا نام ہیلن تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی چاروں دیواروں پہ یوں ایک ایک کر کے تنقیدی نگاہ ڈالی جیسے ان میں کسی بدلاؤ کے نشان ڈھونڈ رہی ہو، پھر اس نے الماری میں ٹنگی میری شرٹوں، دروازے کی ہتھی پہ لٹکی میری ٹائیوں، درازوں والی میز پہ رکھے دیے کے ڈبے اور واش بیسن میں پڑے ان دھلے پیالے اور چمچ پہ ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی۔ اس کا قد چھوٹا اور کمر کا گھیراؤ بڑا تھا، سر کے چاندی جیسے بال ترشے ہوئے اور ہونٹوں پہ شوخ گلابی لپ اسٹک سچی تھی۔ اس نے گرمیوں کا بن آستینوں والا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے گلے میں پلاسٹک کے موتیوں کی مالا تھی اور زنجیر سے لٹکا چشمہ چھاتی سے نیچے کسی جھولے کی طرح لٹک رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں کے پچھلے حصے میں نیلی نیلی رگوں کا ایک جال سا بنا ہوا تھا اور بازوؤں کے اوپری حصوں سے جلد یوں لٹکی ہوئی تھی جیسی کسی بھونے ہوئے بینگن کا گودا ہو! اس نے مجھے بتایا کہ وہ آر لنگٹن میں رہتی ہے جو یہاں سے کچھ فاصلے پہ میسی چیسوٹ ایونیو پہ واقع ہے۔ "میں ہفتے میں ایک آدھ چکر لگا کر اماں کو کھانے پینے کا سامان دے جاتی ہوں۔ اماں نے اب تک تمہیں بھگایا نہیں؟"

"سب ٹھیک جا رہا ہے، میڈم!"

"کچھ لڑکے تو فوراً بھاگ جاتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے تم اماں کو اچھے لگے ہو۔ تم وہ پہلے کرائے دار ہو جس کے لیے

اماں نے شریف آدمی کا لفظ استعمال کیا ہے۔"

"نہیں، میڈم!" میں نے لجاتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور اس کا دھیان میرے ننگے پاؤں کی طرف گیا۔ گھر کے اندر جوتے پہننا مجھے اب بھی عجیب لگتا تھا اس لیے میں کمرے میں داخل ہونے سے پہلے جوتے اتار دیتا تھا۔

"کیا تم بو سٹن میں نئے ہو؟"

"میں امریکا میں نیا ہوں، میڈم!"

"کہاں سے ہو؟" اس نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

"کلکتہ، انڈیا سے۔"

"یہاں سب ٹھیک چل رہا ہے؟ ہمارے پاس برازیل کا ایک لڑکا بھی لگ بھگ ایک سال قبل رہنے آیا تھا۔ کیمبرج صحیح معنوں میں ایک بین الاقوامی شہر ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ دل ہی دل میں میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ گفتگو اب اور کتنی طویل ہوگی کہ اسی لمحے ہمیں مسز کرافٹ کی چیختی ہوئی آواز سیڑھیوں پہ گونجتی سنائی دی۔ ہم برآمدے میں نکلے تو ہمیں دوبارہ اس کے چلانے کی آواز سنائی دی:

"فوراً نیچے آ جاؤ!"

"ہوا کیا ہے؟" ہیلن نے بھی اسی طرح چلا کر پوچھا۔

"جلدی آؤ!"

ہیلن نے یہ حکم سن کر ٹھنڈی سانس بھری۔ میں نے جلدی سے جوتے پہنے اور ہم سیڑھیوں کی سمت چل دیے۔ سیڑھیاں اتنی تنگ تھیں کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ نیچے نہیں اتر سکتے تھے اس لیے میں ہیلن کے پیچھے پیچھے تھا۔ اسے نیچے اترنے کی کوئی خاص جلدی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتے ہوئے پہلے اس نے مجھ سے اپنے گھٹنوں کے درمیان ذکر کیا پھر چلا کر بولی:

"کیا آپ بغیر لاٹھی کے چلتی رہی ہو اماں؟ آپ کو پتہ بھی ہے کہ بغیر لاٹھی کے چلنا آپ کو منع ہے!" وہ سیڑھیوں کے

جنگلے پہ سہارا لے کے ایک لمحے کے لیے رکی اور پیچھے مڑ کر مجھ سے کہنے لگی: "اماں کبھی کبھی پھسل کے گر جاتی ہیں!"

یہ سن کر پہلی دفعہ مجھے لگا کہ مسز کرافٹ کی ذات کو بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اب تک اس کی جو شبیہ میرے دماغ میں بنی تھی اس کے مطابق وہ ہر طرح کے رنج و محن سے مبرا تھی۔ میں نے چشم تصور سے دیکھا کہ وہ بچ کے پاس فرش پہ چاروں خانے چت گری پڑی ہے، اس کے دونوں پاؤں مخالف سمت مڑے ہوئے ہیں اور وہ چھت کو گھور رہی ہے لیکن جب ہم سیڑھیوں سے نیچے اترے تو ہم نے دیکھا کہ وہ بچہ اپنی مخصوص جگہ پہ ہاتھ گود میں

باندھے بیٹھی تھی اور اس کے پاؤں میں سامان کے دو تھیلے پڑے تھے۔ جب ہم اس کے پاس جا کر کھڑے ہوئے تو اس نے بچ کو تھپتھا کر بیٹھنے کو نہیں کہا۔ وہ گھور کر ہمیں دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا ماں؟"

"یہ بالکل مناسب نہیں ہے!"

"کیا مناسب نہیں ہے؟"

"یہ بالکل مناسب نہیں ہے کہ ایک مرد اور عورت جو آپس میں شادی شدہ نہ ہوں خلوت میں کسی تیسرے فرد کی موجودگی کے بغیر ہم کلام ہوں!"

"بس کرو ماں! میں اڑسٹھ سال کی ہوں۔ اس لڑکے کی ماں جتنی ہوں!" ہیلن نے جواب دیا۔

لیکن مسز کرافٹ کا اصرار تھا کہ ہیلن اور میں اس کے سامنے مہمان خانے میں بیٹھ کر گفتگو کریں۔ اس نے ہیلن کو یہ تنبیہ بھی کی کہ اپنے مقام و مرتبے کا خیال کیے بغیر یوں اپنی عمر کا افشا کرنا اور ٹخنوں سے اتنا اونچا لباس پہننا بھی کسی طرح مناسب نہیں۔

"ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے ماں کہ یہ انیس سو انہتر ہے۔ آپ تو اگر کسی دن گھر سے باہر نکلو اور کسی لڑکی کو منی اسکرٹ پہنے دیکھ لو تو نہ جانے کیا کرو گی!"

"میں اسے گرفتار کروادوں گی۔" مسز کرافٹ نے زور سے ہنکارا بھرا۔

ہیلن نے یہ سن کر نفی میں سر ہلایا اور مسز کرافٹ کے پاس پڑا ایک تھیلا اٹھا کر چل دی۔ میں نے دوسرا تھیلا اٹھالیا اور اس کے پیچھے چلتا ہوا مہمان خانے سے ہوتا باورچی خانے میں آ پہنچا۔ دونوں تھیلے سوپ کے ڈبوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہیلن نے ایک ایک کر کے یہ ڈبے چابی کی مدد سے کھولے، ریفریجریٹر میں رکھی دونوں دیگیچیاں باہر نکالیں اور ان میں موجود پرانے سوپ کو سنک میں بہا کر دیگیچیاں دھو ڈالیں۔ پھر ڈبوں میں سے نیا سوپ دیگیچیوں میں بھر کر انہیں دوبارہ فریج میں رکھ دیا۔

"کچھ سال پہلے تک ماں سوپ کے یہ ڈبے خود کھول لیا کرتی تھی۔" ہیلن بولی۔ "اب انہیں بہت برا لگتا ہے کہ ان کے لیے یہ کام بھی میں کرتی ہوں۔ لیکن پیانو نے ان کی انگلیوں کو ناکارہ کر دیا ہے۔" اس نے چشمہ لگا کر الماریوں کو دیکھا اور میرے ٹی بیگز پر نظر پڑتے ہی بولی: "چائے بنائیں؟"

میں نے کیتلی میں پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دی۔ "میں سمجھا نہیں، میڈم۔ پیانو نے کیسے؟"

"ماں پیانو سکھایا کرتی تھی۔ ہمارے والد کے مرنے کے بعد انہوں نے چالیس سال تک ہمیں اسی پیانو سے روزی کما

کما کر بڑا کیا۔" ہیلن نے کمر پہ ہاتھ رکھ کر ریفریجٹر کے کھلے دروازے سے اندر کا معائنہ کیا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اندر والے خانے سے مکھن کی کاغذ میں لپٹی ایک ٹکلیا نکالی، ایک لمحے کے لیے تیوری پہ بل ڈال کے اسے گھورا پھر کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دی۔ "بس یہ آخری تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے سوپ کے ان کھلے ڈبے الماری میں جوڑ دیے۔ میں میز پہ بیٹھ گیا اور ہیلن کو کام کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اس نے گندے برتن دھوئے، کوڑے کے تھیلے کا منہ بند کیا، سنک پہ رکھے اسپانڈر پلانٹ کو پانی دیا اور دو پیالیوں میں کھولتا ہوا پانی انڈیل کر ان میں ٹی بیگ ڈال دیے۔ بغیر دودھ ملی چائے کی ایک پیالی اس نے مجھے پکڑائی اور خود بھی میز پہ آکے بیٹھ گئی۔

"معاف کیجیے گا لیکن کیا یہ کافی ہے؟"

ہیلن نے چائے کی ایک چسکی لی، اس کی گلابی لپ اسٹک کا نشان پیالی کے اندرونی کنارے پہ ثبت ہو گیا۔ "کیا کافی ہے؟"

"سوپ جو آپ نے فریج میں رکھا ہے۔ کیا یہ کھانا مسز کرافٹ کے لیے کافی ہے؟"

"وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کھاتیں۔ ٹھوس غذائیں انہوں نے اسی وقت بند کر دی تھی جب ان کی عمر سو سال کو پہنچی تھی۔ اب دیکھ لو اس کو بھی تین سال گزر چکے ہیں۔"

یہ سن کر میں بھونچا رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ مسز کرافٹ کہیں اسی کے پیٹے میں ہوں گی یا زیادہ سے زیادہ نوے سال کی رہی ہوں گی۔ زندگی میں آج تک میں کسی ایسے فرد سے نہیں ملا تھا جس نے ایک صدی سے زائد عمر پائی ہو۔ یہ جان کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا کہ بیوہ مسز کرافٹ نے اتنی طویل عمر تنہا گزاری تھی۔ اکیلے پن کے اس کیفیت سے میں اچھی طرح واقف تھا کیونکہ میری ماں کو بیوگی کے روگ نے ہی دیوانہ بنا کر چھوڑا تھا۔ میرے والد کلکتہ کے بڑے ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ انہوں نے جب دماغی سوزش کے مرض میں دنیا سے منہ موڑا تو میری عمر سولہ سال تھی۔ میری ماں نے اس سانحے کا ایسا اثر لیا کہ ان کا ہوش جاتا رہا اور انہوں نے اپنے شوہر کے بغیر زندگی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میری، میرے بھائی اور رشتہ داروں کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ غم کے تاریک جنگل میں گم ہوتی چلی گئیں۔ ہم ان کو رس بہاری روڈ کے لائق فائق دماغی معالجین کے پاس بھی لے کے جاتے رہے لیکن ان کی دیوانگی فرزانگی میں نہ بدل سکی۔ وہ اپنے گرد و پیش سے بے نیاز ہو چکی تھیں چنانچہ جب وہ کھانا کھانے کے بعد زور سے ڈکار مارتیں یا لوگوں کی موجودگی میں بغیر کوئی شرمندگی محسوس کیے ریح خارج کر دیتیں تو مجھے ان پہ شدید ترس آتا اور میرا دل دکھ سے بھر جاتا۔ میرے بڑے بھائی نے والد صاحب کی وفات کے بعد پڑھائی ترک کر کے پٹ سن کی ایک مل میں کام شروع کر دیا تھا تا کہ گھر کا چولہا جلتا رہے اس لیے ماں کی دیکھ بھال میری ذمہ داری تھی۔ میں ان کی

پابنتی پہ بیٹھ کہ اپنے امتحان کی تیاری کیا کرتا اور وہ سارا دن بازو پہ اپنی چوڑیوں کو یوں گنتی رہتی تھیں جیسے وہ کسی گنتارے کے مہرے ہوں۔ اماں کی حالت ایسی تھی کہ انہیں تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ ان کے پاس ہر وقت کسی کا موجود ہونا ضروری تھا کیونکہ ایک دفعہ وہ نیم برہنہ گھر سے نکل پڑی تھیں اور ہم انہیں ٹرام ڈپوسے واپس لے کر آئے تھے۔

"مجھے مسز کرافٹ کے لیے ہر شام سوپ گرم کرنا اچھا لگے گا!" میں نے پیالی میں سے ٹی بیگ نکال کر نچوڑتے ہوئے ہیلن سے کہا۔ "ایسا کرتے ہوئے مجھے کوئی دقت نہیں ہوگی!"

ہیلن نے اپنی گھڑی پر نگاہ دوڑائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی پیالی کی باقی ماندہ چائے سنک میں بہادی اور بولی: "میں اگر تمہاری جگہ ہوتی تو ایسا نہ کرتی۔ یہ وہ چیز ہے جو اماں کو بالکل مار کر رکھ دے گی۔ سوپ گرم کرنے کے بہانے وہ کچھ حرکت کر لیتی ہیں۔"

اس شام ہیلن کے آر لنکٹن واپس جانے کے بعد جب میں اور مسز کرافٹ دوبارہ گھر میں اکیلے تھے تو مجھے خدشات نے آگھیرا۔ اب جب کہ مجھے پتہ چل چکا تھا کہ وہ کس قدر بوڑھی ہے تو مجھے یہ ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں آدھی رات کو جب میں سو رہا ہوں یا دن کو جب میں گھر سے باہر ہوں تو اسے کچھ ہونہ جائے۔ باوجود اس کے کہ مسز کرافٹ کی آواز زندگی کی توانائی سے بھرپور تھی اور اس کی شخصیت میں ایک رعب اور دبدبہ تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس قدر بوڑھی عمر کے فرد کو تو ہلکی سی خراش یا کھانسی بھی ہو جائے تو جان لے کے ٹلتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ مسز کرافٹ کے لیے زندگی کا ہر نیا دن کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ اگرچہ ہیلن کا میرے ساتھ رویہ بظاہر بڑا دوستانہ تھا لیکن میرے دماغ کے کسی کونے میں یہ خدشہ موجود تھا کہ اگر مسز کرافٹ کو کچھ ہو گیا تو ہیلن میری غفلت کو دوش دے گی۔ میرے ان خدشات کے برعکس ہیلن اپنی ماں کی صحت کے متعلق بالکل متفکر دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس کا آنا جانا لگا رہا۔ وہ ہر اتوار کو بڑی باقاعدگی سے اپنی ماں کے لیے سوپ کے ٹن لاتی تھی۔

اسی طرح اس موسم گرما کے چھ ہفتے بیت گئے۔ میں دن بھر لائبریری میں کام کر کے شام کو جب گھر لوٹتا تو مسز کرافٹ کے پیانو بچہ بیٹھ کے اس کی معیت میں کچھ منٹ گزارتا۔ میں اسے تسلی دیتا کہ میں نے دروازے کو اچھی طرح لاک کر دیا ہے اور چاند پہ پرچم کا نصب ہونا بڑی دلکش بات ہے۔ کبھی کبھار جب نیند سے اس کا سر سینے پہ ڈھلک جاتا تو میں تب بھی بیٹھا رہتا اور اس کی طویل عمر کا سوچ کے حیران ہوتا رہتا۔ میں چشم تصور سے اس زمانے کو دیکھنے کی کوشش کرتا جب مسز کرافٹ نے، ۱۸۶۶ء میں، آنکھ کھولی ہوگی تو میرے ذہن میں جو تصویر ابھرتی وہ سیاہ رنگ کے لمبے اسکرٹ پہنے لڑکیوں کی ہوتی جو مہمان خانے میں سب کی موجودگی میں بڑی پاکیزہ گفتگوئیں کر رہی

ہوں۔ میں مسز کرافٹ کے گود میں بندھے ہاتھوں پہ نگاہ ڈالتا جن کی انگلیوں کے جوڑ سوچے ہوئے تھے اور پھر تصور میں مجھے یہ انگلیاں پیانو کی کلیدوں پہ حرکت کرتی بڑی مخروطی اور ملائم دکھائی دیتیں۔ میں کبھی کبھار رات کو نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے زینوں سے نیچے آکر یہ تسلی کر جاتا کہ مسز کرافٹ اپنے بچہ پہ یا اپنی خواب گاہ میں صبح سلامت موجود ہیں۔ ہر جمعے کو میں کرایہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ مسز کرافٹ کے ہاتھوں میں تھا دیتا تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے سوا میں اس کے لیے اور کر بھی کیا سکتا تھا بھلا! میں اس کا بیٹا تھوڑی تھا! ہر ہفتے آٹھ ڈالر کرایہ دینے کے سوا مجھ پہ اس کی کوئی ذمہ داری نہ تھی!

اگست کے اختتام تک مالا کا گرین کارڈ اور پاسپورٹ بن چکے تھے۔ مجھے ایک ٹیلی گرام کے ذریعے اس کی فلائٹ کی اطلاع ملی کیونکہ میرے بھائی کے ہاں ٹیلی فون موجود نہ تھا۔ ٹیلی گرام ملنے کے ایک آدھ دن بعد مجھے مالا کا ایک خط بھی موصول ہوا جو اس نے میری امریکاروانگی کے چند دن بعد لکھا تھا۔ خط کی پیشانی آداب تسلیمات سے عاری تھی۔ شاید مجھے نام سے مخاطب کرنے میں جو قربت کا احساس مخفی تھا وہ ہم دونوں کے درمیان ابھی موجود ہی نہ تھا۔ خط محض چند سطور پہ مشتمل ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں تھا: "میں انگریزی میں لکھ رہی ہوں تاکہ سفر کے لیے خود کو تیار کر سکوں۔ یہاں میں بہت اکیلی ہوں۔ کیا امریکا میں بہت ٹھنڈ ہے؟ وہاں برف پڑ رہی ہے؟ تمہاری مالا۔"

ان الفاظ کو پڑھ کر مجھے کسی قسم کی کوئی جذباتی کیفیت محسوس نہیں ہوئی۔ ہم نے ایک دوسرے کی قربت میں محض چند دن ہی تو اکٹھے گزارے تھے۔ لیکن ان چند دنوں کی رفاقت کے باوجود ہم ایک اٹوٹ بندھن میں بندھے ہوئے تھے۔ مجھ سے جڑنے کے بعد سے مالا نے اپنی کلائی میں کڑا اور مانگ میں سیندور بھر رکھا تھا تاکہ دنیا جان سکے کہ وہ سہاگن ہے۔ میں نے ان چھ ہفتوں میں مالا کی آمد کا ایسے ہی انتظار کیا تھا جیسے آنے والے مہینے یا موسم کا انتظار کیا جاتا ہے، جیسے کسی ناگزیر لیکن بہ یک وقت بے معنی چیز کے وقوع پذیر ہونے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ میں مالا کو اتنا کم جان پایا تھا کہ میرے دماغ کے پردے پر کبھی کبھار اس کی صورت کا ہیولا سا تو بنتا لیکن میں اس کی مکمل تصویر نہیں بناتا تھا۔ خط موصول ہونے کے چند دن بعد ایک صبح جب میں اپنے کام پہ لائبریری کی طرف رواں دواں تھا تو مجھے سڑک کی دوسری طرف ساڑھی میں ملبوس ایک ہندوستانی عورت دکھائی دی۔ وہ ایک بچہ گاڑی کو دھکیل رہی تھی اور اس کی ساڑھی کا آزاد پلو زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک امریکی خاتون ایک چھوٹے سے سیاہ رنگ کے کتے کی رسی پکڑے چل رہی تھی۔ اچانک کتے نے ہندوستانی عورت پہ بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ بے چاری گھبرا کر اپنی جگہ ٹھٹھک کر رک گئی تو کتے نے چھلانگ لگا کر اس کی ساڑھی کے آزاد پلو کو اپنے منہ میں دبا کر کھینچنا شروع کر دیا۔ امریکی خاتون نے اپنے کتے کو جھڑک کر پیچھے کھینچا اور ہندوستانی عورت سے معذرت کرتے ہوئے تیزی سے آگے

نکل گئی۔ میں سڑک کی دوسری طرف کھڑا یہ سب منظر دیکھ رہا تھا لیکن وہ ہندوستانی عورت میرے وجود سے بے خبر تھی۔ اس نے اپنی ساڑھی کا پلو ٹھیک کیا اور اپنے بچے کو چپ کروانے لگی جو کتے کے بھونکنے سے بے طرح رو رہا تھا۔ پھر وہ دوبارہ اپنے رستے پہ چل پڑی۔

اس صبح مجھے احساس ہوا کہ مالا کے یہاں آنے کے بعد مجھے بھی ہمیشہ ایسے ہی کسی حادثے کا ڈر رہے گا۔ امریکا میں مالا کا سواگت کرنا اور اس کی ہر طرح سے دیکھ بھال اور حفاظت کرنا اب میرے فرائض میں شامل ہو چکا تھا۔ اب مجھے اس کو برف میں استعمال ہونے والے بوٹ لے کر دینے تھے، اس کے لیے سردیوں کا کوٹ خریدنا تھا، اسے بتانا تھا کہ کن گلیوں سے گزرنے سے اجتناب کرے، سمجھانا تھا کہ یہاں ٹریفک کس سمت سے آتی ہے اور یہ بھی کہ وہ ساڑھی کو اس طرح اوڑھے کہ اس کا آزاد پلو فٹ پاتھ پہ نہ گھسٹا پھرے۔ اسے کلکتہ میں اپنے ماں باپ سے محض پانچ میل کی دوری بھی رلاتی رہتی تھی نہ جانے امریکا میں ان سے ہزاروں میل دور رہ کر اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ میں اس کے رونے پہ ہمیشہ جھنجھلا جایا کرتا تھا۔

مالا کے برعکس میں امریکی طرز زندگی کا عادی ہو چکا تھا۔ میں دودھ اور دلیے، ہیلن کے ہر اتوار کے چکر اور مسز کرافٹ کے چوبی پنچ پر بیٹھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس وقت تک میں جس چیز کا عادی نہیں تھا وہ مالا کی موجودگی تھی۔ بہر حال میں نے اپنے تئیں جو ہو سکتا تھا کیا۔ ایم آئی ٹی کے ہاؤسنگ آفس سے مجھے اپنی موجودہ رہائش سے چند بلاک کی دوری پر ایک فرنشڈ اپارٹمنٹ کا پتہ چلا جس میں ڈبل بیڈ اور الگ باورچی خانے اور باتھ روم کی سہولت میسر تھی اور جو چالیس ڈالر فی ہفتہ کے عوض دستیاب تھا۔ چنانچہ میں نے جمعہ کے دن مسز کرافٹ کو اپنے آخری ہفتے کا کرایہ لفافے میں ڈال کر دیا، اپنا سوٹ کیس سیڑھیوں سے اتار کر نیچے لایا اور اسے اطلاع دی کہ میں کہیں اور منتقل ہو رہا ہوں۔ اس نے مجھ سے چابی لے کر اپنے بٹوے میں ڈال لی اور مجھے میز سے ٹکی لاٹھی پکڑانے کے لیے کہا تا کہ وہ میرے جانے کے بعد دروازہ لاک کر سکے۔ دروازے پہ اس نے محض اتنا کہا: "اچھا تو پھر خدا حافظ!" اور واپس گھر میں گم ہو گئی۔ میں کسی جذباتی وداع کی توقع تو نہیں کر رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ آخر میرا اس سے رشتہ ہی کیا تھا، محض ایک کرائے دار جو کچھ رقم کے عوض اس کے گھر چھ ہفتوں تک رہتا رہا تھا۔ ایک صدی کے مقابلے میں تو یہ دورانیہ کچھ حیثیت نہ رکھتا تھا۔

ہوائی اڈے پہ میں نے مالا کو فوراً پہچان لیا۔ اس کی ساڑھی کا آزاد پلو ز میں پہ نہیں گھسٹ رہا تھا بلکہ کسی دلہن کی روایتی حیا کے اظہار کے لیے اس نے سر پہ لیا ہوا تھا۔ میری ماں بھی جب تک میرا باپ زندہ تھا یوں ہی ساڑھی کا پلو سر پہ لیا کرتی تھی۔ مالا کی پتلی پتلی گندمی بائیں سونے کے کڑوں سے بھری ہوئی تھیں، اس کے ماتھے پہ سرخ بندیا اور اس

کے پاؤں کے کناروں پہ لال مہندی رچی ہوئی تھی۔ میں نے ملتے ہی اسے نہ تو گلے لگایا، نہ بوسہ دیا اور نہ ہی اس کا ہاتھ تھاما بلکہ بنگالی میں اس سے پوچھا کہ کیا اسے بھوک لگی ہے۔ امریکا آنے کے بعد بنگالی میں یہ پہلا جملہ تھا جو میں نے بولا تھا۔ وہ ایک پل کے لیے ہچکچائی پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ گھر میں میں نے انڈوں کا شور بے والا سالن پکا رکھا ہے۔

"دورانِ پرواز کھانے کے لیے انہوں نے کیا دیا تمہیں؟"

"میں نے کچھ نہیں کھایا۔"

"کلکتہ سے یہاں تک کچھ نہیں کھایا؟"

"مینو میں لکھا تھا نیل کی دم کا سوپ!"

"لیکن اس کے علاوہ بھی تو کھانے کی چیزیں ہوں گی۔"

"نیل کی دم کھانے کے خیال سے ہی میری ساری بھوک مر گئی!"

جب ہم گھر پہنچے تو مالانے اپنا ایک سوٹ کیس کھول کر اس میں سے دو سوئیٹریں نکال کر مجھے پیش کیں۔ شوخ نیلے رنگ کے اونٹنی دھاگے سے بنی یہ سوئیٹریں اس نے میرے امریکا روانہ ہونے کے بعد بُنی تھیں۔ ایک سوئیٹر کا گلا انگریزی کے حرف وی کی شکل کا تھا جبکہ دوسری پہ ڈیزائن بنا ہوا تھا۔ میں نے دونوں کو پہن کر دیکھا، بازوؤں کے نیچے یہ کسی قدر تنگ تھیں۔ وہ میرے لیے دو ازار بند والے پاجامے، میرے بھائی کا ایک خط، اور دار جیلنگ کی کھلی چائے کی پتی کا ایک پیکیٹ بھی لائی تھی۔ میرے پاس اسے دینے کے لیے انڈوں کے سالن کے سوا کوئی تحفہ نہ تھا۔ ہم دونوں نے چپ چاپ میز پوش سے عاری میز پہ بیٹھ کر چیچکانٹوں کے بغیر ہاتھوں سے کھانا کھایا۔ اب تک میں نے کھانے کے لیے چھری کانٹے کا استعمال شروع نہیں کیا تھا۔ "گھرا چھا ہے۔" وہ بولی۔ "اور انڈوں کا سالن بھی!" اپنے بائیں ہاتھ سے اس نے اپنی ساڑھی کا پلو سینے پہ دبار کھاتھا کہ وہ اس کے سر سے کہیں سرک نہ جائے۔

"مجھے کچھ زیادہ بنانا نہیں آتا۔" میں نے کہا۔

اس نے آلوؤں سے چھلکا اتار کر انہیں کھاتے ہوئے سر ہلایا۔ کھانا کھاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اس کی ساڑھی کا پلو سرک کر اس کے کندھے پہ آگرا تو اس نے جلدی سے ساڑھی کو ٹھیک کر لیا۔

"تمہیں سر کوڈھانپنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے کھلے سر سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں امریکا میں اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔"

اس نے بہر حال اپنے سر کوڈھانپنے رکھا۔

میں نے کوشش کی کہ میں مالا کی اپنے پہلو میں، کھانے کی میز پر اور سونے کے بستر پر موجودگی کا جلد عادی ہو جاؤں لیکن ایک ہفتہ بیت جانے پر بھی ہم دونوں جیسے ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ میں ابھی تک زندگی میں اس تبدیلی کا عادی نہیں تھا کہ شام کو گھر لوٹوں تو اپارٹمنٹ میں ابلتے چاولوں کی مہک رچی بسی ہو اور واش بیسن ہمیشہ دھلا ہوا ملے اور ہم دونوں کے دانت صاف کرنے والے برش ترتیب سے ساتھ ساتھ رکھے ہوں اور انڈیا سے لایا گیا پیرز کا صابن صابن دانی میں رکھا ہو۔ میں ابھی تک ناریل کے تیل کی اس خوشبو کا عادی بھی نہیں ہو پایا تھا جو ہر رات سونے سے پہلے مالا اپنے سر پہ لگاتی تھی اور میرے لیے چوڑیوں کی وہ مدھر جھنکار بھی اجنبی تھی جو مالا کے اپارٹمنٹ میں چلنے پھرنے سے اٹھتی تھی۔ ہر صبح وہ مجھ سے پہلے جاگ جاتی تھی۔ اس کی آمد کے بعد پہلی صبح جب میں باورچی خانے میں گیا تو اس نے رات کے بچے ہوئے چاول گرم کر رکھے تھے اور ایک پلیٹ میں چچ بھر نمک رکھ کے میز پر دھر دیا تھا اس خیال سے کہ بہت سے بنگالی شوہروں کی طرح میں بھی ناشتے میں چاول کھاؤں گا۔ لیکن میں نے اسے بتایا کہ میرے لیے دلیہ ہی کافی ہے۔ چنانچہ جب میں دوسری صبح باورچی خانے میں آیا تو اس نے پہلے ہی پیالے میں دلیہ ڈال رکھا تھا۔

ایک صبح میں اسے اپنے ہمراہ میسی چیوسٹ ایونیو سے پیدل ایم آئی ٹی لے کر گیا جہاں میں نے اسے سارے کیمپس کی مختصر سی سیر کروائی۔ واپسی پہ ہم ہارڈویئر کی ایک دکان پہ رکے جہاں میں نے اپارٹمنٹ کی چابی کی ایک نقل تیار کروائی تاکہ میری غیر موجودگی میں مالا کے لیے اپارٹمنٹ جانے میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اگلی صبح جب میں کام کے لیے نکلنے لگا تو اس نے مجھ سے کچھ ڈالمانگے۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے اس کا مطالبہ پورا کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ فرمائشیں اب میری نئی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ جب میں کام سے لوٹا تو باورچی خانے کی دراز میں آلو چھیلنے والا آلہ، میز پر نیا میز پوش اور چولہے پہ تازہ لہسن اور ادک ملا مرغی کا سالن تیار پڑا تھا۔ ان دنوں ابھی ٹیلی ویژن عام نہیں ہوا تھا اس لیے کھانے کے بعد میں اخبار پڑھنے بیٹھ جاتا اور مالا باورچی خانے کی میز پہ بیٹھ کے یا تو نیلے اوونی دھاگے سے اپنے لیے سویٹر بنتی رہتی یا پھر اپنے گھر والوں کو خط لکھتی رہتی۔

جب مالا کو امریکا میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہونے کو آیا تو جمعے والے دن میں نے کہیں باہر چلنے کی تجویز دی۔ مالا نے یہ سنتے ہی اپنی سلائیاں رکھ دیں اور جھٹ باتھ روم میں غائب ہو گئی۔ جب وہ باہر نکلی تو اسے دیکھ کر مجھے اپنی تجویز پہ افسوس ہونے لگا۔ اس نے نئی ریشمی ساڑھی پہن لی تھی، کلائیوں پہ کڑوں کی تعداد بڑھ چکی تھی اور سر کے بالوں کو بل دے کر اس نے الٹی مانگ نکالی ہوئی تھی۔ وہ ایسے تیار ہو کے آئی تھی جیسے کسی پارٹی میں یا کم از کم سینما میں فلم دیکھنے جا رہی ہو لیکن میرے ذہن میں ایسی کوئی منزل نہ تھی۔ جب ہم باہر نکلے تو ہوا میں بڑی خوشگوار حدت موجود

تھی۔ ہم میسی چیوسٹ ایونیو پہ دکانوں اور ریسٹورنٹ کی کھڑکیوں سے اندر نگاہیں دوڑاتے بڑی دیر تک چلتے رہے۔ یوں ہی سبک خرامی کرتے کرتے کچھ سوچے بغیر میں اسے اس خاموش گلی میں لے گیا جہاں میں نہ جانے کتنی راتوں پیدل چلتا رہا تھا۔

"یہ وہ گھر ہے جہاں میں تمہارے امریکا آنے سے پہلے رہا کرتا تھا۔" مسز کرافٹ کی کڑی دار باڑ کے پاس رکتے ہوئے میں نے کہا۔

"اتنے بڑے گھر میں؟"

"میں نے اس کا صرف ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ گھر کے پچھلے حصے میں۔"

"یہاں اور کون رہتا ہے؟"

"ایک بہت ضعیف عورت۔"

"اپنے خاندان کے ساتھ؟"

"نہیں، اکیلی۔"

"پھر اس کا خیال کون رکھتا ہے؟"

"زیادہ تر تو وہ خود ہی اپنا خیال رکھتی ہے۔" میں نے باڑ کا دروازہ کھولتے ہوئے جواب دیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں مسز کرافٹ کو یاد ہوں گا۔ کیا اس کا کوئی نیا کرایہ دار اب ہر شام اس کے ساتھ بیچ پہ بیٹھتا ہو گا۔ جب میں نے گھنٹی دبائی تو مجھے توقع تھی کہ مسز کرافٹ دروازہ کھولنے میں اتنی ہی دیر لگائیں گی جتنی پہلے دن جب میں یہاں آیا تھا تو انہوں نے لگائی تھی۔ لیکن اب کی بار دروازہ فوراً کھول دیا گیا۔ دروازے پہ ہیلن تھی۔ اندر مسز کرافٹ اپنے مخصوص بیچ پہ دکھائی نہیں دے رہی تھی اور بیچ بھی غائب تھا۔

"ہیلو!" ہیلن گویا ہوئی۔ اس کے شوخ گلابی ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی اور وہ مالا کو دیکھ رہی تھی۔ "اماں مہمان خانے میں ہیں۔ کیا تم لوگ کچھ دیر روکو گے؟"

"جیسے آپ چاہیں، میڈم!"

"اچھا پھر ایسا ہے کہ اگر تمہیں برا نہ لگے تو میں ذرا اسٹور تک ہو آتی ہوں۔ اماں کے ساتھ چھوٹا سا حادثہ ہوا ہے۔ ان دنوں ہم انہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتے، ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔"

ہیلن کے جانے کے بعد میں نے دروازہ لاک کیا اور جلدی سے مہمان خانے پہنچا۔ مسز کرافٹ سیدھی لیٹی ہوئی تھی، اس کا سر ایک ہلکے مالٹائی رنگ کے تکیے پہ دھرا تھا اور بدن پہ پتلا سا سفید کمبل پھیلا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پہ

باندھ رکھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے صوفے کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں حسبِ ہدایت بیٹھ گیا لیکن مالا کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کہاں بیٹھے بالآخر وہ پیانو کے سامنے رکھے پنچ پہ بیٹھ گئی۔ یہ پنچ اب اپنی اصل جگہ پہ پہنچ چکا تھا۔

"میں اپنے کولہے کی ہڈی تڑوا بیٹھی ہوں!" مسز کرافٹ نے اعلان کرنے کے انداز میں یوں بتایا جیسے یہ حادثہ ابھی ہوا ہو۔

"اوہ ڈیر میڈم!"

"میں پنچ سے گر پڑی!"

"مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا ہے میڈم!"

"یہ حادثہ آدھی رات کو ہوا۔ تم جانتے ہو میں نے کیا کیا، لڑکے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے پولیس کو فون کر دیا!"

وہ چھت کو دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پہ ایک اطمینان بھری مسکراہٹ رقصاں تھی جو اس کے دانتوں کی قطار کو نمایاں کر رہی تھی۔ اس کا کوئی ایک دانت بھی غائب نہیں تھا۔ "تم کیا کہتے ہو میں نے ٹھیک کیا لڑکے؟" میں جانتا تھا کہ مسز کرافٹ کے سوالوں کا مجھے کیا جواب دینا ہے اس لیے بغیر ہچکچائے میں نے چیخ کر کہا: "بہت شاندار!"

مالا کھکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آواز میں ایک نرمی تھی اور اس کی آنکھوں میں ایک استعجاب چمک رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی مالا کو ہنستے ہوئے نہیں سنا تھا۔ اس کی ہنسی کی آواز اس قدر بلند تھی کہ مسز کرافٹ نے بھی سن لی تھی۔ وہ مالا کی طرف مڑی اور اسے گھور کر دیکھتے ہوئے بولی:

"یہ کون ہے، لڑکے؟"

"میری بیوی ہے، میڈم۔"

مسز کرافٹ نے تکیے پہ سر کو تھوڑا اور ٹیڑھا کیا تاکہ وہ مالا کو بہتر طور پر دیکھ سکے۔ "کیا تم پیانو بجا سکتی ہو؟"

"نہیں، میڈم۔" مالا نے جواب دیا۔

"پھر اس پنچ سے اٹھ جاؤ!"

مالا اپنی ساڑھی کو سر پہ سنبھالتی اور اس کے پلو کو سینے پہ دباتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے نہ جانے کیوں آج پہلی دفعہ اس

سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ مجھے لندن میں اپنے ابتدائی دن یاد آگئے جب میں پہلی مرتبہ یہ سیکھ رہا تھا کہ زیر زمین ٹرین پہ سوار ہو کے رسل سکوائر کیسے جانا ہے اور میں نے زندگی میں پہلی دفعہ خود کار برقی زینوں پہ قدم رکھا تھا اور کئی دنوں تک تو میں یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ "پائپر" سے مراد پیپر ٹکٹ ہے اور یہ سمجھنے میں تو مجھے لگ بھگ ایک سال لگ گیا تھا کہ جب ٹرین چلتی ہے تو کنڈکٹر کے "مانڈ ڈاگیپ" سے کیا مراد ہے۔ میری طرح مالانے بھی اب اپنے گھر سے ہزاروں میل دور سفر کیا تھا، ایک انجانی منزل کی طرف سفر جس کے بارے میں اسے کچھ علم نہ تھا۔ اس نے اپنوں سے یہ دوری محض میرے لیے کاٹی تھی۔ یہ بڑا عجیب احساس تھا لیکن میں اپنے دل میں جانتا تھا کہ جب ایک دن مالا مرے گی تو مجھے صدمہ پہنچے گا اور شاید اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ میرا مرنامالا کے لیے باعثِ رنج ہو گا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ سب مسز کرافٹ کو بتا پاؤں جو اب تک مالا کا سر سے پاؤں تک تنقیدی جائزہ لے رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اپنی طویل عمر میں مسز کرافٹ نے کیا کسی ایسی عورت کو دیکھا ہو گا جس کے بدن پہ ساڑھی، ماتھے پہ بندیا اور کلائیوں میں چوڑیاں ہوں۔ کیا وہ مالا پہ کوئی اعتراض کرے گی۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ مسز کرافٹ کی نظر کیا مالا کے پاؤں پہ لگی مہندی پہ گئی ہو گی جس کو ساڑھی نے جزوی طور پہ چھپا رکھا تھا۔ آخر کار مسز کرافٹ نے مالا کے بارے میں حتمی رائے کا اعلان کر دیا۔ اس کے لہجے میں مسرت اور بے یقینی کا وہ امتزاج تھا جس سے میں اچھی طرح واقف تھا:

"یہ ہر لحاظ سے مکمل لیڈی ہے!"

اب ہنسنے کی باری میری تھی۔ میری آواز دھیمی تھی اس لیے مسز کرافٹ نہ سن پائیں تاہم مالانے سن لی اور پہلی دفعہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔

مسز کرافٹ کے گھر میں اس لمحے کو میں جب بھی سوچتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہی وہ لمحہ تھا جب میرے اور مالا کے درمیان فاصلے کم ہونا شروع ہوئے۔ ہم اگرچہ ابھی تک ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئے تھے تاہم اس کے بعد آنے والے دنوں کو میں ایک طرح کا ہنی مون تصور کرتا ہوں۔ انہی دنوں میں میں نے اور مالانے مل کر شہر کو کھوجنا شروع کیا اور یہاں بسنے والے بنگالیوں سے ملاقاتیں کیں۔ ان میں سے کچھ بنگالی تو اب بھی ہمارے دوست ہیں۔ شہر کی تلاش میں ہی ہمیں پتہ چلا کہ پراسپیکٹ اسٹریٹ پہ بل نامی ایک شخص تازہ مچھلی بیچتا ہے اور ہارورڈ اسکوائر کی ایک دکان میں تیج کے پتے اور لونگ دستیاب ہیں۔ شام کو ہم دریائے چارلس کے کنارے چہل قدمی کرتے اور دریا کے پانیوں پہ تیرتی کشتیوں کو دیکھتے رہتے یا پھر کون آئس کریم لے کر ہارورڈ یونیورسٹی کے سبزہ زاروں میں مٹر گشت کرتے رہتے۔ ہم نے ایک سستا سا کیمرا بھی خرید لیا تاکہ زندگی کے ان لمحات کو تصویروں کی شکل میں محفوظ کر

سکیں۔ اس کیمرے سے میں نے مالا کی فلک بوس عمارت پر وڈنشل ٹاور کے سامنے کھڑے ہو کر تصویریں کھینچیں تاکہ وہ کلکتہ اپنے والدین کو بھیج سکے۔

ہم رات کو جب قریب ہوتے تو شروع میں ایک دوسرے کے چومنے سے جھجکتے تاہم جلد ہی اس جھجک پہ جوش غالب آجاتا اور ہمیں ایک دوسرے کی بانہوں میں شادمانی اور راحت کا انوکھا احساس ہوتا۔ میں نے مالا کو ایس ایس روماپہ اپنے بحری سفر، فزبری پارک کے گھر میں گزرے ماہ و سال، وائی ایم سی اے کے ہاسٹل اور مسز کرافٹ کے ساتھ بیچ پہ بیٹھ کے بتائی گئی شاموں کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ وہ بڑے اشتیاق سے میری باتیں سنتی رہی لیکن جب میں نے اسے اپنی ماں کی کہانی سنائی تو وہ رو پڑی۔ ایک شام میں اخبار پڑھ رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک تعزیتی پیغام پر پڑی۔ یہ تعزیتی سطور مسز کرافٹ کی رحلت پر چھاپی گئی تھیں۔ میں نے پچھلے کئی ماہ سے مسز کرافٹ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اس وقت تک اس کے ہاں گزارے چھ ہفتے مجھے ماضی کا ایک دھندلا سا خواب لگ رہے تھے لیکن یوں دفعتاً اس کے انتقال کی خبر پڑھ کر میں دم بخود رہ گیا۔ میں اپنے گرد و پیش سے جیسے ایک لمحے کے لیے کٹ گیا تھا۔ مالا نے جب سوئیٹر بننے ہوئے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں خالی خولی نظروں سے دیوار کو دیکھ رہا تھا اور اخبار میرے ہاتھوں سے گر کر گود میں پڑا تھا۔ مالا اٹھ کر میرے پاس آئی اور دیر تک مجھے تسلی دے کر میرا غم بانٹتی رہی۔ جس طرح مسز کرافٹ وہ پہلی شخصیت تھی جس سے میں امریکا میں متاثر ہوا تھا اسی طرح اس کی وفات امریکا میں میرا پہلا سوگ تھا۔ ایک طویل عمر تنہا گزار کر وہ بالآخر اس جہاں کو کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے چھوڑ گئی تھی۔

یہ ساری یادیں اب ماضی کی کتاب کا حصہ بن چکی ہیں۔ میں اور مالا اب بو سٹن سے لگ بھگ بیس میل دور ایک ٹاؤن میں رہائش پذیر ہیں۔ ہم ایک ایسے گھر کے مالک ہیں جس کا اپنا باغیچہ اور مہمان خانہ ہے اور جو مسز کرافٹ کے گھر کی طرح ایک ایسی گلی میں واقع ہے جہاں دونوں طرف درختوں کی قطاریں ہیں۔ ہم اب امریکی شہری ہیں اس لیے بڑھاپے میں سوشل سیکیورٹی کے حق دار ہیں۔ ہم اگرچہ ہر چند سال کے بعد کلکتہ جاتے ہیں اور واپسی پہ اپنے ساتھ ازار بند والے پاجامے اور دار جیلنگ کی پتی لانا نہیں بھولتے لیکن ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنا بڑھاپا یہاں امریکا میں ہی کاٹیں گے۔ میں اب ایک چھوٹے سے کالج کی لائبریری میں کام کرتا ہوں۔ ہمارا ایک بیٹا ہے جو ہارورڈ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ مالا اب ساڑھی کا پلو سر پہ نہیں لیتی اور نہ ہی اپنے ماں باپ کو یاد کر کے راتوں کو روتی ہے تاہم وہ اب کبھی کبھار اپنے بیٹے کے لیے ضرور روتی ہے۔ جب اسے بیٹا زیادہ یاد آنے لگتا ہے تو ہم گاڑی لے کر اس سے ملنے کیمبرج کی طرف نکل پڑتے ہیں یا اسے چھٹی کے دنوں میں گھر لے آتے ہیں تاکہ وہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے چاول کھائے اور بنگالی میں باتیں کرے۔ ہمیں ڈر ہے کہ ہمارے دنیا سے جانے کے بعد وہ یہ سب چیزیں بھول جائے گا۔

ہم جب بھی اس ڈرائیو پہ نکلتے ہیں تو میں ٹریفک کے ازدحام کے باوجود میسی چیوسٹ ایونیو کا راستہ اختیار کرتا ہوں۔ میں اب یہاں کی عمارتوں کو بہ مشکل پہچان پاتا ہوں لیکن جب بھی ادھر سے گزرتا ہوں تو میں لوٹ کر ان چھ ہفتوں میں ایسے پہنچ جاتا ہوں جیسے یہ ابھی کل کی بات ہو۔ میں گاڑی کی رفتار دھیمی کر کے مسز کرافٹ کی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیٹے کو بتاتا ہوں کہ یہ امریکا میں میرا پہلا گھر تھا جہاں میں ایک ایسی بوڑھی عورت کے ساتھ رہتا تھا جس کی عمر ایک سو تین سال تھی۔ "تمہیں یاد ہے؟" ملا میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہتی ہے اور ہم دل ہی دل میں اس بات پہ حیران ہوتے ہیں کہ کیا کبھی ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی بھی رہے تھے! میرا بیٹا بھی اظہار تعجب کرتا ہے۔ اس انکشاف پر نہیں کہ بوڑھی عورت کی عمر ایک سو تین سال تھی بلکہ اس بات پہ کہ میں کتنے کم کرا ئے پہ رہتا رہا ہوں۔ آٹھ ڈالر کرائے کو ہضم کرنا اس کے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا ۱۸۶۷ء میں پیدا ہونے والی عورت کے لیے چاند پہ امریکی پرچم کا نصب ہو جانا قابل تصور تھا۔ مجھے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں وہی امنگ دکھائی دیتی ہے جس نے مجھے اپنا وطن چھوڑ کر نئی دنیا کی طرف دھکیل دیا تھا۔ چند سال بعد وہ گریجویٹ ہو کر میری طرح ان جانے اور غیر محفوظ رستوں پر تنہا نکل پڑے گا۔ لیکن میں خود کو یاد دلاتا ہوں کہ وہ مجھ سے مختلف ہے کیونکہ میرے برعکس اس کا باپ ابھی زندہ ہے اور اس کی ماں خوش باش جی رہی ہے۔

جب کبھی میرا بیٹا مجھے دل شکستہ اور ملول دکھائی دے تو میں اس کا حوصلہ بندھاتا ہوں اور اسے بتاتا ہوں کہ اگر میں بے سروسامانی کے عالم میں دنیا کے تین براعظموں میں کامیابی سے اپنی بقا کی جدوجہد کر سکتا ہوں تو کوئی ایسی رکاوٹ نہیں جو اس کے سفر میں سدِ راہ بن سکے۔ امریکی خلا نورد تو محض چند گھنٹے چاند کی سطح پہ گزار کے ہمیشہ کے لیے ہیر و بن گئے تھے لیکن میں نے امریکا کی نئی اور انجانی دنیا میں تیس سال گزارے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ میری یہ کامیابی بہت معمولی ہے۔ نہ میں وہ واحد شخص ہوں جس نے اپنی مٹی سے دور اپنا مقدر کھوجنے کی جستجو کی اور نہ ہی میں ایسا کرنے والا کوئی پہلا شخص ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں کبھی کبھی یہ سوچ کر حیرت کے سمندر میں ڈوبتا چلا جاتا ہوں کہ میں اس سفر میں کتنے دور نکل آیا ہوں۔ ہر وہ قدم جو میں نے اس سفر میں اٹھایا، ہر وہ لقمہ جو میں نے اس راہ میں کھایا، ہر وہ فرد جس سے میں ملا اور ہر وہ کمرہ جس میں میں نے قیام کیا مجھے یاد آ کر میری حیرت کو دوچند کرتے رہتے ہیں۔ بظاہر یہ سب بہت معمولی دکھائی دیتا ہے لیکن کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ میرے خواب و خیال سے پرے کی کوئی چیز ہو، جیسے تین براعظموں کا یہ سفر میرے وہم و گماں کی حدوں سے بھی ماورا ہو!

باب سوم

حواشی

افسانہ نمبر ۱

تعطل

^۱ انیسویں صدی کے نصف دوم میں برطانوی راج کی نافذ کردہ زمینی اصلاحات (Land Reforms) کے خلاف ہندوستان میں اٹھنے والی کسانوں کی احتجاجی تحریکوں (Agrarian revolts) کی طرف اشارہ ہے۔

^۲ انیسویں صدی کا مشہور برطانوی ٹیکسٹائل ڈیزائنر، شاعر، ناول نگار اور مترجم William Morris جس نے عہد وکٹوریہ کے برطانوی سماج کے ادب، فن اور ثقافت کو بے حد متاثر کیا۔

^۳ Baltimore ریاستہائے متحدہ امریکا کی ریاست میری لینڈ (Maryland) کا ایک شہر

^۴ Vinho Verde کا لفظی مطلب سبز شراب ہے اور اس کا تعلق شمالی پرتگال کے صوبے Minho سے ہے۔ عام طور پر اسے پرتگیزی شراب کہا جاتا ہے۔

^۵ ایریزونا (Arizona) امریکہ کی ایک ریاست

^۶ Jazz Music موسیقی کی ایک قسم جس کا اول ظہور انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں امریکہ کی ریاست New Orleans کی افریقی امریکی کمیونٹی کے ہاں ہوا اور اب دنیا بھر میں جدید موسیقی کی ایک معروف قسم خیال کی جاتی ہے۔

^۷ مکھی بھات انڈیا میں مغربی بنگال کی ایک مشہور رسم ہے جس میں بچے کو پہلی ٹھوس غذا کھلانے کی ایک تقریب منعقد کی جاتی ہے۔

^۸ نیوہیمپ شائر (New Hampshire) ریاستہائے متحدہ امریکا کے علاقے نیو انگلینڈ میں واقع ایک ریاست۔

^۹ Concord امریکہ کی ریاست نیوہیمپ شائر کا صدر مقام۔

^{۱۰} Truth or dare

^{۱۱} سمرویل (Summerville) امریکی ریاست شمالی کیرولینا (South Carolina) کا ایک شہر۔

۱۲ Stockings مغربی معاشرہ میں عورتوں کے لباس کی ایک قسم ہے جو شفاف، جالی دار چست کپڑے پر مشتمل ہوتا ہے اور جسے پاجامے کے طور پر پہنا جاتا ہے۔ اردو یا ہندی یا فارسی و عربی میں اس کے لیے کوئی متبادل لفظ موجود نہیں اس لیے اس کا ترجمہ جالی دار جراب سے کیا گیا ہے۔

۱۳ Utah امریکا کی ایک ریاست کا نام۔

Thelonious Monk ۱۴ بیسویں صدی کا مشہور امریکی پیانو نواز موسیقار جس نے جاز موسیقی میں جدت طرازی کے کئی تجربے کیے۔

جدائی

^{۱۵} Vermont اور Maine امریکہ کی دو ریاستوں کے نام

^{۱۶} Plymouth Rock امریکہ کی ریاست میسی چیوسٹ کے شہر پلائی ماؤتھ میں واقع ایک تاریخی مقام ہے جہاں انگلیڈ سے آئے ہوئے آبادکاروں نے ۱۶۲۰ء میں پہلی دفعہ امریکی سرزمین پر قدم رکھے تھے۔

^{۱۷} Freedom trails امریکی شہر بوسٹن میں بنایا گیا ایک اڑھائی میل لمبا رستہ ہے جو امریکی تاریخ کے سولہ اہم مقامات کے پاس سے گزرتا ہے۔

^{۱۸} Bunker Hill Monument امریکی آزادی کے لیے لڑی جانے والی ایک اہم جنگ Battle of Bunker Hill کی یادگار ہے جو ۱۷۷۵ء میں برطانوی فوج اور امریکی آزادی پسندوں کے درمیان لڑی گئی۔

^{۱۹} Delaware ایک مشہور امریکی دریا جس کو جارج واشنگٹن نے جنگ آزادی کے دوران عبور کیا تھا۔

^{۲۰} Mayflower اس بحری جہاز کا نام ہے جو برطانیہ سے انگریز آبادکاروں کی پہلی کھیپ لے کر ۱۶۲۰ء میں نو دریافت شدہ امریکی سرزمین پر لنگر انداز ہوا تھا۔

^{۲۱} امریکی شہر فلاڈیلفیا میں واقع امریکی جنگ آزادی کی ایک تاریخی علامت۔

^{۲۲} یارک ٹاؤن، ورجینیا، میں ۱۹ اکتوبر ۱۷۸۱ء کو برطانوی فوجوں کا امریکی انقلابیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا تاریخی لمحہ

^{۲۳} Jack-o-lantern ایک مغربی تہوار ہالووین (Halloween) کے موقع پر پھلوں کو کھود کر ان پہ چہروں کے نقش بنانے کو کہتے ہیں۔

^{۲۴} Halloween بہت سے مغربی ممالک میں ہر سال ۳۱ اکتوبر کی شام منایا جانے والا وہ تہوار ہے جس میں لڑکے بالے بھوت پریتوں کا روپ دھار کے لوگوں کو ڈراتے ہیں۔

^{۲۵} ہالووین کے موقع پر بچے بھوت پریت کا روپ دھار آس پڑوس کے گھروں میں جا کر دروازے پہ یہ صدا لگاتے ہیں۔ اگر انہیں treat یعنی کوئی چھوٹا موٹا تحفہ نہ دیا جائے تو وہ گھر والوں کو کسی Trick یعنی مذاق سے تنگ کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔

دکھوں کا ترجمان

^{۲۶} ہندوستان کی ریاست اڑیسا کا ایک شہر

^{۲۷} انڈیا کی ریاست مغربی بنگال کا ایک شہر

^{۲۸} ریاست اڑیسا کے ایک شہر کا نام

^{۲۹} انگریزی میں اظہار تعجب و تحسین کے لیے استعمال ہونے والا کلمہ Wow

^{۳۰} Dallas اسی کی دہائی میں چلنے والا ایک معروف امریکی ڈرامہ سیریل

^۱ بھارتی ریاست اڑیسا میں اودے گری (Udayagiri) اور کھنڈ گری (Khandagiri) کی پہاڑیوں پہ بنی غاروں اور

عمار توں کا ایک سلسلہ جو ہندومت اور بدھ مت کے پیروکاروں کے ہاں مذہبی اہمیت کا حامل ہے۔

^{۳۲} Manhattan ایک امریکی شہر کا نام

^{۳۳} New Brunswick امریکی ریاست نیوجرسی کا ایک شہر

اصلی دربان

^{۳۴} کلکتہ کے دوپوش رہائشی علاقے۔

^{۳۵} مغربی بنگال کے دریائے ہوگلی پہ بنا ہوا پل جو کلکتہ کو ہاوڑا شہر سے ملاتا ہے۔

^{۳۶} شملہ انڈیا کی ریاست ہماچل پردیش کا ایک شہر ہے اور اپنے ٹھنڈے موسم اور فطری نظاروں کے باعث انڈیا کا مشہور سیاحتی مقام ہے۔

سیکسی

^{۳۷} Cubicle وہ چھوٹا کین جس میں صرف ایک فرد بیٹھ کر کام کر سکے۔

^{۳۸} The Economist لندن سے جاری ہونا والا مشہور ہفت روزہ میگزین جس میں عالمی سیاسی اور معاشی امور پر مضامین

چھاپے جاتے ہیں۔

^{۳۹} Grameen Bank بنگلہ دیش کا ایک مائیکرو فنانس بینک

^{۴۰} بو سٹن کا ایک مشہور ڈیپارٹمنٹ سٹور

^{۴۱} Pantyhose مغرب بالخصوص امریکہ میں خواتین کا ایک پہناوا جو نائیلون سے بنایا جاتا ہے۔

^{۴۲} Michigan ایک امریکی ریاست کا نام

^{۴۳} Alewife station امریکی ریاست ماسی چیوسٹ کے علاقے کیمرج میں واقع ایک سب وے ریلوے اسٹیشن

^{۴۴} Mapporium امریکی شہر بو سٹن میں تین منزلہ عمارت میں بنایا گیا رنگ برنگے شیشوں کا ایک قوی ہیکل گلوب ہے۔

^{۴۵} Mariana Trench

^{۴۶} Bahamas جزائر غرب الہند کا ایک چھوٹا سا ملک

^{۴۷} Pantyhose مغرب میں خواتین کا ایک لبادہ

^{۴۸} Stockings مغرب میں خواتین کا ایک چست لباس

^{۴۹} Cocktail dress پارٹیوں پہ پہنا جانے والا مغربی خواتین کا ایک لباس

^{۵۰} Foie grass ایک فرانسسی ڈش

مسز سین کا گھر

Steno Pad^{۵۱} چھوٹی سی نوٹ بک

باقی دنیا کے برعکس جہاں یوم مزدور ہر سال یکم مئی کو منایا جاتا ہے امریکہ میں یہ ہر سال ستمبر کے پہلے سوموار کو منایا جاتا ہے۔

Mothballs^{۵۲} وہ چھوٹی چھوٹی سفید گولیاں جو کپڑوں یا بند بستروں کے درمیان رکھ دی جاتی ہیں تاکہ کیڑے انہیں نقصان نہ پہنچائیں۔

Vinyl^{۵۳} ایک قسم کی پلاسٹک

Chrome^{۵۴} ایک طرح کی دھات جو کرومیم سے بنائی جاتی ہے۔

Ludwig van Beethoven^{۵۵} جرمنی کا مشہور موسیقار

Miss^{۵۶} بمعنی یاد کرنا

Clam cakes^{۵۷}

Fender^{۵۸} گاڑی کے دونوں اطراف پہیوں کے اوپر لگنے والا مڈ گارڈ

افسانہ نمبر ۷

مبارک گھر

^{۶۰} کیتھولک فرقے سے تعلق رکھنے والے ایک مشہور اطالوی راہب

^{۶۱} Three wise men عیسائی روایات کے مطابق وہ تین بادشاہ تھے جنہوں نے حضرت مسیح کی پیدائش کے بعد ان کی زیارت کی اور تحفے تحائف نذر کیے۔

^{۶۲} Massachusetts Institute of Technology امریکی کی ایک معروف یونیورسٹی

^{۶۳} امریکی ریاست کوئٹیکٹ کا صدر مقام

^{۶۴} آسٹریائی تعلق رکھنے والے انیسویں صدی کے مشہور رومانوی موسیقار Gustav Mahler

^{۶۵} Manhattan نیویارک سٹی کا سب سے گنجان آباد علاقہ

^{۶۶} مین ہٹن کا ایک رہائشی علاقہ

^{۶۷} Palo Alto امریکی ریاست کیلیفورنیا کا ایک شہر

^{۶۸} Wodehouse بیسویں صدی کا ایک معروف برطانوی ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار

^{۶۹} Attic کسی عمارت میں چھت کے نیچے کا وہ حصہ جسے عام طور پر بطور سٹور استعمال کیا جاتا ہے۔ یورپ و امریکا میں جہاں

مکانوں کی چھتیں ترچھی رکھی جاتی ہیں تاکہ برف باری کی صورت میں ان پہ برف اکٹھی نہ ہو وہاں کمروں کی سیلنگ اور

بیرونی چھت کے درمیان جو جگہ بچتی ہے اسے Attic کہتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں چونکہ اس طرح کی چھتوں کا کوئی رواج

نہیں اس لیے اردو یا ہندی میں اس کے لیے کوئی لفظ مستعمل نہیں۔ گئی کا لفظ Attic کے مکمل معنی تو نہیں دیتا تاہم Attic

کی جگہ اس سے بہتر اور کوئی لفظ ہمارے پاس موجود نہیں۔

^{۷۰} پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی کے انگلستان میں ٹوڈر عہد میں طرز تعمیر کا ایک معروف انداز

^{۷۱} Sonnet چودہ مصرعوں کی ایک نظم

^{۷۲} قدیم یونانی سائنسدان ارشمیدس کے نعرے Eureka یعنی میں نے پالیا کی طرف اشارہ

افسانہ نمبر ۸

بی بی ہلدار کا علاج

۳۳ بنگال کی ایک رسم جس میں شادی کے موقع پر سینہ در لگی مچھلی دلہا دلہن کے سامنے رکھی جاتی ہے۔

۳۴ وزیر اعظم

۳۵ شاعری

تیسرا اور آخری برا عظم

۶ Grundig الیکٹرانکس کا سامان بنانے والی ایک معروف یورپین کمپنی کا نام ہے۔

۷ God bless America ایک معروف امریکی قومی نغمے کے بول ہیں۔

۸ وائی ایم سی اے یعنی Young Men's Christian Association ایک ایسی تنظیم ہے جو نوجوانوں کو سستی اور صحت مندانہ سرگرمیوں کے لیے مواقع فراہم کرتی ہے۔

۹ ایم آئی ٹی کی ایک لائبریری

۱۰ کیمبرج، میسی چیوسٹ میں ایک ۹-۳ لمبا رستہ

۱۱ ایک معروف سپراسٹور کا نام

باب چہارم

افسانوی مجموعے کا موضوعاتی جائزہ

دکھوں کا ترجمان (Interpreter of maladies) بنیادی طور پر تارکین وطن کے روگوں (Maladies) کی داستانیں ہیں۔ اپنی زمینوں سے کٹ کر نئی زمینوں سے رشتہ جوڑنے والوں کو جن نفسیاتی، سماجی اور تہذیبی مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے جھپانے اس مجموعے میں انہیں نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ ہجرت کے نتیجے میں مٹی بنتی شناختیں اور ٹوٹے جڑتے رشتے "دکھوں کے ترجمان" کا بنیادی موضوع ہیں۔ یہ کرداروں کی پرانی اور نئی شناخت کے درمیان کشمکش کی کہانیاں ہیں۔ یہ کشمکش ان کے دل و دماغ سے لے کر ان کے باہمی رشتوں تک ہر جگہ موجود ہے اور اسی کشمکش کے نتیجے میں جنم لینے والے ایسے افسانوں میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ اپنا وطن چھوڑ کر نئی دنیا میں بسنے والی پہلی اور دوسری نسل کے دکھ اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ان کی تہہ میں کہیں کوئی یکتائی موجود ہے۔ جھپانے دونوں نسلوں کی بدلتی زندگیوں کی نہایت دلکش تصویر کشی کی ہے۔

ان افسانوں کے موضوعات کا تجزیہ کرنے کے لیے ہم انہیں عائلی، نفسیاتی، جنسی، تہذیبی اور ہجرت سے جڑے مسائل میں تقسیم کر کے فرداً فرداً ان پر نظر ڈال سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ امر واضح ہے کہ ان افسانوں کے متعدد کردار بہ یک وقت متعدد مسائل کا شکار ہیں اور ہر افسانہ ایک سے زائد موضوعات کا احاطہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

الف۔ عائلی مسائل سے متعلقہ موضوعات

اس مجموعے کا پہلا افسانہ "تعل" (A temporary matter) ایک نوجوان جوڑے شوہا اور شوکمار کی ایک دوسرے سے دوری کی داستان ہے۔ اپنے پہلے بچے کی وفات کے بعد دونوں ایک دوسرے سے کٹ چکے ہیں اور اب ایک ہی گھر میں اجنبیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ طوفان کے باعث بجلی کی فراہمی میں تعل ان کے رشتے میں در آنے والی سرد مہری میں بھی تعل کا باعث بنتا ہے اور وہ دونوں اندھیری شاموں میں موم بتیاں جلانے ایک دوسرے سے بظاہر قریب آتے دکھائی دیتے ہیں لیکن افسانے کے آخر میں یہ انکشاف ہوتا ہے کہ شوہا نے ایک اور فلیٹ کرائے پہ لے لیا ہے اور اب وہ شوکمار کو چھوڑ کر وہاں رہنے جا رہی ہے۔ افسانے میں میاں بیوی کے ٹوٹے رشتے کا نہایت المناک نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نومولود بیٹے کی موت نے اگرچہ دونوں کو مختلف انداز میں متاثر کیا ہے لیکن دونوں کے درمیان سرد مہری کی بڑھتی خلیج نے انہیں یہ غم مل کر برداشت کرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ وہ دونوں اپنے اپنے خول میں بند اس کرب سے نبرد آزما ہونے کی کوشش میں بالآخر ٹوٹ کر ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ لیکن

افسانے کا انجام مبہم ہے ہم یہ نہیں جان پاتے کہ یہ دوری عارضی ہے یا دائمی۔ پروفیسر سمالتھا کے خیال میں ان کے رشتے میں یہ تعطل بجلی میں فراہمی کے تعطل کی طرح عارضی ہے۔ وہ کہتی ہیں:

"Letting out the pent up feelings certainly acts like a catalyst in some ways. The marital discord is thus skilfully shown to be a temporary matter just as the interruption in electric power supply has been."^(۱)

شادی شدہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل تیسرے افسانے "دکھوں کا ترجمان" (Interpreter of maladies) کا بھی بنیادی موضوع ہیں۔ ہندوستانی نژاد امریکی جوڑا مسٹر اور مسز داس اپنے تین بچوں کے ساتھ بظاہر ایک نارمل زندگی گزار رہے ہیں لیکن اس نارمل زندگی کی تہہ میں کئی طوفان پوشیدہ ہیں۔ مسز داس اپنے شوہر سے بے وفائی کا راز سات سال سے اپنے سینے میں دبائے بیٹھی ہے۔ سیاحتی گائیڈ مسٹر کا پاسی جب اسے بتاتا ہے کہ وہ ایک ڈاکٹر کے پاس مریضوں کی ترجمانی کا کام کرتا ہے تو وہ اس سے اپنے روگ کے علاج کی امید لگا کر بیٹھ جاتی ہے لیکن کا پاسی کے پاس بھی اس روگ کا کوئی علاج نہیں۔ صرف مسٹر اور مسز داس کے درمیان ہی سرد مہری اور بے اعتنائی کی دیوار حائل نہیں بلکہ مسٹر کا پاسی اور اس کی بیوی کے درمیان بھی محبت کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے اور دونوں اب مجبوری کے ڈور سے بندھے ایک دوسرے کے ساتھ گھسٹ رہے ہیں۔

چوتھی کہانی "اصلی دربان" (A real durwan) اگرچہ جنموں جلی بوڑھی اماں کی داستانِ غم ہے لیکن اس میں بھی مسٹر اور مسز دلال کی شادی شدہ زندگی میں تناؤ کا قصہ نمایاں ہے۔ جب مسٹر دلال اپنی ترقی کی خوشی میں اپنے فلیٹ میں لگانے کے لیے دو واش بیسن لاتے ہیں تو ان کی بیگم بھنا اٹھتی ہے اور میاں بیوی کے درمیان ایک زوردار جھڑپ رونما ہوتی ہے۔ مسز دلال کی زبانی ہمیں پتہ چلتا ہے کہ شادی کے وقت وہ جو امیدیں اور خواہشیں لے کر آئی تھی وہ سب ٹوٹ چکی ہیں۔ لیکن کہانی میں آگے چل کر ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مسز دلال نے اپنی بیگم کو راضی کرنے کے لیے اس کی خوب سیوا کی ہے اور اب وہ سیر کرنے دس دنوں کے لیے سیاحتی مقام شملہ جا رہے ہیں۔ یوں دونوں کی زندگیوں میں یکسانیت نے جو بوریت لاد دی تھی اس سے چھٹکارا پا کر وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے دکھائی دیتے ہیں۔

"دکھوں کا ترجمان" کی طرح شادی شدہ زندگی میں بے وفائی "سیکسی" (Sexy) کا بھی بنیادی موضوع ہے۔ بائیس سالہ میر انڈا اپنے سے کئی سال بڑے شادی شدہ دیو کے عشق میں مبتلا ہے۔ دیو اپنی بیوی کے ہندوستان جانے کے بعد ہر روز میر انڈا سے ملنے آتا ہے اور دونوں کے درمیان ایک بھرپور جنسی تعلق قائم ہے۔ میر انڈا کی ہندوستانی دوست

لکشمی اپنی ایک کزن کے لیے پریشان ہے جس کا شوہر کسی انگریز عورت کے عشق میں اپنے بیوی بچے کو چھوڑ چکا ہے۔ لکشمی کی زبانی میرانڈا کو وقتاً فوقتاً اس کی کزن اور اس کے سات سالہ بیٹے روہن کی کیفیات پتہ چلتی رہتی ہیں۔ لکشمی کی کزن اپنے شوہر کی بے وفائی کے باوجود اسے معاف کرنے کے لیے تیار ہے۔ ایک روز جب لکشمی اور اس کی کزن کی عدم موجودگی میں میرانڈا روہن کی دیکھ بھال کے لیے اس کے ساتھ کچھ وقت گزارتی ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ روہن کے باپ کی بے وفائی نے کیسے اسے اور اس کی ماں کو توڑ کر دیکھ دیا ہے۔ میرانڈا کو احساسِ ندامت گھیر لیتا ہے اور وہ دیو سے دور جاتی ہے۔ افسانے میں دو مردوں کی اپنی بیویوں سے بے وفائی اور اس کے نتیجے میں ٹوٹتے بکھرتے گھروں کی تصویر کشی جھمپانے میرانڈا کے ذریعے کی ہے۔ روایتی ہندوستانی عورت کا یہ روپ کہ وہ شوہر کی بے وفائی کا داغ سہنے کے باوجود اسے دوبارہ قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے اس افسانے میں نمایاں ہے۔ "دکھوں کے ترجمان" میں بیوی کی بے وفائی اور اس افسانے میں شوہروں کی بے وفائی نے عائلی زندگی کے تار و پود ادھیڑ کر رکھ دیے ہیں۔

"مسز سین کا گھر" (Mrs Sen's) میں میاں بیوی کے درمیان الجھاؤ کی وجہ بے وفائی نہیں بلکہ اپنی سر زمین سے دوری ہے۔ مسز سین اپنے پروفیسر شوہر کے ساتھ امریکا آئی ہیں لیکن ان کا دل پیچھے کہیں کلکتہ میں رہ گیا ہے۔ وہ ہندوستان میں ایک روایتی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جہاں سب مل جل کر ایک دوسرے کا دکھ سکھ بانٹتے زندگی گزارتے ہیں لیکن امریکا کی اس نئی، بے مہر اور سرد مہر دنیا میں ان کا جی نہیں لگ رہا۔ ان کے اندر گھٹن بڑھ رہی ہے اور نتیجتاً ان کا اپنے شوہر سے رشتہ بھی سرد مہری کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔

ایک اور شادی شدہ جوڑے ٹوٹنے اور سنجیو کی زندگی میں آنے والے عائلی مسائل افسانہ "مبارک گھر" (This blessed house) کا موضوع ہیں۔ دونوں کی شادی کو ابھی ۴ ماہ بیتے ہیں اور نئے گھر منتقل ہونے کے بعد دونوں کے رشتے میں رومانویت کی بجائے جھنجھلاہٹ در آئی ہے کیونکہ دونوں کے مزاج ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ ٹوٹنے والے گھر میں ملنے والے مسیحی تبرکات سے محبت ہے تو سنجیو ان سے نفرت کرتا ہے۔ ٹوٹنے والے گھر میں ملنے والے جوئے اچھے لگتے ہیں تو سنجیو کو اپنے میاں نے قد کی وجہ سے ان سے چڑ ہے۔ لیکن دونوں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی خامیوں سے سمجھوتا کرنا سیکھ جاتے ہیں اور افسانے کے آخر میں دونوں کو ایک دوسرے کے قریب آتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ جھمپانے اس افسانے میں میاں بیوی کے درمیان ایک دوسرے کے احساسات کو سمجھنے اور ایک دوسرے کو جملہ خامیوں سمیت قبول کرنے کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

"تیسرا اور آخری براعظم" (The third and final continent) میں نوجوان اور اس کی بیوی کے درمیان

ابتدا میں ایک مشینی سارشتہ قائم ہے جو محبت کی گرمجوشی سے کلی طور پر عاری ہے لیکن مسز کرافٹ سے ملاقات میں ان کے درمیان بے اعتنائی کی یہ برف پگھلنے لگتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ افسانے کے آخری حصے میں نوجوان جو اب بوڑھا ہو چکا ہے ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اب وہ اگر لوٹ کر ماضی کو دیکھتا ہے تو اسے حیرت ہوتی ہے کہ کیا وہ اور اس کی بیوی کبھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی بھی تھے۔ جھمپانے اس افسانے میں شادی شدہ زندگی میں محبت کے درجہ بہ درجہ ورود کی تصویر کشی ہے۔

الغرض زیرِ نظر افسانوی مجموعے کا غالب موضوع ٹوٹتے بکھرتے رشتے، شادی شدہ زندگی کی پیچیدگیاں اور میاں بیوی کے باہمی رشتوں میں پڑنے والی دراڑیں ہیں۔ پروفیسر ارچناور ماسنگھ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہیں:

"Lahiri presents a wide array of highly complex marital relationships and a galaxy of characters in Interpreter of Maladies and Unaccustomed Earth. But she does not judge her characters or their behavior. Parallel as well as contrasting situations and characters provide a rich tapestry for the reader to relish. Lahiri's narratives revolve around many marriages, both intra and inter cultural and she does not privilege any one type over the other."^(۲)

اس افسانوی مجموعے کا اگر مجموعی جائزہ لیا جائے تو ہجرت اور ہجرت سے جڑے مسائل کے بعد شادی شدہ جوڑوں کی زندگیوں میں آنے والی پیچیدگیاں سرفہرست ہیں۔

ب۔ نفسیاتی مسائل سے متعلقہ موضوعات

اس افسانوی مجموعے کے متعدد کردار ہجرت، بے وطنی، بے وفائی اور اپنی گم کردہ شناخت کے نتیجے میں نفسیاتی مسائل سے دوچار نظر آتے ہیں۔ "تعطل" کے دونوں مرکزی کردار شو بھا اور شو کو مار اپنے نو مولود بیٹے کی موت پر ذہنی تناؤ، دماغی الجھن اور قلبی خلفشار کا شکار ہو کر ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں اور اب وہ ایک ہی گھر میں رہ کر ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر ہیں۔ دونوں اپنے دکھوں کی آگ میں تنہا جل رہے ہیں اور اب ایک دوسرے سے فرار حاصل کرنے کے درپے ہیں۔

"جدائی" (When Mr Prizada came to dine) میں پیر زادہ صاحب بھی اپنے دماغی تناؤ سے بچنے کے لیے ہر شام لیلیا کے گھر پناہ ڈھونڈتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بو سٹن میں ایک ریسرچ گرانٹ کے نتیجے میں قیام پذیر ہیں لیکن یہ ۱۹۷۱ء کا موسم خزاں ہے اور ان کا شہر ڈھاکہ جنگ کی آگ میں جھلس رہا ہے۔ وہ اپنی بیوی اور سات بیٹیوں

کی خیریت جاننے کے لیے ترس رہے ہیں لیکن انہیں کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ وہ جب کھانے پہ بیٹھتے ہیں تو اپنی جیب میں موجود گھڑی نکال کر سامنے میز پہ رکھ لیتے ہیں۔ یہ گھڑی ڈھاکہ کا وقت بتاتی ہے۔ یوں محض گھڑی کی ان سوئیوں کی مدد سے وہ ڈھاکہ میں موجود اپنے خاندان سے قربت کو محسوس کرتے اور اپنی بے بسی کے احساس کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

افسانہ "دکھوں کا ترجمان" کی مسز داس شوہر سے بے وفائی کر کے احساسِ گناہ تلے اس قدر دب چکی ہے کہ جب اسے مسٹر کاپاسی کی صورت میں ایک ایسا شخص دکھائی دیتا ہے جو مریضوں کی ترجمانی کرنے کا ہنر جانتا ہے تو وہ اس کے سامنے اپنا دل کھول کر بیٹھ جاتی ہے۔ سات سالوں سے بے وفائی کے راز کو سینے میں دباتے دباتے اب وہ ٹوٹ چکی ہے اور مسٹر کاپاسی سے اپنے اس روگ کا علاج چاہتی ہے۔ وہ اس بے انت دکھ اور اذیت سے نجات چاہتی ہے جس نے اس کے سارے وجود کو کئی سالوں سے جکڑ رکھا ہے۔ ادھیڑ عمر مسٹر کاپاسی جو اپنی شادی کی گاڑی کو جیسے تیسے گھسیٹ رہا ہے مسز داس کی توجہ اس کے دل و دماغ میں خواہشوں کا ایک جنگل اگا دیتی ہے لیکن جب مسز داس اسے بتاتی ہے کہ وہ اس کی بیٹیوں کی عمر جتنی ہے تو کاپاسی کے ارمانوں پر اس پڑ جاتی ہے۔ مسٹر کاپاسی اور مسز داس دونوں کے اپنے اپنے نفسیاتی دکھ ہیں اور ان دکھوں کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ سمن بالا اس افسانے کے کرداروں کی نفسیاتی کیفیت پہ تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں:

The title story Interpreter of maladies is a narrative that appears to be a pilgrim's progress of a guilt conscious tormented soul. Laden with a woman's pain and guilt the story sets in Orisa and the woman is in search of solace through her soul's pilgrimage to Konark, the place of Sun god.^(۳)

"اصلی دربان" (A real durwan) کی بوڑھی اماں بھی نفسیاتی مسائل کا شکار ہے۔ وہ اپنے تلخ حال کی بجائے خوش کن ماضی میں پناہ لینے کو ترجیح دیتی ہے۔ کثیر منزلہ رہائشی عمارت کے زینے صاف کرتے ہوئے وہ ہجرت سے پہلے کے اس دور کو یاد کرتی رہتی ہے جب عیش و عشرت اس کی زندگی کا حصہ تھے۔ اپنی حالتِ موجود سے فرار حاصل کرنے کے لیے اس نے یادوں کا ایک ایسا جہان آباد کر رکھا ہے جس کا تصور بھی اس کے خیال میں رہائشی عمارت کے ان مکینوں کے لیے محال ہے۔

"سیکسی" کی میرانڈا بھی نفسیاتی الجھاؤ کا شکار ہے۔ اس کی واجبی سی شکل و صورت پہ اس کے ہم عمر لڑکے کم ہی توجہ دیتے ہیں اس لیے وہ ایک ادھیڑ عمر بنگالی مرد کو دل دے بیٹھتی ہے کیونکہ وہ اس کا ہر جگہ خیال رکھتا اور اسے تحفے

تخائف دیتا ہے۔ میرا نڈا دیو کے ساتھ خوابوں کے جس سفر پہ گامزن ہے اس کا انت روہن سے میرا نڈا کی ملاقات کی شکل میں ہوتا ہے۔ سات سالہ روہن کی شکل میں میرا نڈا اس اذیت کو محسوس کرتی ہے جو کسی بے وفامرد کی بیوی اور بچے محسوس کرتے ہیں اور یوں وہ احساسِ ندامت سے مغلوب ہو کر دیو سے دور ہو جاتی ہے۔

"بی بی ہلدار کا علاج" (The treatment of BiBi Haldar) کا مرکزی کردار "بی بی" ایک ایسے نفسیاتی و جسمانی عارضے میں مبتلا ہے جس کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح شادی شدہ زندگی گزارنے کی آرزو مند ہے لیکن اس کا واحد رشتہ دار کزن ہلدار اس کی شادی پہ کوئی خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بی بی بالآخر کسی مرد سے جسمانی تعلق قائم کر کے ایک بچے کی ماں بن جاتی ہے اور اس کا مرض ہمیشہ کے لیے جاتا رہتا ہے۔

جھمپا لہری نے درج بالا کرداروں کے علاوہ مسز سین کے ڈرائیونگ سے خوف، ٹوٹکل کے مسیحی تبرکات اپنی شیلیف پر سجانے کے خط اور مسز کرافٹ کے امریکی پرچم کے چاند پر پہنچنے پر بے جا استعجاب کو بھی نہایت دلچسپ انداز میں بیان کر کے ان کرداروں کے نفسیاتی پہلوؤں کی نہایت ماہرانہ عکاسی کی ہے۔

ج۔ جنسی مسائل سے متعلقہ موضوعات

اس افسانوں مجموعے کے تین افسانوں "دکھوں کا ترجمان"، "سیکسی" اور "بی بی ہلدار کا علاج" میں جھمپا لہری نے کرداروں کی زندگیوں کے جنسی پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ "دکھوں کا ترجمان" داس خاندان کے گرد گھومتی کہانی ہے جو امریکا سے ہندوستان سیاحت کی غرض سے آیا ہوا ہے۔ ان کا سیاحتی گائیڈ ادھیڑ عمر مسٹر کاپاسی انہیں سو ریامندر کے درشن کے لیے کونارک کی طرف اپنی گاڑی میں لے کر سفر کے لیے نکلتا ہے اور اسی سفر میں کہانی آگے بڑھتی اور انجام پذیر ہوتی ہے۔ کہانی کی ابتدا میں ہی ہم جان جاتے ہیں کہ مسٹر اور مسز داس کے درمیان تعلقات محبت کی گرمجوشی سے مکمل طور پر خالی ہیں اور دونوں مجبوریوں کی ڈور سے بندھے ایک دوسرے کے ساتھ جینے پر مجبور ہیں۔ مسز داس جب مسٹر کاپاسی کو اپنے جنسی بے راہ روی کا وہ قصہ سناتی ہے جس کے نتیجے میں اس کا بیٹا بوبی پیدا ہوا تو ہم اس کے اپنی زندگی سے بیزاری اور اپنے شوہر اور بچوں سے بے نیازی کو باآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ مسز داس کی زبانی ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کم عمری کی شادی اور پہلے سال ہی بیٹے کی پیدائش کی صورت میں ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب کر اس کی ساری رومانویت ہوا ہو گئی تھی اور وہ تھکی تھکی بے زار زندگی گزار رہی تھی جب اس کے شوہر کا ایک پنجابی دوست ان کے ہاں چند دن ٹھہرنے کے لیے آیا۔ جانے سے ایک روز قبل جب یہی دوست اس کی طرف بڑھتا ہے تو وہ اسے روک نہیں پاتی اور یوں زندگی سے ناآسودگی اسے ایک نئے جنسی تجربے سے آشنا کرتی ہے۔ شوہر سے اس بے وفائی کی نشانی جب بوبی کی شکل میں دنیا میں آتی ہے تو اس کی زندگی ایک مستقل روگ کا شکار

ہو جاتی ہے۔ وہ احساسِ ندامت کے بوجھ تلے دب جاتی ہے اور آٹھ سال بعد جب کاپاسی کی شکل میں اس کا سامنا ایک ایسے شخص سے ہوتا ہے جو مریضوں کے روگوں کی ترجمانی کرنا جانتا ہے تو وہ اس کو اپنا راز بتا بیٹھتی ہے۔

مسٹر کاپاسی کی اپنی شادی شدہ زندگی بھی نا آسودگی اور جنسی بے اطمینانی کا شکار ہے۔ اس کی بیوی اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتی اور اس کے مریضوں کی ترجمانی والے کام کو نہایت حقیر جانتی ہے اس لیے جب مسز داس اس کے کام کے لیے رومانوی کالِفظ استعمال کرتی ہے تو وہ ایک انجانی خوشی سے سرشار ہو کر اس کی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے۔ گاڑی کے عقبی آئینے میں وہ بار بار مسز داس کو دیکھنے لگتا ہے بالخصوص اس کی نظریں مسز داس کی شرٹ پہ بنی اس سٹر ابری کا بار بار طواف کرنے لگتی ہیں جو سینے کے ابھار پہ بہت نمایاں دکھ رہی ہے۔ مندر کی سیر کرتے ہوئے وہ مسز داس کی برہنہ ٹانگوں سے حظ اٹھاتا ہے اور مندر کی دیواروں پہ بنی برہنہ چھاتی والی مورتیوں کو دیکھ کر اسے یاد آتا ہے کہ اپنی بیوی سے تو ہم بستری کرتے ہوئے بھی اس نے کبھی اس کی چھاتیاں نہیں دیکھیں۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ بت کے سامنے مسز داس کو اپنی بانہوں میں جکڑ لے اور وقت وہیں منجمد ہو جائے۔ مندر سے واپسی پہ مسز داس سے دوری کا خیال اسے افسردہ کر دیتا ہے اور وہ اس ساتھ کو کچھ اور طویل کرنے کے لیے مسٹر داس کو پہاڑی غاروں کی سیر کی تجویز دیتا ہے۔ مسٹر کاپاسی کے ابھرتے جذبات پہ اوس اس وقت پڑتی جب مسز داس اس سے اپنے روگ کا علاج مانگتے ہوئے اسے کہتی ہے کہ وہ تو اس کی بیٹیوں کی عمر کی ہے۔ جھپپانے اس افسانے میں جنسی نا آسودگی اور اس نا آسودگی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی عائلی زندگی کی پیچیدگیوں کو نہایت باریکی سے بیان کیا ہے۔ مسٹر کپاس ان مردوں کی نمائندگی کرتا ہے جو گھر میں اپنی بیوی کی سرد مہری سے بھاگ کر باہر کی عورتوں میں جنسی سکون تلاش کرتے ہیں جب کہ مسز داس ان گھریلو خواتین کی نمائندہ ہے جو اپنی بوریّت زدہ زندگی کی یکسانیت سے اکتا کر کوئی ایسا جنسی تجربہ کر بیٹھتی ہیں جو ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی کا روگ بن جاتا ہے۔ مسز داس اور کاپاسی جن امراض (Maladies) کا شکار ہیں ان کا درماں کسی کے پاس نہیں اس لیے ونود مشرا کہانی کے اختتام پہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"The story 'Interpreter of Maladies' ends leaving many questions behind in the mind of thoughtful readers. It does not provide easy answers. It does not prescribe anything to anyone, rather it describes a domestic situation, and it leaves Mr.Kapasi, the character, and us the readers, to try and be the interpreter of this supposed malady." 0 4

"سیکسی" میں جھمپا لہری نے دو مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے مابین جنسی تعلقات کا جائزہ لیا ہے۔ اس افسانے میں جدید مشینی زندگی میں انسانی رشتوں کے جنس زدہ ہو کر اپنی معنویت کھو جانے کا المیہ نہایت دلہندہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ امریکی معاشرے کی جنسی آزاد روی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہندوستانی مردوں دیو اور لکشمی کی کزن کا شوہر اپنی بیویوں کو چھوڑ کر انگریز عورتوں میں جنسی سکون تلاشتے پھر رہے ہیں جب کہ ان کی گھروں میں بیٹھی روایتی ہندوستانی بیویاں ان کے بے وفائی سے یا تو بے خبر ہیں یا ان کو ہمیشہ کے لیے کھودینے کے خوف سے انہیں ان کے کل گناہوں سمیت معاف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لکشمی کی کزن اپنے شوہر کی بے وفائی کو سمجھ نہیں پا رہی اس لیے سارا سارا دن روتے گزرتی ہے۔ دیو کی بیوی مادھوری ڈکشت کی طرح دکھتی ہے لیکن دیو اسے چھوڑ کر ایک نوجوان امریکی لڑکی سے جنسی تعلقات استوار کیے بیٹھا ہے۔ اس کا میرانڈا سے رشتہ محض جنسی استحصال تک محدود ہے۔ میرانڈا اسے دکھانے کے لیے نیا لباس خریدتی ہے لیکن اسے میرانڈا کے لباس سے کوئی سروکار نہیں وہ محض اس کے جسم کا طلبگار ہے۔ سات سالہ روہن جب میرانڈا کو پارٹی کے لباس میں دیکھ کر سیکسی کہتا ہے تو میرانڈا کو دیو کے یہی الفاظ یاد آ جاتے ہیں جو اس نے میپوریم کے پل پر کھڑے ہو کر کہے تھے۔ میرانڈا جب روہن سے سیکسی کا مطلب پوچھتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس شخص سے محبت کرنا جسے آپ جانتے بھی نہ ہوں۔ یوں روہن کی کیفیت دیکھ کر میرانڈا کو احساسِ پشیمانی گھیر لیتا ہے اور وہ دیو سے دور ہو جاتی ہے۔ اس افسانے کے تین کردار دیو، میرانڈا اور لکشمی کی کزن کا شوہر وقتی جنسی آسودگی کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں لیکن ہر ایک کے پاس اس بے راہ روی کی اپنی وجہ موجود ہے۔ سائنڈرا کا کس اپنے تحقیقی مضمون میں افسانہ "سیکسی" پہ تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"In 'Sexy' and in much of her other fiction, Lahiri asks her readers to consider how the diasporic conditions of these kinds of romantic attachments might demand a radical reconsideration of love, sex and marriage. Lahiri often writes about how affective bonds between men and woman-love, as Rohin puts it- are distinct from familiarity-knowledge, or the lack thereof."^(۷)

"بی بی ہلدار کا علاج" میں جھمپا لہری نے جنسیت کے ایک اور رخ سے پردہ اٹھایا ہے۔ انتیس سالہ بی بی ہسٹیریا کی مریض ہے اس لیے اس کی شادی کے لیے شائع اشتہار کے جواب میں بھی کوئی اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتا۔ اپنے مرض کے باوصف وہ ایک بھرپور عورت ہے اس لیے باقی عورتوں کی طرح وہ بھی مرد کی طلب گار ہے لیکن اس کا یہ خواب شادی کی صورت میں تو پورا نہیں ہوتا تاہم وہ کسی مرد سے جنسی تعلق کے نتیجے میں ایک بچے کی ماں بن کر

ہسٹیریا سے ہمیشہ کے لیے نجات ضرور پالیتی ہے۔ یوں جنسی تعلق اس کے لاعلاج جسمانی اور نفسیاتی عوارض کا علاج بن جاتا ہے اور وہ ایک نارمل زندگی گزارنا شروع کر دیتی ہے۔ اس افسانے میں جھمپا نے جنسی طلب کو ایک ایسی قوت کی صورت میں پیش کیا ہے جو سماجی بندشیں توڑ کر اپنا راستہ تلاش کرنا جانتی ہے۔ "دکھوں کا ترجمان" اور "سیکسی" میں ناجائز جنسی تعلقات کرداروں کی زندگیوں کو ایسی الجھنوں میں مبتلا کر دیتے ہیں جن سے نکلنے کا کوئی راستہ انہیں نہیں سوچتا تاہم "بی بی ہلدار کا علاج" میں ناجائز جنسی تعلق بی بی کی الجھی زندگی کو سلجھانے کا سبب بن جاتا ہے۔ جھمپا نے اول دو افسانوں میں ناجائز جنسی تعلق کو ہنستی بستی عالمی زندگیوں میں زہر گھولتے ہوئے دکھایا ہے تاہم تیسرے افسانے میں یہی جنسی تعلق بی بی ہلدار کی زندگی میں زہر کی بجائے تریاق کا کام کر جاتا ہے۔

د۔ ہجرت سے جڑے مسائل کے متعلقہ موضوعات

جھمپا لہری کے افسانوں اور ناولوں میں ہجرت اور ہجرت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فرد کی شناخت کے مسائل مرکزی موضوعات ہیں۔ ان کے دونوں افسانوی مجموعوں Interpreter of maladies اور The Lowland اور The Namesake کے متعدد افسانوں اور دونوں ناولوں میں زیادہ تر انہی موضوعات پر قلم آرائی کی گئی ہے۔ جھمپا نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے "دکھوں کا ترجمان" (Interpreter of maladies) میں کل ۹ افسانے شامل کیے ہیں جن میں سے ۸ افسانے کسی نہ کسی طرح سے تارکین وطن کی کہانیاں ہیں۔ اس مجموعے کے زیادہ تر کردار دو مختلف لسانی اور ثقافتی دنیاؤں میں جی رہے ہیں۔ مشرق و مغرب کی دو متضاد دنیاؤں میں جینے کے سبب انہیں اپنی شناخت کے پیچیدہ مسائل کا سامنا ہے۔ ان کرداروں کی کہانیاں بنگال سے بو سٹن تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آندر راج اپنے تحقیقی مضمون "Cultural Alienation in Jhumpa Lahiri's short stories" میں کرداروں کے انہی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"Most of the characters in the stories have fluid identities like other contemporary post-colonial literary characters. In most cases they are the citizen of two countries, so their natural and cultural identities are not fixed. They are physically in America but psychologically their minds are in South-Asia. They deal with loneliness of dislocation, cultural displacement and sense of identity and belonging with fine details of both Indian and American culture." ^(۶)

"دکھوں کا ترجمان" میں بالخصوص تین کہانیاں "جدائی"، "مسز سین کا گھر" اور "تیسرا اور آخری برا عظم" عارضی یا مستقل تارکین وطن کے ایک زمین سے کچھڑ کر دوسری دنیا میں بسنے کی داستانیں ہیں۔

"جدائی" میں جھمپا لہری نے پیرزادہ صاحب کے کردار کے ذریعے مشرقی پاکستان میں جنم لینے والے انسانی المیے کی تصویر کشی کی ہے۔ پیرزادہ صاحب اپنے وطن سے دور امریکا میں ایک ریسرچ پراجیکٹ کے سلسلے میں مقیم ہیں اور ان کے شہر ڈھاکہ میں ان کی بیوی اور سات بیٹیاں جنگ کی امڈتی سیاہ گھٹاؤں میں گھری ہوئی ہیں۔ آگ و خون کے طوفان سے بچا کر لوگ مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے بھارت میں پناہ لے رہے ہیں اور پیرزادہ صاحب کے الفاظ میں ان کے لوگوں کو تقسیم ہند کے بعد ایک اور ہجرت کا سامنا ہے۔ جھمپا کی باقی کہانیوں میں مشرق سے مغرب ہجرت کرنے والے معاشی مشکلات سے نجات اور ایک بہتر مستقبل کی تلاش میں اپنی زمینوں کو خیر آباد کہتے ہیں لیکن اس افسانے میں ہجرت اپنی جان و مال اور آبرو بچانے کی غرض سے کی جا رہی ہے۔ یہ افسانہ اپنے وطن میں بے وطنی کا روگ جھیلنے والوں کی درد بھری داستان ہے۔

"مسز سین کا گھر" میں مسز سین اپنے پروفیسر شوہر کے ساتھ امریکا ہجرت کرنے کے باوجود قلبی طور پر ہندوستان میں اپنے گھر سے نہیں نکل پائی۔ وہ رہ رہ کر اپنے گھر والوں کو یاد کرتی ہے اور اسے امریکی معاشرے کی سرد مہری اور بے اعتنائی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ اس نئے اور اجنبی ماحول میں بولائی بولائی پھرتی ہے اور اپنی بہن کے ہاں بیٹی کی پیدائش پہ وہاں موجود نہ ہونے کا دکھ اس کی جان کو کھا رہا ہے۔ مسز سین کا ڈرائیونگ سیکھنے کی کوشش کرنا دراصل نئی سر زمین میں خود کو ڈھالنے کی ایک کاوش ہے جس میں وہ بری طرح ناکام ہوتی ہے اور یوں اس کا امریکا شناسی کا سفر بڑے بے ڈھب انداز میں اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ جھمپا نے اس افسانے میں مسز سین کے کردار کے ذریعے ان نفسیاتی اور سماجی مسائل کا احاطہ کیا ہے جو ایک روایتی ہندوستانی فرد کو مغربی معاشرے میں خود کو ڈھالتے ہوئے پیش آتے ہیں۔ مشرق کے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے سماج سے اٹھ کر مغرب کی اس دنیا میں بسنا جہاں ہر فرد اپنی اپنی دنیا میں لگن اپنے گرد و پیش سے بے نیاز ہے مسز سین جیسے بہت سے لوگوں کے ایک تلخ تجربہ ثابت ہوتا ہے اور نئی زمین سے جڑنے میں ناکامی ان کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بن جاتی ہے۔ مسز سین کے کردار کو بہت سے نقادوں نے خود کو نئے ماحول میں ڈھالنے پر ناکامی کی ایک کلاسک مثال (An epitome of denial for assimilation^(۷)) قرار دیا ہے۔

"تیسرا اور آخری برا عظم" میں فرد ہجرت کے بعد خود کو نئی زمینی شناخت کے ساتھ ڈھالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار واحد متکلم ایک ایسا نوجوان ہے جو پہلے کلکتہ سے لندن اور پھر وہاں سے بو سٹن ہجرت کرتا

ہے۔ کئی ہفتوں تک نئی سرزمین میں اس کی واحد شناسائی اپنی بوڑھی مالک مکان مسز کرافٹ تک محدود رہتی ہے لیکن بیوی کے امریکا آنے کے بعد وہ دھیرے دھیرے خود کو نئے سماج میں ڈھال لیتا ہے۔ افسانے کے آخری حصے میں اب یہ کردار بوڑھا ہو چکا ہے اور اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے وہ حیران ہوتا ہے کہ کبھی یہ سرزمین اس کے لیے اجنبی بھی ہوا کرتی تھی۔ ریٹائرڈ ہونے کے باوجود اس نے اور اس کی بیوی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ واپس ہندوستان نہیں جائیں گے بلکہ اپنا بڑھاپا امریکا میں ہی کاٹیں گے۔ انہیں اگرچہ یہ خدشہ ہے کہ ان کا نوجوان بیٹا جو امریکا ہی میں پیدا ہوا اور یہیں پلا بڑھا اپنی زبان اور تہذیب سے نابلدہ رہ جائے گا اور شاید ان کے مرنے کے بعد وہ کبھی بنگالی نہیں بولے گا اور کبھی چچ کا نٹوں کی بجائے ہاتھوں سے چاول نہیں کھائے گا لیکن وہ یہ قربانی دینے کے لیے بھی تیار ہیں۔ مذکورہ بالا تین افسانوں کے علاوہ "تعطل"، "اصلی دربان" اور "سیکسی" میں بھی کردار ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کے سبب اپنی اصل شناخت سے کٹ کر عارضی سہاروں اور خیالی دنیاؤں کے اسیر ہو کر پر اگندہ حال دکھائے گئے ہیں۔ جھمپا لہری کی زیادہ تر کہانیوں میں کردار ہجرت کے نتیجے میں شناخت کے جس مسئلے سے دوچار دکھائی دیتے ہیں جھمپا خود بھی ان کیفیات سے گزری ہیں۔ منوج کمار اپنے تحقیقی مضمون میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"Her characters struggle hard to adjust themselves in new places, foreign countries and at the same time face the identity crisis. Her stories seem to be semi-autobiographical as she herself could not properly adjust in America. We find a striking similarity between the life of Jhumpa Lahiri and the lives of several others characters of her stories." ^(۸)

ہجرت کے اس جذباتی سفر میں جہاں شناختوں کے مٹنے بننے کا عمل جاری ہے جھمپا ان کرداروں کی جذباتی زندگیوں سے ہمیں نہایت کامیابی سے شناسا کرتی ہیں۔ نقادوں اور محققین نے اس موضوع سے ان کی جذباتی وابستگی کو خود ان کی ذات میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جیسے ایس کویتھا اپنے تحقیقی مضمون "Reading Jhumpa Lahiri's Interpretive of maladies from diaspora perspective" میں یہی نتیجہ اخذ کرتی ہیں:

"The characters in these stories are taken on a voyage to emotional frontiers. The sufferings they undergo resemble that of a diasporic one experienced by Jhumpa Lahiri. More than national, cultural or

religious identity, what men today is an unconditional love which could cure all their ailments. Being a woman of Indian society and having witnessed many maladies, she very well presents some through these stories." ^(۹)

ہ۔ تہذیبی و ثقافتی مسائل کے متعلقہ موضوعات

ہجرت کے نتیجے میں نئی تہذیب و ثقافت سے شناسائی کچھ نئے مسائل کو جنم دینے کا سبب بھی بنتی ہے۔ اس افسانوی مجموعے کے بہت سے کرداروں کو اجنبی سرزمین اور نئی تہذیب و ثقافت میں خود کو ڈھالنے کا چیلنج درپیش ہے۔ اس چیلنج پہ پورے نہ اترنے والوں میں غالباً مسز سین سب سے نمایاں ہیں جب کہ اس میدان میں کامیابی سمیٹنے والوں میں "تیسرا اور آخری برا عظم" کا نوجوان اور اس کی بیوی قابل ذکر ہیں۔

مسز سین بظاہر امریکی معاشرے میں ایک آسودہ حال زندگی گزار رہی ہے۔ بوسٹن کے نواح میں وہ اپنے پروفیسر شوہر کے ساتھ ایک پرسکون علاقے میں رہائش پذیر ہے۔ ہمیں اس کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ آنے سے پہلے ہندوستان میں بھی وہ بہت خوش حال زندگی گزار رہی تھی جہاں اسے خود گاڑی ڈرائیو نہیں کرنی پڑتی تھی بلکہ یہ فریضہ ان کا شو فر سرانجام دیتا تھا۔ وہ جب بھی انڈیا کا ذکر کرتی ہے تو اس کی آنکھیں زندگی کی مسرت سے ہمک اٹھتی ہیں۔ اسے لگتا ہے کہ وہاں سب کچھ تھا اور یہاں یعنی امریکہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے کچھ ایسے جذباتی مسائل کا سامنا ہے جو اس کے امریکی طرز زندگی کو اختیار کرنے میں مسلسل رکاوٹ بن رہے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں ہر وقت خاندان اور آس پڑوس کے لوگ اس کی ہر خوشی اور غم میں شامل ہوتے تھے اسے بے طرح یاد آتے ہیں اور وہ امریکہ آکر یہ سمجھ نہیں پارہی کہ ان سب کے بغیر کوئی کیسے جی سکتا ہے۔ وہ امریکی تہذیب کے اس پہلو کو ہضم نہیں کر پارہی کہ ہر فرد دوسروں کی مدد اور مداخلت کے بغیر ایک آزادانہ زندگی بھی جی سکتا ہے۔ اسی آزادی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسے خود سے گاڑی ڈرائیو کرنی ہے اور کسی دوسرے پر انحصار نہیں کرنا لیکن وہ یہ فن سیکھنے میں بھی بری طرح ناکام ہوتی ہے۔ اس کی ڈرائیونگ سیکھنے میں ناکامی دراصل اس کی امریکی تہذیب و ثقافت کو اختیار کرنے میں ناکامی کا استعارہ ہے۔ مسز سین کی کہانی پر خیال آرائی کرتے ہوئے مینو کماری اپنے تحقیقی مضمون میں رقمطراز ہیں:

“ 'Mrs. Sen' is a story which explores the life of an emigrant Indian through the European point of view. It is an archetypal story of the cultural outsider, but even her plight is offset by the loneliness of little Eliot, her faithful ward for a few hours every day.” ^(۱۰)

مسز سین کی امریکی تہذیب و ثقافت میں ڈھلنے میں اس ناکامی کے مقابلے میں "تیسرا اور آخری برا عظیم" کا واحد متکلم نوجوان اور اس کی بیوی مالائی ثقافت میں کامیابی سے ڈھلنے کی عمدہ مثالیں ہیں۔ مسٹر اور مسز سین کے درمیان ایک لیا دیا سا تعلق قائم ہے جس میں دونوں اپنے اپنے دکھوں اور مسائل سے تنہا نبرد آزما ہیں لیکن نوجوان اور اس کی بیوی ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے نئی دنیا کی دریافت کے سفر پہ نکلتے ہیں اور کامیابی سے خود کو نئے معاشرے میں ڈھال لیتے ہیں۔ تاہم نئی تہذیب و ثقافت میں ڈھلنے کا یہ عمل کئی سالوں پر محیط ہے اس لیے جھمپانے اس کہانی کا دورانیہ بڑا طویل رکھا ہے۔ اجنبی دنیا اور اجنبی تہذیب کو بہ نگاہِ استعجاب دیکھنے سے لے کر خود کو اس میں کلی طور پر ڈھالنے تک کی یہ داستان جہاں ایک طرف صبر، برداشت اور جہد مسلسل کا دلکش بیان ہے وہیں یہ کھلے دل سے نئی حقیقتوں کو تسلیم کرنے کا استعارہ بھی ہے۔ جھمپانے تہذیبی و ثقافتی مسائل کے ہر دو ممکنات کو مسز سین اور نوجوان کے کرداروں کے ذریعے نہایت مہارت سے بیان کیا ہے۔

حوالہ جات

- 1- D. Sumalatha, A study on selected themes of Jhumpa Lahiri's Novels, Research Article, Research Journal of English language and Literature, Volume 1 Issue 4, Oct-Dec 2013, Page 352-358
- 2- Archana Vemra Singh, Fractured marital relationships in Jhumpa Lahiri's Interpreter of maladies and Unaccustomed earth, Research Article, International Journal of Advanced Research (IJAR), June 2017, Article ID 4638
- 3- Suman Bala, Jhumpa Lahiri, The master story teller: A critical response to Interpreter of maladies, Khosla Publishing House, Dehli, 2002, P 182
- 4- Binod Mishra, Interpreting the malady in Jhumpa Lahiri's short stories, Research Article, The Literati, Volume 7, 2017, Page 31-35
- 5- Sandra Cox, Loving someone you don't know: Transculturation, sex and marriage in the fiction of Jhumpa Lahiri and Bharati Mukharjee, Research Article, Postcolonial Interventions, Volume II, Issue 2, June 2017, Page 83-115
- 6- S. Anandh Raj, Cultural Alienation in Jhumpa Lahiri's short stories, Research Article, International Journal of English Language, Literature and Humanities, Volume VI, Issue 1, Jan 2016, Page 450-470
- 7- Jesus Escobar Sevilia, Transnational spaces of identity recognition in Jhumpa Lahiri's Interpreter of maladies, Research Article, Journal of English Studies, Volume 17, 2019, Page 120
- 8- Manoj Kumar, The cultural conflict: An analysis of Jhumpa Lahiri's Interpreter of maladies, Research Article, Journal of English Language and Literature, Volume IV, Issue 4, 2017, Page 274-278

- 9- S. Kavitha, Reading Jhumpa Lahiri's Interpreter of maladies from diaspora perspective, Research Article, Language in India, Volume XIX, Issue 2, February 2019, Pages 232-233
- 10- Meenu Kumari, A diasporic dilemma: Cultural variance in Jhumpa Lahir's Interpreter of maladies, Research Article, International Journal of English Language, Literature and Humanities, Volume I, Issue 5, Feb 2014, Pages 121-128

باب پنجم

افسانوی مجموعے کا فنی جائزہ

متنوع موضوعات کے علاوہ جھمپا لہری کا افسانوی مجموعہ "دکھوں کا ترجمان" فنی اعتبار سے بھی ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ جھمپانے پلاٹ کی بنت، کرداروں کی تخلیق، منظر نگاری، مکالموں اور اسلوب کی تشکیل میں نہایت عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ واقعہ طرازی کرتے ہوئے انہوں نے افسانے کی بنیادی شرط وحدت تاثر کو اس حد تک برقرار رکھا ہے کہ اولین سطر سے لے کر آخری سطر تک کہانی ہمیں اپنے سحر میں جکڑے رکھتی ہے اور اگرچہ بعض افسانے قدرے طویل ہیں لیکن ان کی طوالت قاری کو کہیں کھلتی نہیں۔ ان ۹ افسانوں میں ہمیں کہیں کوئی ایک جملہ یا ایک لفظ بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا جسے ہم زائد یا فالتو قرار دے کر قلم زد کر سکیں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان افسانوں کے پلاٹ گندھے ہوئے، کردار تہ دار اور اسلوب نہایت شستہ ہے۔ فکر و فن کی اسی گہرائی کے سبب اس مجموعے کو منصف شہود پر آتے ہی متعدد ادبی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ ذیل میں ہم "دکھوں کا ترجمان" کا مختصر فنی جائزہ لیتے ہوئے پلاٹ، کرداروں اور اسلوب پر بحث کریں گے۔

الف۔ پلاٹ

پلاٹ افسانے میں پیش کیے گئے واقعات کے ربط و تسلسل کا نام ہے۔ کہانی میں ابتداء، منتہا اور انجام کے درمیان منطقی جوڑ برقرار رکھنا ایک اچھے پلاٹ کی بنیادی شرط ہے۔ افسانے میں پیش کیے گئے واقعات عام زندگی سے لیے جاتے ہیں اس لیے یہ دلچسپ بھی ہو سکتے ہیں اور غیر دلچسپ بھی لیکن ایک چست پلاٹ غیر دلچسپ واقعات کو دلچسپ اور غیر اہم ماجرے کو اہم بنانے کا نام ہے۔ واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے ہم پلاٹ کو دو اقسام سادہ اور پیچیدہ پلاٹ میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول الذکر میں واقعات ایک تسلسل سے بیان کیے جاتے ہیں اور قاری کے لیے آغاز سے انجام تک کہیں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی جب کہ پلاٹ کی آخر الذکر قسم میں واقعات کو آپس میں اس پیچیدگی سے مربوط کیا جاتا ہے کہ افسانے کی ابتدا سے ہی ایک الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے جسے سلجھانے کی چاہ میں قاری متجسس ہو کر اسے آخری سطر تک پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس نوع کے پلاٹ دلچسپی اور تحیر کے زیادہ سامان لیے ہوتے ہیں اسی لیے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ پلاٹ کے اجزائیں اظہار، تضاد، الجھاؤ اور سلجھاؤ وغیرہ اہم ہیں لیکن ان کی تفصیل میں جانا ہمارے موضوع کی بحث سے باہر ہے۔ ہم یہاں چند محققین کی پلاٹ کے متعلق آرا پیش کر کے زیر بحث افسانوی مجموعے میں شامل ۹ افسانوں میں پلاٹ کی تشکیل پر مختصر نظر ڈالیں گے۔

مجنوں گورکھ پوری پلاٹ کی سادہ ترین تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"کسی افسانہ میں جو چیز سب سے پہلے ہمارے ذہن کو اپنی طرف منتقل کرتی ہے وہ چند واقعات ہیں جس پر اس افسانہ کی بنیاد ہوتی ہے۔ ان ہی واقعات کی ترتیب کو ماجرایا پلاٹ کہتے ہیں۔" (۱)

سید وقار عظیم کے خیال میں افسانہ اور پلاٹ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ نہ افسانہ کے بغیر پلاٹ اور نہ پلاٹ کے بغیر افسانہ کوئی وجود رکھ سکتا ہے۔ دونوں کا باہمی رشتہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"افسانہ حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں، ان کے تاثرات، ان تاثرات کی بلندی و پستی، ان کی تبدیلی، حرکت و جمود اور اس قسم کی بہت سی دوسری چیزوں کا ایک ادبی و فنی عکس ہے اور جو واقعہ، تجربہ، خیال یا حس افسانے کی بنیاد بنتا ہے پلاٹ اس واقعے، تجربے، خیال یا حس کو ایک فنی ترتیب دیتا ہے۔ کہانی کی ترتیب میں مناظر، کردار، ان کرداروں کے عمل، ان کے مکالموں اور افسانہ نگار کے نقطہ نظر سے رنگ بھرا جاتا ہے۔ کہانی کا یہ ڈھانچہ اس کا پلاٹ کہلاتا ہے۔" (۲)

ان آرا سے پلاٹ کی تعریف متعین کرنے کے بعد اب ہم زیرِ نظر افسانوں مجموعے کے افسانوں پر ایک ایک کر کے نظر ڈالتے ہیں۔ پہلے افسانے "تعطل" کی ابتدا میں ہی دونوں مرکزی کرداروں شو بھا اور شو کو مار کے تعارف کے بعد ہم ان کی زندگیوں میں پیش آنے والے مرکزی واقعے یعنی چھ ماہ قبل مردہ بچے کی پیدائش اور اس کے نتیجے میں ان کے تعلقات میں در آنے والی سرد مہری اور بے اعتنائی کے بارے میں جانتے ہیں۔ برفانی طوفان سے بچلی کی لائسنوں کا خراب ہونا اور بچلی کی فراہمی میں روزانہ ایک گھنٹے کا تعطل پلاٹ کا دوسرا اہم واقعہ ہے جو ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے اور ان کہی باتیں کہنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پہلی رات وہ دونوں ان ابتدائی ملاقاتوں کو یاد کرتے ہیں جب وہ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوئے تھے، دوسری، تیسری اور چوتھی رات وہ چھوٹے چھوٹے جھوٹے ایک دوسرے کو بتاتے ہیں جو انہوں نے ایک دوسرے سے بولے تھے یا وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو انہوں نے ایک دوسرے سے چھپائے رکھی تھیں۔ چوتھی رات وہ ایک دوسرے سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں اور قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے درمیان سرد مہری کی برف بالآخر پگھل گئی ہے اور وہ دونوں دوبارہ ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔ لیکن پانچویں رات بچلی بحال ہو جاتی ہے اور شو بھا شو کو مار کو بتاتی ہے کہ اس نے الگ رہنے کے ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا ہے اور وہ اسے چھوڑ کر جا رہی ہے اور جواب میں شو کو مار اسے بتاتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بچے کی جنس کے بارے میں جانتا تھا اور اس نے یہ راز شو بھا سے چھپائے رکھا تھا۔ یہ پلاٹ کا نقطہ عروج ہے جہاں پہ دونوں کرداروں کے درمیان جذباتی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ کہانی کے انجام میں دونوں تاریک کمرے میں اکٹھے بیٹھ کر ان

باتوں کو یاد کر کے روتے ہیں جن کا انہیں اس سے پہلے علم نہ تھا۔ کہانی میں ابتدا سے انتہا تک ایک خاص ردھم ہے اور قاری کسی لمحے بھی انجام کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ شوبھا کا شو کو مار کو چھوڑ کر الگ رہنے کا فیصلہ اگرچہ افسانے کا ایک غیر مقبول اور غیر روایتی سا اختتام ہے لیکن یہ دونوں کرداروں کی مجموعی نفسیاتی کیفیت کی بالکل ٹھیک عکاسی کرتے ہوئے عین منطقی دکھائی دیتا ہے۔

"تعطل" کی نسبت دوسرے افسانے "جدائی" کا پلاٹ سادہ ہے۔ ڈھاکہ سے تعلق رکھنے والے باٹنی کے لیکچرر پیر زادہ صاحب ایک تحقیق کے سلسلے میں بو سٹن میں رہائش پذیر ہیں جہاں وہ ایک انڈین فیملی کے گھر ہر شام کو ٹیلی ویژن پر خبریں دیکھنے جاتے ہیں۔ جھمپانے پیر زادہ صاحب کی کیفیات کو انڈین میزبانوں کی دس سالہ لڑکی لیلیا کی زبانی ہم تک پہنچایا ہے۔ جنگ زدہ ڈھاکہ میں گھری پیر زادہ صاحب کی بیوی اور سات بیٹیوں کے لیے ان کی تشویش سارے افسانے کے مجموعی ماحول پہ چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ہالووین پہ لیلیا کا اپنی دوست کے ساتھ ٹرک یا ٹریٹ کھیلنے گھر سے باہر نکلنا پیر زادہ صاحب کو تشویش میں مبتلا کرتا ہے کیونکہ وہ خود اپنی بیٹیوں کے تحفظ کے لیے پریشان ہیں۔ پلاٹ کا نقطہ عروج مشرقی پاکستان میں جنگ کا چھڑنا اور لیلیا کا پیر زادہ صاحب کی دگرگوں حالت کو دیکھ کر ان کے لیے چپکے چپکے دعائیں مانگنا ہے۔ لیکن اس افسانے کا اختتام المیہ کی بجائے طربیہ ہے۔ جنگ کے ختم ہونے پہ پیر زادہ صاحب ڈھاکہ لوٹ جاتے ہیں جہاں سے ان کا خط موصول ہوتا ہے کہ ان کی بیوی اور بیٹیاں خیریت سے ہیں۔ جھمپا نے اس افسانے میں جنگ، ہجرت اور جدائی جیسے موضوعات کو ایک بچے کی نگاہ حیرت سے دیکھ کر نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ کہانی کا پلاٹ اگرچہ سادہ لیکن نہایت چست ہے اور ذیلی واقعات مرکزی قصے کے ساتھ پوری طرح مربوط ہیں۔

ٹائٹل اسٹوری "دکھوں کا ترجمان" کا پلاٹ جھمپا لہری کی خلاق اور فنی مہارت کا ثبوت ہے۔ امریکا سے ہندوستان سیر کی غرض سے آئے ہوئے مسٹر اور مسز داس اور ان کے تین بچے اپنے سیاحتی گائیڈ مسٹر کا پاسی کے ساتھ سوریا مندر کی سیر کے لیے نکلتے ہیں اور گاڑی کی رفتار کے ساتھ کہانی بھی لحظہ بہ لحظہ ایک خاص ردھم سے آگے بڑھتی ہے۔ مسٹر اور مسز داس کے رشتے میں سرد مہری، بے تعلقی اور بے رغبتی افسانے کے ابتدا میں ہی واضح ہو جاتی ہے۔ تاہم پلاٹ میں پہلا اہم موڑ اس وقت آتا ہے جب کا پاسی مسٹر اور مسز داس کو بتاتا ہے کہ وہ ایک ڈاکٹر کے پاس بطور ترجمان کام کرتا ہے۔ بظاہر بوریت کا شکار مسز داس اس میں دلچسپی لینا شروع کرتی ہے اور ادھیڑ عمر کا پاسی کے من میں بھی مسز داس کے لیے جذبات ابھرنے لگتے ہیں۔ افسانے کا نقطہ عروج مسز داس کا کا پاسی کے سامنے یہ اعتراف ہے کہ اس نے آٹھ سال پہلے اپنے شوہر سے بے وفائی کی تھی اور اس کا ایک بیٹا بوبی اسی بے وفائی کی نشانی ہے۔ احساس گناہ کے

بوجھ تلے دبی مسز داس کا پاسی سے اپنے روگ کا علاج چاہتی ہے لیکن کا پاسی ایسے کسی مرض کا کوئی علاج نہیں جانتا۔ مایوس مسز داس بہ نگاہ حقارت مسٹر کا پاسی کو دیکھتے ہوئے گاڑی سے اتر جاتی ہے اور یوں یہ مختصر تعلق اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ افسانے کے اختتام پہ بوبی کا بندروں میں گھر کر زخمی ہونا اور مسٹر کا پاسی کے پتے کا مسز داس کے دستی بیگ میں سے گر کر ہوا میں دور اڑ جانا علامتی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ پلاٹ میں متعدد مقامات پر اتار چڑھاؤ کہانی کے مجموعی ردھم کے ساتھ ایک دلکش کیفیت کو جنم دیتا ہے۔ مرکزی پلاٹ سے جڑی مسٹر کا پاسی کی عائلی زندگی کی کہانی بھی افسانے کی اثر پذیری میں اضافہ کرتی ہے۔ قصے میں بیان کی گئی تمام جزئیات مرکزی کہانی کو آگے بڑھانے اور ایک چست پلاٹ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

چوتھا افسانہ "اصلی دربان" ایک کثیر المنزلہ رہائشی عمارت کے مکینوں کی بے حسی کا قصہ ہے۔ عمارت کے زینے صاف کرنے والی بوڑھی اماں مہاجر ہے اور اکثر اپنے اس ماضی کو یاد کرتی رہتی ہے جس میں اس کے بقول وہ خوش حال زندگی گزار رہی تھی۔ وہ محض دو وقت کی روٹی کے عوض زینوں کی صفائی اور عمارت کی درباری کا کام سرانجام دیتی ہے۔ افسانے کا پہلا اہم موڑ عمارت کی سیڑھیوں پہ واش بیسن کی تنصیب ہے جو عمارت کے ایک نسبتاً خوش حال رہائشی مسٹر دلال اپنے منیجر بننے کی خوشی میں لے آئے ہیں۔ اپنی ناراض بیوی کو رام کرنے کے لیے مسٹر دلال تو شملہ سیر کی غرض سے نکل جاتے ہیں لیکن ان کے پیچھے باقی مکینوں میں اپنی عمارت کو سنوارنے کی ایک دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ مزدوروں کی آمد و رفت سے پریشان بوڑھی اماں اپنا زیادہ وقت عمارت سے باہر شہر کی گلیوں میں گھوم پھر کر گزارتی ہے۔ پلاٹ کا کلائمکس واش بیسن کے چوری ہونے کا قصہ ہے۔ عمارت کے سب رہائشی اس قیمتی سامان کی چوری کے لیے بوڑھی اماں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ اس نے عمارت کی چوکیداری کے فرائض ٹھیک طرح سے انجام نہیں دیے۔ یوں بوڑھی اماں کو جو اس شہر میں بے سہارا ہے عمارت بدر کر دیا جاتا ہے۔ جھمپانے اس سادہ سے پلاٹ کی مدد سے ایک اہم سماجی المیے کو نہایت چابکدستی سے نمایاں کیا ہے۔

پانچویں افسانے "سیکسی" میں جھمپانے میرانڈا کے کردار کے ذریعے دو خاندانوں کی کہانیوں کو آپس میں جوڑ کر نہایت فنکارانہ انداز سے ایک پیچیدہ پلاٹ تشکیل دیا ہے۔ مرکزی پلاٹ دیو اور میرانڈا کا افیر ہے جس کے ساتھ میرانڈا کی دوست لکشمی کے ذریعے اس کی کزن کی کہانی بیان کی گئی۔ لکشمی کی کزن اپنے شوہر کی بے وفائی سے ٹوٹ پھوٹ چکی ہے اور اس کا سات سالہ بیٹا روہن بھی ماں باپ کے رشتے میں اس تناؤ سے بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ افسانے کا پہلا اہم موڑ دیو سے میرانڈا کی ملاقات ہے جہاں سے ان کے درمیان ایک ایسے جنسی تعلق کی بنیاد پڑتی ہے جو میرانڈا کی روہن سے ملاقات پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ روہن سے مل کر میرانڈا کو یہ اندازہ ہوتا ہے ایک بے وفامرد

کی بیوی اور بچے کس کرب سے گزرتے ہیں اور ان کی شخصیت کیسے مسخ ہوتی چلی جاتی ہے۔ افسانے کا نقطہ عروج میرانڈا کا سوئے ہوئے روہن کے سرہانے بیٹھ کر ندامت کے آنسو بہانا ہے۔ افسانے کا انجام نہایت منطقی ہے۔ میرانڈا اپنی غلطی کا احساس ہونے کے بعد شعوری طور پر دیو سے دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ جھمپانے اس افسانے میں مردوں کی بے وفائی اور اس بے وفائی کے نتیجے میں خاندانوں کی شکست و ریخت کو دو کہانیوں کے ذریعے نہایت مہارت سے بیان کیا ہے۔

"مسز سین کا گھر" ہجرت، تنہائی اور جدائی کی کہانی ہے۔ ایلپٹ کی ماں ایک نوکری پیشہ عورت ہے اس لیے اسے دن کو اپنے گیارہ سالہ بیٹھے کی دیکھ بھال کے لیے ایک آیا کی تلاش مسز سین کے گھر لے جاتی ہے۔ مسز سین کا تعلق بنگال سے ہے اور وہ ایک پروفیسر کی بیوی ہے۔ وہ کلکتہ سے اٹھ کر بو سٹن آگئی ہے لیکن اس کا دل پیچھے کہیں اٹکارا گیا ہے۔ اسے امریکی معاشرے کی سرد مہری کھلتی ہے اور وہ ہر دم اپنے گھر اور گھر والوں کو یاد کرتی رہتی ہے۔ اسے ہندوستان سے آنے والے خطوں کا نہایت بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ پلاٹ میں پہلا اہم موڑ اس کی بہن کی طرف سے ملنا والا وہ خط ہے جس میں اس کی بھانجی کی پیدائش کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ یہ خط پا کر وہ بے چین ہو جاتی ہے اور اس کا بس نہیں چلتا کہ وہ اڑ کر کلکتہ پہنچ جائے۔ مسز سین امریکی طرز زندگی میں خود کو ڈھالنے کے لیے ڈرائیونگ سیکھ رہی ہیں لیکن وہ گاڑی کو مرکزی سڑک پہ لانے سے خوفزدہ ہے۔ پلاٹ کا نقطہ عروج مسز سین کا مسٹر سین کی عدم الفرستی کی وجہ سے خود گاڑی لے کر مچھلی لینے نکلنا اور راستے میں ایکسیڈنٹ کر بیٹھنا ہے۔ اگرچہ یہ ایکسیڈنٹ معمولی نوعیت کا ہے لیکن اس نے مسز سین کے ڈرائیونگ سیکھنے کے سفر پہ ہمیشہ کے لیے بریک لگا دی ہے۔ افسانے کے اختتام میں ایلپٹ اب کسی آیا کے بغیر تنہا اپنے گھر میں بیٹھا ہے۔ کہانی کا انجام افسردہ کر دینے والا ہے۔ کہانی کا پلاٹ سادہ لیکن اس کا مجموعی تاثر نہایت زور دار ہے۔

ساتویں افسانے "مبارک گھر" کے پلاٹ کی ابتدا میں ہی ہمیں نئے شادی شدہ جوڑے سنجیو اور ٹوئنگل کے درمیان چھوٹے چھوٹے اختلافات کسی بڑے جھگڑے کا پیش خیمہ دکھائی دیتے ہیں۔ افسانے کا پہلا اہم موڑ سنجیو کا یہ اعلان ہے کہ وہ گھر سے ملنے والے کنواری مریم کے مجسمے کو لان سے اٹھا کر کل کام پہ جاتے ہوئے ساتھ لے جائے گا اور کہیں کوڑے کے ڈھیر پہ پھینک دے گا۔ اس اعلان سے پلاٹ میں دونوں کرداروں کے درمیان پہلی بڑی جھڑپ کی ابتدا ہوتی ہے۔ افسانے کا دوسرا اہم موڑ دونوں کرداروں کے درمیان اس مجسمے کے معاملے پہ ایک وقتی سمجھوتہ ہے جس سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ معاملات سلجھاؤ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ نئے گھر کی پارٹی میں گمٹی سے یسوع مسیح کے نیم تن مجسمے کی دریافت پلاٹ کا نقطہ عروج ہے جہاں کرداروں کے درمیان کشمکش شدید تر ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے لیکن

انجام کار سنجیو اور ٹوٹکل دونوں اپنے اپنے رویوں پر نظر ثانی کرتے ہوئے ایک دوسرے کی خواہشات اور پسند ناپسند کا احترام کرنے لگتے ہیں یوں کہانی کا ایک خوش کن اختتام ہوتا ہے۔

"بی بی ہلدار کا علاج" اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس کے کردار باقی افسانوں کے برعکس تارکین وطن پر مشتمل نہیں۔ کہانی کو جمع متکلم کے صیغے میں بیان کیا گیا ہے اور ابتدا سے انتہا تک کہانی ایک زمانی ترتیب سے آگے بڑھتی ہے۔ بی بی ہلدار ہسٹیریا کے مرض میں مبتلا ہے اور اس کے علاج کے لیے کی گئی سب کوششیں بے کار گئی ہیں۔ بی بی کا ٹھکانہ کثیر منزلہ عمارت کی چھت پر بنا اسٹور روم ہے جہاں وہ سارا دن بیٹھ کر اپنے کزن کی دکان میں بکنے والی چیزوں کی فہرستیں بناتی رہتی ہے۔ پلاٹ میں پہلی کشمکش اس وقت شروع ہوتی ہے جب ایک ڈاکٹر بی بی کی شادی کو اس کے مرض کا علاج تجویز کرتا ہے اور بی بی کا کزن اس کی شادی کے لیے کسی صورت تیار نہیں ہوتا۔ کشمکش کی ایک اور صورت بی بی کے کزن کے ہاں بیٹی کی پیدائش کی صورت میں نکلتی ہے جب بی بی کو مستقلاً فلیٹ سے نکال دیا جاتا ہے اور وہ راتیں بھی اسٹور روم میں کاٹنے لگتی ہے۔ درجنوں فلیٹوں پر مشتمل اس رہائشی عمارت کے مکینوں کا بی بی کے کزن ہلدار کی دکان کا بائیکاٹ اور اس کے نتیجے میں اس کا فلیٹ چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جانا پلاٹ کا کلاٹکس ہے۔ بی بی جواب تنہا رہ گئی ہے اسٹور روم سے نکلنا بند کر دیتی ہے اور ایک روز مکینوں پر انکشاف ہوتا ہے کہ بی بی چار ماہ کی حاملہ ہے۔ کہانی کے اختتام پہ بی بی کو اپنے بچے کے ساتھ ایک نئی اور کامیاب زندگی گزارتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور اس نے اپنے مرض سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پالیا ہے۔ اس افسانے کا پلاٹ قدرے پیچیدہ ہے لیکن کہانی چونکہ ایک ہی مرکزی کردار کے گرد گھومتی ہے اس لیے قاری کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ کہانی کا انجام غیر روایتی اور چونکا دینے والا ہے۔

زیر نظر افسانوی مجموعے کا آخری افسانہ "تیسرا اور آخری برا اعظم" ایک سوانحی قصہ ہے۔ افسانے کا واحد متکلم اپنے ترک وطن کی کہانی سناتا اور ہندوستان سے پہلے یورپ اور پھر امریکا ہجرت کرنے کا قصہ بیان کرتا ہے۔ افسانے کا پہلا اہم موڑ نوجوان کی مالک مکان ایک سو تین سالہ مسز کرافٹ سے ملاقات ہے۔ نوجوان کی بیوی مالا کی امریکا آمد اور پھر مسز کرافٹ سے ملاقات بھی پلاٹ کا ایک اہم حصہ ہے۔ نوجوان اور اس کی بیوی کا کامیابی سے امریکی طرز زندگی کا حصہ بن جانا اور بڑھاپے میں واپس ہندوستان نہ جانے کا فیصلہ اس افسانے کو طربیہ انجام دیتا ہے۔ مسز سین کے برعکس جو خود کو نئی تہذیب میں ڈھالنے میں بری طرح ناکام ہوتی ہے اس افسانے کا مرکزی کردار اور اس کی بیوی نئی دھرتی سے رشتہ جوڑنے میں پوری طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں کے ذریعے جھمپانے تارکین وطن کی دو اقسام کی نشاندہی کی ہے۔

ب۔ کردار نگاری

پلاٹ کے بعد افسانے کا دوسرا لازمی عنصر اس کے کردار ہیں۔ افسانہ بنیادی طور پر کسی نہ کسی کردار کا قصہ ہوتا ہے اس لیے کردار نگاری کو عہدِ جدید میں پلاٹ پر بھی ترجیح دی جانے لگی ہے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ کسی افسانے کی کامیابی و ناکامیابی میں پلاٹ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے یا اس کے کرداروں کو یہ امر بہر حال طے ہے کہ افسانہ اور کردار لازم و ملزوم ہیں۔ افسانوی کرداروں کا حقیقی زندگی سے قریب تر ہونا ان کے کامیاب کردار ہونے کی دلیل مانا جاتا ہے۔ افسانہ نگار اپنے تخلیق کردہ کرداروں کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ ان پہ حقیقی زندگی کے انسان ہونے کا گمان گزرے۔ ناول کی نسبت افسانے کا کینوس چونکہ بہت محدود ہے اس لیے افسانہ نگار کو یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے بہت تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ افسانے میں کرداروں کے چند نمایاں خدوخال پیش کر کے ان کی صورت گری اس انداز سے کی جاتی ہے کہ قاری کا تخیل ان کی مکمل تصویر اپنے خیال کے پردے پر با آسانی تشکیل دے سکے۔ حقیقی زندگی کے انسانوں کی طرح افسانوی کرداروں کی بھی ان گنت اقسام ہیں اور کوئی ایسا معین پیمانہ نہیں جس پہ ہم ہر کردار کو رکھ کر پرکھ سکیں لیکن نقادوں نے کرداروں کو عام طور پر دو گروہوں مثالی، سپاٹ یا جامد اور متحرک، پیچیدہ یا حقیقی میں تقسیم کر کے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ کسی افسانوی کردار کی زندگی ہماری حقیقی زندگی سے قریب تر ہوتے ہوئے بھی اس سے مختلف ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نگہت ریحانہ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"افسانہ زندگی یا زندگی کا نعم البدل نہیں بلکہ زندگی کی صداقت کی بنیاد پر ایک نئی زندگی ایک نئے انسان کی تخلیق ہے جو حقیقی انسانی زندگی سے مماثلت رکھتے ہوئے بھی اس سے مختلف ہے کیونکہ افسانوی کردار کی زندگی کا بیان سیدھے سادھے الفاظ و انداز میں نہیں کیا جاتا بلکہ اس میں فنی خوبیاں پیدا کی جاتی ہیں جس سے کردار کی زندگی حقیقی زندگی سے مختلف نظر آنے لگتی ہے۔" (۳)

ڈاکٹر نجم الہدیٰ بھی اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"یوں تو افسانوی کردار عام انسانی کردار ہی کا کسی نہ کسی اعتبار سے چربہ ہوتا ہے پھر بھی من و عن وہی نہیں ہوتا۔ قصے کی کوئی بھی صنف ہو فن کے تقاضے زندگی کے تقاضوں سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ فن کی بنیاد ہی تخیل پر ہے جب کہ عملی زندگی میں تخیل صرف اعلیٰ سطح پر ملتا ہے اور اس کی حیثیت بھی مستزاد کی ہے بنیاد کی نہیں۔" (۴)

افسانے میں کردار کی صورت گری اور ارتقا ناول کی نسبت ایک مشکل فن ہے کیونکہ افسانے کا کینوس نہایت محدود ہوتا ہے۔ سید وقار عظیم اسی مشکل کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"افسانہ کی فنی تعریف کرتے وقت ایک جگہ جیمز لن نے کہا ہے کہ افسانہ کسی ایک کردار کی زندگی کے سب سے اہم موقع کو ڈرامائی صورت میں مختصر طور پر پیش کرنے کا نام ہے۔ افسانہ کی اس تعریف میں کردار کو جو اہمیت دی گئی ہے اسے غیر ضروری نہیں کہا جاسکتا۔ حقیقت میں افسانہ کا مقصد ہی یہ ہے۔ اس میں ہم ناول کی طرح اپنے پیش کیے ہوئے کردار کی پوری زندگی نہیں دکھا سکتے۔" (۵)

افسانے میں کردار دو طرح سے ارتقا کی طرف بڑھتے ہیں۔ اول تو واقعات کا فطری بہاؤ اور منطقی نتیجہ ان کے رویے کی تشکیل کرتا ہے یا پھر ان کی زندگی میں یکبارگی انقلاب آتا ہے اور ان کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ سید وقار عظیم اس بارے میں خیال آرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"افسانوں میں کرداروں کے جو نمونے پیش کیے جاتے ہیں وہ یا تو ایسے ہوتے ہیں جو واقعات کی ترقی کے ساتھ، ان کے بہاؤ کے ساتھ، ان کے مخصوص اثرات اور نتائج کے ساتھ، نفسیاتی قوتوں کے اثر سے مجبور ہو کر بدلتے رہتے ہیں یا کسی خاص موقع پر یکبارگی بدل جاتے ہیں اور اپنی پرانی فطرت کو قوانین قدرت کے قدموں پر نثار کر کے ایک نئی اور زیادہ بہتر یا بدتر زندگی میں قدم رکھ لیتے ہیں اور افسانہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔" (۶)

جھپٹا لہری کے زیر نظر مجموعے میں ہمیں ان دونوں اقسام کے کرداروں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے کردار حقیقی زندگی سے اس قدر قریب ہیں کہ بعض صورتوں میں افسانہ نگار نے کردار کے ارتقا پر افسانویت کو بھی قربان کرنے سے احتراز نہیں کیا۔ اس افسانوی مجموعے کے بہت سے کرداروں کی تشکیل میں اس قدر خلاقی برتی گئی ہے کہ یہ شاہکار کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور اس قابل ہیں کہ مدتوں ادب کی کتابوں میں یاد رکھے جائیں۔ کسی بھی افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ اس کے تخلیق کردہ کردار قاری کو عام زندگی میں اپنے ارد گرد چلتے پھرتے اور بولتے چالتے نظر آئیں۔ اس افسانوی مجموعے کے بہت سے کردار بھی اس شرط پر پورا اترتے ہیں۔ ذیل میں ہم "دکھوں کا ترجمان" کے مرکزی اور ذیلی کرداروں پر مختصراً نظر ڈالیں گے۔

۱۔ مرکزی کردار

i۔ شو بھا

شو بھا افسانہ "تعطل" کا مرکزی کردار ہے۔ تینتیس سالہ شو بھا پروف ریڈر ہے اور چھ ماہ قبل اپنے پہلے بچے کی موت کے صدمے سے دوچار ہو کر اس نے گھر سے دور رہنے کے لیے زیادہ پر اجیکٹ لینے شروع کر دیے ہیں۔ وہ ذہنی دباؤ اور قلبی اضطراب کا شکار ہو کے اپنے شوہر شو کو مار سے دن بہ دن دور دور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس سانحے سے قبل وہ

ایک بھر پور زندگی جی رہی تھی۔ اسے رنگ برنگے کھانوں کی ڈشیں بنانے، گھر کو اور خود کو سجانے سنوارنے کا شوق تھا لیکن اب اس کی دنیا بدل گئی ہے۔ وہ خود سے، اپنے شوہر اور گھر ہر شے سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ اس نے اپنے شوہر سے الگ جینے کا فیصلہ کر لیا ہے کیونکہ یہ گھر اور شوہر اسے ہر دم مردہ بچے کی یاد دلاتے ہیں لیکن وہ یہ خبر آخر دم تک چھپائے رکھتی ہے۔ بجلی کی فراہمی میں تعطل کے سبب جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہر شام اکٹھے بیٹھ کر کچھ ان کہی باتیں شنیر کرنے کا سلسلہ شروع کرتی ہے تو قاری کو یہ گماں گزرتا ہے کہ شاید وہ اپنے دکھ کے خول سے باہر نکل کر ایک نارمل زندگی کی طرف بڑھ رہی ہے لیکن پانچویں رات وہ شو کو مار پہ یہ انکشاف کرتی ہے کہ اس نے الگ فلیٹ کرائے پر لے لیا ہے اور اب وہ اس سے الگ جینا چاہتی ہے۔ اس کا شوہر انتقاماً اسے یہ بتاتا ہے کہ اسے اپنے مردہ بچے کی جنس کا علم تھا اور آخری رسومات سے قبل اس نے بچے کو سینے سے لگائے رکھا تھا۔ دنوں اندھیرے کمرے میں بیٹھ کر اپنے ان کہے دکھوں کو یاد کر کے رونے لگتے ہیں۔

جھمپا لہری نے اگرچہ اس افسانے کا انجام مبہم رکھا ہے اور قاری یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ شو بھا کی شو کو مار سے یہ علیحدگی عارضی ہے یا مستقل لیکن شو بھا کے کردار میں موجود پختگی اور آزادہ روری اس کے اس فیصلے سے عیاں ہے۔ وہ دکھ اور اذیت کے جال سے نکلنے کے لیے نیا تجربہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ افسانے کی مجموعی فضا یاس اور دکھ سے بھری ہوئی ہے لیکن شو بھا جمود کا شکار نہیں وہ سخت فیصلے لینے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

ii- شو کو مار

پینتیس سالہ شو کو مار پی ایچ ڈی کے لیے اپنا مقالہ لکھ رہا ہے اس لیے اس کا سارا وقت گھر میں گزرتا ہے۔ وہ ابھی تک کوئی ملازمت حاصل نہیں کر پایا اس لیے اس کے دل میں یہ خدشہ موجود ہے کہ شاید اس کی بیوی شو بھا کی نظر میں وہ ایک بے وقعت انسان ہے۔ شو بھا کی طرح اسے بھی اپنے پہلے بچے کی موت کا صدمہ ہے لیکن وہ اس بوجھ تلے دب نہیں گیا بلکہ شو بھا کو بھی اس روگ سے نکالنا چاہتا ہے۔ جب بجلی کے تعطل کے دوران شو بھا یہ تجویز دیتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو وہ باتیں بتائیں جو اس سے پہلے انہوں نے کبھی ایک دوسرے کو نہیں بتائیں تو وہ خوشی خوشی اس کھیل میں شریک ہو جاتا ہے لیکن ہر راز افشا کرنے سے پہلے وہ گھنٹوں سوچتا رہتا ہے کہ شو بھا اس کے بارے میں کیا سوچے گی۔ اسے اپنی بیوی سے محبت ہے لیکن وہ تنہائی اور خاموشی کی گود میں اترتی ہوئی شو بھا کو اس غم سے نجات دلانے کا ہنر نہیں جانتا۔ وہ کم گو اور اندروں میں اور کسی بھی حقیقی سکالر کی طرح عمل سے زیادہ خیالوں کی دنیا میں جینا پسند کرتا ہے۔ جب شو بھا اس سے جدا ہونے کا فیصلہ اسے سناتی ہے تو غم و غصے سے بھر جاتا ہے لیکن اسے روک نہیں پاتا۔ شو کو مار کا کردار حالات سے لڑنے کی بجائے حالات کی رو میں بہہ جانے والا ہے۔ وہ اگرچہ جامد نہیں لیکن عملیت

پسندی سے عاری ہے۔

iii۔ پیر زادہ صاحب

افسانہ "جدائی" کے پیر زادہ صاحب پیشے کے اعتبار سے ڈھاکہ کی ایک یونیورسٹی میں لیکچرار ہیں اور بوسٹن میں ایک ریسرچ سکالرشپ کے نتیجے میں رہائش پذیر ہیں۔ مشرقی پاکستان والوں کے لیے ۱۹۷۱ء کا یہ سال بڑی ابتلا و آزمائش کا سال ہے۔ پیر زادہ صاحب ایک ہندوستانی جوڑے کے گھر ہر شام کھانا کھانے اور خبریں دیکھنے جاتے ہیں جہاں دس سالہ لیلیا ان کی پریشانی کو بھانپ کر ان کے لیے چپکے چپکے دعائیں کرتی ہے۔ پیر زادہ صاحب کی بیوی اور سات بیٹیاں جنگ زدہ ڈھاکہ میں محصور ہیں لیکن وہ اپنے بشرے سے کسی پریشانی کا اظہار نہیں ہونے دیتے۔ وہ خوش لباس، خوش اطوار اور نرم خوانسان ہیں اور انہیں اپنے ارد گرد موجود لوگوں کی فکر لگی رہتی ہے۔ ان کی جیب میں ہر دم ایک گھڑی موجود رہتی ہے جو ڈھاکہ کا وقت بتاتی ہے۔ یوں وہ گھر سے ہزاروں میل دور ہو کر بھی اپنوں کے قریب رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تحمل مزاجی اور بردباری ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف ہیں۔ جھمپا لہری نے ہجرت، جنگ اور جدائی کے دکھوں کو پیر زادہ صاحب کی متین شخصیت میں نہایت کامیابی سے سمو کر پیش کیا ہے۔ پیر زادہ صاحب کے کردار میں افسانویت کی کمی ہے لیکن یہ حقیقی زندگی کے قریب تر ہے۔

iv۔ لیلیا

پیر زادہ صاحب کی اپنوں سے جدائی کی تڑپ کو جھمپانے لیلیا نامی دس سالہ لڑکی کے کردار کے ذریعے پیش کیا ہے۔ کم عمری کے باوجود لیلیا کا مشاہدہ گہرا اور دل محبت اور ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہے۔ اپنی بیوی اور بیٹیوں کے لیے پیر زادہ صاحب کی پریشانی کو بھانپ کر وہ ان کے لیے چپکے چپکے دعائیں کرتی ہے۔ ہالووین کی شام جب وہ اپنی دوست ڈورا کے ساتھ ٹرک یا ٹریٹ کھیلنے گھر سے نکلتی ہے تو پیر زادہ صاحب یوں لڑکیوں کے اکیلے باہر جانے پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ ڈورا جب اس سے پوچھتی ہے کہ یہ آدمی ہمارے لیے اتنا فکر مند کیوں ہے تو لیلیا جواب دیتی ہے کہ اس کی بیٹیاں گم ہو گئی ہیں لیکن جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں لیلیا ایک جاندار کردار ہے جو دوسروں کے احساسات کو سمجھنے اور ان سے محبت و ہمدردی سے پیش آنے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔

v۔ مسز داس

افسانہ "دکھوں کا ترجمان" کی مسز داس آٹھ سال سے ایک راز سینے میں دبائے افیت بھری زندگی گزار رہی ہے۔ اس کا اپنے شوہر اور بچوں سے بظاہر کوئی قلبی رشتہ قائم نہیں۔ وہ زندگی سے بیزار دکھائی دیتی ہے۔ اٹھائیس سال کی کم عمر میں ہی جیسے اس کا دنیا کی ہر شے سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ وہ اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ امریکا سے

ہندوستان سیر کرنے کے لیے آئی ہے لیکن اسے اپنے گرد و پیش سے کوئی خاص دلچسپی دکھائی نہیں دیتی۔ اپنے سیاحتی گائیڈ مسٹر کاپاسی کی یہ بات اسے چونکا دیتی ہے کہ وہ جزوقتی طور پر ایک ڈاکٹر کے پاس مریضوں کی ترجمانی کا کام بھی کرتا ہے۔ چنانچہ موقع پا کر وہ اس سے اپنے روگ کا علاج تجویز کرنے کی درخواست کرتی ہے۔ لیکن اس کا روگ سن کر کاپاسی دنگ رہ جاتا ہے۔ آٹھ سال قبل مسز داس نے ایک کمزور لمحے میں اپنے شوہر سے بے وفائی کی تھی اور اس بے وفائی کا نتیجہ اس کے بیٹے بوبی کی صورت میں ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ وہ دماغی خلفشار کا شکار ہے اور اس اذیت سے نجات چاہتی ہے لیکن مسٹر کاپاسی کے پاس اس کے دکھ کا کوئی علاج نہیں۔ افسانے کے آخر میں جب بوبی بندروں میں گھر کر زخمی ہو جاتا ہے تو مسز داس کی مامتا جاگ اٹھتی ہے۔ یوں افسانے کے شروع میں اپنی اولاد اور شوہر سے بیزاری اور بے نیازی کی جو کیفیت اس پہ چھائی ہوئی تھی وہ قدرے کم ہو جاتی ہے۔ مسز داس زیرِ نظر افسانوی مجموعے کے یادگار کرداروں میں غالباً سب سے نمایاں ہے۔ شادی شدہ زندگی کی پیچیدگیوں، بے وفائی اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے احساسِ ندامت کو جھمپانے نہایت چابکدستی سے مسز داس کے کردار میں سمودیا ہے۔ مسز داس اپنی ذات کے گرد چھائے بے بسی اور اذیت کے خول کو توڑنے کی کوشش کرتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے۔

vi- مسٹر کاپاسی

ادھیڑ عمر مسٹر کاپاسی سیاحتی گائیڈ کے طور پر کام کرتا ہے۔ نوجوانی میں اسے غیر ملکی زبانیں سیکھنے کا شوق تھا اور وہ قوموں کے درمیان ترجمانی کے خواب دیکھا کرتا تھا لیکن وقت کی ستم ظریفی نے اسے ایک ڈاکٹر کے پاس مریضوں کی ترجمانی کے کام پہ مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ یہ دودو نوکریاں کر کے اپنی زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہا ہے۔ اس کی بیوی اسے ایک ناکام انسان سمجھتی ہے اور دونوں کے تعلقات میں سرد مہری اور بے نیازی نمایاں ہے اور دونوں مجبوری کی ڈور سے بندھے ایک دوسرے کو برداشت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ داس خاندان کو سوریا مندر کی سیر کے لیے لے کر جاتے ہوئے جب کاپاسی اپنے مریضوں کی ترجمانی والے کام کا ذکر کرتا ہے تو مسز داس اس میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ مسز داس کی دلچسپی کے پیچھے چھپے راز سے بے خبر کاپاسی اس کی طرف کھنچے لگتا ہے اور اس کے دل و دماغ آرزوؤں کے جال بننے لگتے ہیں۔ لیکن جب مسز داس اپنا اذیت ناک راز اسے بتا کر اس سے کسی علاج کی طالب ہوتی ہے تو وہ دم بخود رہ جاتے ہے۔ اسے کوئی جواب نہیں سو جھتا۔ جھمپا لہری نے کاپاسی کی صورت میں ایسے جنوبی ایشیائی مردوں کی ٹھیک ٹھیک عکاسی کی ہے جو اپنی ناکام عائلی زندگی سے گھبرا کر باہر کی عورتوں میں سہارے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ مسٹر کاپاسی اس افسانوی مجموعے کا نہایت جاندار کردار ہے جو زندگی میں ناکامیوں کے باوجود زندگی سے بھرپور ہے۔

vii- بوڑھی اماں

افسانہ "اصلی دربان" کا مرکزی کردار بوڑھی اماں باتونی اور کسی حد تک سکی خاتون ہے جو ایک رہائشی عمارت کے زینے صاف کرنے کا کام کرتی ہے۔ وہ بٹوارے میں مشرقی بنگال سے ہجرت کر کے کلکتہ آئی ہے اور اب ہر دم اپنے ماضی کو یاد کرتی رہتی ہے جو اس کے بقول بڑا شاندار اور عیش و عشرت سے لبریز تھا۔ عمارت کے مکینوں کا اس کی طرف رویہ اول ہمدردی پر مبنی ہے لیکن جب زینوں سے واش بیسن چوری ہو جاتا ہے تو سب اسی کو الزام دیتے ہیں کہ یہ اس کی لاپرواہی کے سبب ممکن ہوا اور یوں اس کو عمارت سے نکال دیا جاتا ہے۔ بوڑھی اماں کی صورت میں جھمپانے ایک ایسا کردار پیش کیا ہے جو اپنی زمین سے جدا ہو کر اب اجنبی زمینوں میں بھٹکتا پھرتا ہے لیکن کوئی اس کا سچا ہمدرد نہیں۔ بوڑھی اماں محض دو وقت کے روکھے سوکھے کھانے اور سیڑھیوں کے نیچے تنگ و تاریک رہائش کے بدلے نہ صرف چار منزلہ عمارت کی سیڑھیاں دن میں دو مرتبہ صاف کرتی ہے بلکہ وہ عمارت کی چوکیداری کا کام بھی کرتی ہے لیکن کوئی اس کی قدر نہیں کرتا۔ اس کی آواز بہت جاندار، اندازِ بیاں بہت شاندار اور لفظی تصویر کشی بہت کامل ہوتی ہے اور عمارت کے مکین اس کے ماضی کے قصے مشکوک ہونے کے باوجود شوق سے سنتے تھے لیکن افسانے کے آخر میں جب اس پر چوری میں معاونت اور لاپرواہی کا الزام لگایا گیا تو وہ اپنے دفاع میں کچھ کہنے سے قاصر رہی۔ بوڑھی اماں کے توانا کردار میں موجود پیچیدگی اور سماجی بے حسی کو جھمپاہری نے اس افسانے میں نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

viii- میرانڈا

افسانہ "سیکسی" کی بائیس سالہ میرانڈا ایک ادھیڑ عمر شادی شدہ بنگالی مرد دیو کے عشق میں مبتلا ہے جو بیار کے نام پر اس کا جنسی استحصال کر رہا ہے۔ اس کی ہندوستانی دوست لکشمی اپنی اس کزن کے لیے اکثر پریشان رہتی ہے جس کا شوہر کسی انگریز عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر اپنی بیوی بچے کو چھوڑ گیا ہے۔ میرانڈا دیو کے سامنے پہننے کے لیے فینسی لباس خریدتی ہے لیکن دیو کو اس کی شخصیت سے کوئی دلچسپی نہیں وہ محض اس کے جسم کا طالب ہے۔ میرانڈا کی زندگی میں اہم موڑ اس وقت آتا ہے جب لکشمی کی کزن اپنے بیٹے کے ساتھ لکشمی سے ملنے آتی ہے اور لکشمی کی درخواست پر میرانڈا کو ایک دن سات سالہ روہن کو دیکھ بھال کی غرض سے اپنے گھر ٹھہرانا پڑتا ہے۔ روہن کی شخصیت پہ اس کے باپ کی بے وفائی کی گہری چھاپ دیکھ کر میرانڈا کو احساسِ ندامت گھیر لیتا ہے اور وہ دیو سے دور ہو جاتی ہے۔ جھمپاہری نے میرانڈا کی صورت میں ایک بھولی بھالی، کم عمر اور نا سمجھ لڑکی کے جنسی، ذہنی اور نفسیاتی پختگی

کے سفر کو نہایت کامیابی سے پیش کیا ہے۔ کردار کی سوچ اور عمل میں رفتہ رفتہ ارتقا آتا ہے اور وہ خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی تلخ دنیا میں قدم رکھتی ہے۔

ix- مسز سین

مسز سین ایک روایتی ہندوستانی عورت ہے جو ایک خوشحال خاندان میں پل بڑھ کر بڑی ہوئی اور اب شادی کے بعد اپنے پروفیسر شوہر کے ساتھ امریکا ہجرت کر آئی ہے۔ وقت گزاری کے لیے وہ ایک امریکی لڑکے ایلپٹ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اٹھاتی ہے۔ مسز سین کے لیے دو چیزیں خوشی کا پیغام لے کر آتی ہیں۔ ایک ہندوستان سے آنے والا خط اور دوسرا تازہ مچھلی کی دستیابی کا سندیسہ جو اسے کلکتہ کی یاد دلاتا ہے جہاں وہ دن میں دو وقت مچھلی کھایا کرتے تھے۔ مسز سین امریکی معاشرے کی سرد مہری سے پریشان رہتی ہے اور وہ ہر دم اپنے ہندوستان کے گھر کی یاد میں آہیں بھرتی رہتی ہے۔ امریکی طرز زندگی اپنانے کے لیے اسے ڈرائیونگ سیکھنے کا مشکل مرحلہ درپیش ہے لیکن وہ کوشش کے باوجود اس میں ناکام رہتی ہے اور ایک روز ایکسیڈنٹ کر بیٹھتی ہے۔ مسز سین کا کردار ماضی پرستی کا شکار اور نئے چیلنجز سے نبٹنے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ مسز سین اگرچہ خود کو بدلنے کی کوشش کرتی ہے لیکن چھوٹی سی ناکامی کے بعد ہی دلبرداشتہ ہو کر بیٹھ جاتی ہے اور ایلپٹ کی دیکھ بھال سے بھی دست بردار ہو جاتی ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں مسز سین ان سب افراد کی نمائندگی کرتی ہے جو خود کو نئے ماحول میں ڈھالنے کی صلاحیت سے تہی ہوتے ہیں۔

x- ٹوئکل

"مبارک گھر" کی ٹوئکل شادی کے چار ماہ بعد نئے گھر میں اپنے شوہر کے ساتھ منتقل ہوئی ہے جہاں اسے گھر کے کونوں کھدروں میں سابق مکینوں کے چھوڑے ہوئے مسیحی تبرکات ملنے لگتے ہیں جنہیں وہ بہت شوق سے اپنے لونگ روم کے شیلف پہ سجا دیتی ہے لیکن اس کا شوہر سنجیو اس کی اس حرکت سے خوش نہیں چنانچہ دونوں کے درمیان وقتاً فوقتاً لفظی جھڑپیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ٹوئکل ایک آزاد منش، جذباتی اور من موبجی لڑکی ہے۔ اس کے شوہر کو اپنے متوسط قد کے باعث ٹوئکل کا اونچی ایڑی والے جوتے پہننا اچھا نہیں لگتا لیکن وہ اس کی قطعاً پروا نہیں کرتی۔ اس کا احساس جمال نہایت عمدہ ہے اسی لیے وہ یسوع مسیح اور کنواری مریم کے مجسموں اور مورتیوں میں چھپے ہوئے حسن سے مسحور ہو جاتی ہے اور ان کی تحسین میں اپنے ہندو مذہب کو حائل نہیں ہونے دیتی۔ نئے گھر کے لیے منعقدہ پارٹی کے دوران وہ سارے ماحول پہ چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور گمٹی کی تلاش کے دوران یسوع مسیح کے مجسمے کی دریافت اسے جوش و جذبے سے بھر دیتی ہے۔ ٹوئکل کے شوخ و شنگ اور قدرے خود سر کردار میں کسی تبدیلی کے امکان کی گنجائش کم ہی ہے لیکن افسانے کے آخر میں وہ اپنے شوہر سنجیو کو بتاتی ہے کہ اب اسے اونچی ایڑی والے جوتوں سے

کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ یوں کردار میں ایک نمایاں ارتقائی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ "مبارک گھر" اپنے موضوع کے اچھوتے پن اور ٹوٹکھل کے جاندار کردار کی وجہ سے ایک یادگار افسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

xi۔ بی بی ہلدار

افسانہ "بی بی ہلدار کا علاج" کا مرکزی کردار بی بی ہلدار ایک ایسے پر اسرار مرض میں مبتلا ہے جس کا علاج کسی حکیم، ڈاکٹر یا پنڈت کے پاس موجود نہیں۔ اس کو وقت بے وقت پڑنے والے دوروں نے اس کی دنیا کو محض چھت پہ بنے اسٹور روم تک محدود کر دیا ہے لیکن وہ حوصلہ نہیں ہارتی اور جب ایک ڈاکٹر اس کے لیے شادی کو بطور علاج تجویز کرتا ہے تو وہ تگ و دو شروع کر دیتی ہے اور اپنے کزن ہلدار سے اپنی شادی کا مقدمہ خوب لڑتی ہے۔ اس سے شادی کے لیے تو کوئی لڑکا آگے نہیں بڑھتا تاہم وہ کسی سے جسمانی تعلق قائم کر کے حاملہ ہو جاتی ہے اور ایک بچے کی ماں بن کر اپنے مرض سے بظاہر ہمیشہ کے لیے نجات پالیتی ہے۔ بی بی اپنے مرض کے باوجود برے حالات میں حوصلہ نہیں ہارتی اور جب اس کا کزن اسے بے گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو وہ تنکا تنکا کر کے اپنا گھونسلانا شروع کرتی ہے۔ بی بی کا کردار اس افسانوی مجموعے کے توانا ترین کرداروں میں شامل ہے۔ یہ ایک متحرک کردار ہے جو افسانے کی ابتدا سے لے کر انتہا تک مسلسل ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔

xii۔ افسانہ "تیسرا اور آخری برا عظم" کا نوجوان

"تیسرا اور آخری برا عظم" ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو تلاش معاش میں پہلے کلکتہ سے لندن اور پھر وہاں سے امریکی ریاست میسی چیوسٹ کے علاقے کیمبرج میں پہنچتا ہے۔ نئی زمین، نئی تہذیب و ثقافت، نیا طرز زندگی اور نئے سلیقے اختیار کرنے میں اسے کچھ عرصے تک مشکلات پیش آتی ہیں تاہم جلد ہی وہ خود کو نئے ماحول میں ڈھالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ افسانے کا دورانیہ تین دہائیوں پر محیط ہے اور بڑھاپے میں یہی نوجوان اپنی بیوی مالا اور اپنے جواں سال بیٹے کے ساتھ ایک خوشحال زندگی گزارتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ زندگی کی مشکلات سے خندہ پیشانی سے نبرد آزما، دم بہ دم آگے بڑھتا یہ کردار اپنے اندر تحیر یا تجسس کے کوئی سامان تو نہیں رکھتا تاہم یہ حقیقی زندگی کے قریب تر ہے اور ان ہزاروں بلکہ لاکھوں تارکین وطن کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی زمین کو چھوڑ کر انجانی دنیاؤں میں اپنا مقدر تلاش کرنے کے لیے نکلتے ہیں اور سب کٹھنائیوں کے باوجود کامیاب ٹھہرتے ہیں۔

۲۔ ثانوی و ذیلی کردار

کہانی کی تشکیل میں مرکزی کرداروں کے ساتھ ساتھ ثانوی اور ذیلی کرداروں کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ زیرِ نظر افسانوی مجموعے میں درج بالا مرکزی کرداروں کے علاوہ درجنوں ثانوی کردار بھی شامل ہیں جن میں سے چند اہم

کرداروں کا ذیل میں طائرانہ جائزہ لیا گیا ہے۔

i۔ مسٹر داس

افسانہ "دکھوں کا ترجمان" کے مرکزی کرداروں مسز داس اور مسٹر کاپاسی کے علاوہ مسٹر داس بھی اس افسانے کا نمایاں کردار ہے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ایک مڈل اسکول میں سائنس کا استاد ہے۔ سوریامندر کی سیر کو جاتے ہوئے رستے میں اس کا اپنی بیوی اور بچوں کے متعلق رویہ غیر ذمہ دارانہ اور لاپرواہی پر مبنی ہے۔ وہ یا تو سیاہی کتاب میں گم رہتا ہے یا پھر اپنے کیمرے سے کھلتا رہتا ہے۔ بیوی کی بے وفائی سے بے خبر وہ اپنی دنیا میں گم ہے۔ افسانے میں ابتدا سے انتہا تک اس کے رویے میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک سپاٹ یا جامد کردار ہے۔

ii۔ مسز دلال

"اصلی دربان" کی مسز دلال کو بوڑھی اماں سے سچی ہمدردی ہے چنانچہ جب وہ دیکھتی ہے کہ بوڑھی اماں کی دلائی گھس گھس کر اب استعمال کے قابل نہیں رہی تو وہ اسے نئی دلائی اور کمبل دلانے کا وعدہ کرتی ہے۔ اس کی اپنی عائلی زندگی مشکلات کا شکار ہے۔ شوہر نے شادی کے وقت اس سے جو وعدے کیے تھے وہ پورے نہ کر سکا چنانچہ مسز دلال اب جھنجھلاہٹ کا شکار ہے۔ جب مسٹر دلال اپنے مینیجر بننے کی خوشی میں دو واش بیسن خرید کر لاتا ہے تو وہ اپنے شوہر سے سخت جھگڑا کرتی اور اسے سخت سست کہتی ہے۔ بالآخر مسٹر دلال اسے کشمیری شال کے تحفے اور دس دنوں کے لیے شملہ کی سیر کے ذریعے رام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس افسانے میں جھمپانے مسز دلال کی بوڑھی اماں کے لیے ہمدردی کے ذریعے عمارت کے باقی مکینوں کی اجتماعی بے حسی کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

iii۔ لکشمی

افسانہ "سیکسی" کی لکشمی مرکزی کردار میرانڈا کی دوست ہے۔ وہ ہر وقت فون پہ اپنی اس کزن کو تسلیاں دیتی رہتی ہے جس کا شوہر کسی انگریز عورت کے لیے اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اپنے شوہر کے ساتھ لکشمی کے تعلقات مثالی ہیں۔ اس نے اپنے کیوبیکل میں اپنی اور شوہر کی تاج محل کے سامنے کھنچوائی گئی تصویر لگا رکھی ہے۔ لکشمی کے دل میں اپنی کزن کے لیے سچی ہمدردی ہے چنانچہ وہ اسے چند دن اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دیتی ہے تاکہ وہ شوہر کی بے وفائی کا غم غلط کر سکے۔

iv۔ دیو

ادیٹر عمر دیو شادی شدہ ہے اور بائیس سال میرانڈا کو محبت کے جال میں پھانس کر اس سے جنسی حظ اٹھانے کے علاوہ اسے میرانڈا کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ میرانڈا کے بدن کی طلب میں اس کے لطیف جذبات سے بے خبر ہے۔

اس کی بیوی جب ہندوستان سے واپس امریکا پہنچتی ہے تو اس کا میرانڈا سے ملنا مشکل ہو جاتا ہے تاہم وہ ویک اینڈ پہ جاگنگ کے بہانے گھر سے نکل کر میرانڈا کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس کی بیوی مادھوری ڈکشت کی طرح خوبصورت ہے لیکن بیوی کی یہ خوبصورتی بھی اسے بے وفائی سے روک نہیں پاتی۔ افسانے کے اختتام پر جب میرانڈا اس سے دور ہوتی ہے تو وہ کوئی احتجاج نہیں کرتا۔ یوں لگتا ہے جیسے میرانڈا کا ملنا یا نہ ملنا اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

v- روہن

سات سالہ روہن لکشمی کی کزن کا بیٹا ہے جسے ملکوں کے نام، جغرافیے اور دارالحکومتوں کے نام یاد کرنے کا شوق ہے۔ اس کا باپ کسی انگریز عورت کی زلف کا اسیر ہو کر گھر چھوڑ گیا ہے اور روہن کی شخصیت پر اس واقعے کا گہرا اثر پڑا ہے۔ دکھ اور کرب سے لڑتی اپنی ماں کو دیکھ دیکھ کر وہ وقت سے پہلے بڑا ہو گیا ہے اور اس کے چہرے پہ ہمہ وقت ایک ایسی سنجیدگی چھائی رہتی ہے جو اس کی عمر سے مطابقت نہیں رکھتی۔ جھپانے روہن کے کردار کے ذریعے عالمی تنازعات کا شکار گھروں کے بچوں کی بہت المناک تصویر کشی ہے۔

vi- ایلین

گیارہ سالہ ایلین کے ماں باپ میں علیحدگی ہو چکی ہے اس لیے اسے دن کے وقت کسی آیا کی ضرورت ہے جو اس کی ماں کی عدم موجودگی میں اس کی دیکھ بھال کرے۔ مسز سین کے بطور آیا اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد وہ خوش ہے کیوں کہ اسے گھر میں اب اکیلا نہیں رہنا پڑتا۔ ایلین کا مشاہدہ بہت گہرا ہے وہ مسز سین کے ڈرائیونگ سے خوف کو جلد ہی بھانپ جاتا ہے۔ مسز سین جب اپنے دادا کی وفات کی خبر سے کچھ روز گم سم رہ کر ایلین کا خیال رکھنا قدرے کم کر دیتی ہیں تو بھی وہ ماں کے بار بار سوال پر بھی کوئی شکایت نہیں کرتا۔ یوں لگتا ہے جیسے کم عمری میں ہی اس کے اندر ایک سمجھدار انسان چھپا بیٹھا ہے جو مسز سین کے اپنے وطن اور لوگوں سے دوری کے دکھ کو محسوس کر سکتا ہے۔

vii- مسز کرافٹ

افسانہ "تیسرا اور آخری برا عظم" کی ایک سو تین سالہ مسز کرافٹ ایک سخت گیر، روایت پرست اور با اصول خاتون ہے۔ وہ اپنے گھر صرف ہارورڈ یا ایم آئی ٹی کے لڑکوں کو کمرہ کرائے پر دیتی ہے کیونکہ اس کے خیال میں یہ لوگ زیادہ مہذب ہوتے ہیں۔ ہندوستانی نوجوان اسے ہمیشہ گھر میں سیڑھیوں کے ساتھ ایک بیچ پر بیٹھے دیکھتا ہے۔ امریکہ کے چاند پر قدم رکھنے اور امریکی پرچم لہرانے کے خیال سے وہ ہمیشہ مسحور رہتی ہے اور اس کی خواہش ہے کہ نوجوان بھی اس کے اس تحریر میں شریک ہو۔ اس کی بیٹی اگرچہ خود بھی بوڑھی ہو چکی ہے لیکن وہ پھر بھی بیٹی کا نوجوان کے ساتھ

تنہائی میں گفتگو کرنا پسند نہیں کرتی۔ نوجوان جب اپنی بیوی کو لے کر اس سے ملنے آتا ہے تو وہ صاحبِ فراش ہے کیونکہ بیچ سے گر کر اس کے کوہے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے لیکن اس کے مزاج میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ مسز کرافٹ کی صورت میں جھمپانے ایک قدامت پسند امریکی عورت کا نقشہ پیش کیا ہے جو اپنی سخت گیری کے باوجود ایک نرم دل رکھتی ہے۔

ج۔ اسلوب

افسانے کے اجزائے ترکیبی میں اسلوب ایک نہایت اہم جزو ہے۔ اسلوب یا اسٹائل وہ خاص اندازِ نگارش ہے جو ایک لکھنے والے کو دوسرے لکھنے والوں سے جدا کرتا ہے۔ کسی بھی فنکار کی تخلیقات کا ایک سرسری جائزہ ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہوتا ہے کہ اس کا منفرد اسلوبِ نگارش کیا ہے۔ کسی ادبی فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے اس کے اسلوب کا جائزہ لیا جانا گزیر ہے کیونکہ ادیب کے فن کا اظہار اس کے اسلوب سے ہی ہوتا ہے۔ کسی ادیب کے اسلوب کا تعین کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے طریقہ اظہار کو پرکھا جائے۔ الفاظ کا دروبست، تراکیب، محاوروں و ضرب المثال کا بر محل استعمال، جملوں کی بناوٹ اور ملاپ، صنائع بدائع کا کم یا زیادہ ہونا وغیرہ وہ بنیادی پیمانے ہیں جن پر اسلوب کو جانچا جاتا ہے۔

اسلوب کی تعریف کے ضمن میں یہاں چند اہل علم کی رائے پیش کرنا بے جا نہ ہو گا۔ سید عابد علی عابد اپنی کتاب "اسلوب" میں بنیادی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرزِ نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے تمیز ہو جاتا ہے۔ اس انفرادیت میں بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں۔" (۷)

وہ آگے چل کر اسلوب کے بارے میں پروفیسر مرے کی رائے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب انشاء پر داز واحد متکلم میں بات کرے تو یہ دیکھیے کہ اس نے اپنے سلسلہء فکر کو کس طرح پیش کیا، اپنے الفاظ اور تراکیب کی کیا صورت تراشی۔ جب ناول یا افسانے کا ذکر ہو تو آپ پہلے اس کے اظہار کے خصائص اور ابلاغ کی صفات پر غور کرتے ہیں، پھر اس کی بصیرت اس کے الفاظ کا سراغ لگاتے ہیں۔" (۸)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے خیال میں ہمارے ہاں اسلوب کا لفظ نیا ہو سکتا ہے لیکن اس کا تصور قدیم ہے۔ وہ اپنی کتاب "ادبی تنقید اور اسلوبیات" میں فرماتے ہیں:

اسلوب (Style) کوئی نیا لفظ نہیں ہے۔ مغربی تنقید میں یہ لفظ صدیوں سے رائج رہا ہے۔ اردو میں اسلوب کا تصور نسبتاً نیا ہے تاہم "زبان و بیان"، "انداز"، "اندازِ بیاں"، "طرزِ بیاں"، "طرزِ تحریر"، "لہجہ"،

"رنگ"، "رنگِ سخن" وغیرہ اصطلاحیں اسلوب یا اس سے ملتے جلتے معنی میں استعمال کی جاتی رہی ہیں یعنی کسی بھی شاعر یا مصنف کے اندازِ بیاں کے خصائص کیا ہیں، یا کسی صنف یا ہیئت میں کس طرح کی زبان استعمال ہوتی ہے یا کسی عہد میں زبان کیسی تھی اور اس کے خصائص کیا تھے وغیرہ یہ سب اسلوب کے مباحث ہیں۔^(۹)

پروفیسر قمر رئیس اسلوب کو صرف الفاظ کا گورکھ دھندہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک منفرد لسانی تہذیبی اور جمالیاتی عمل قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں:

"یہ سوال کہ اسلوب یا نثری اسلوب صرف الفاظ کی حسن کارانہ ترتیب سے وجود میں آتا ہے یا اس کے پیچھے خیال، فکر یا نظریہ کی کار فرمائی بھی ہوتی ہے، اتنا پیچیدہ نہیں جتنا ہیئت پرستوں یا نام نہاد جدیدیوں نے اسے بنا دیا ہے۔ اسلوب صرف الفاظ کا گورکھ دھندہ نہیں ہوتا، نہ وہ آسمان سے وارد ہوتا ہے نہ لاشعور کی تہوں سے نکلتا ہے، وہ ایک خود آگاہ شخصیت کی خواہش ترسیل کا ثمرہ ہوتا ہے۔" ^(۱۰)

اگرچہ اسلوب ایک شخصی چیز ہے اور کوئی بھی دو لکھنے والے ایک جیسا طرزِ اسلوب نہیں رکھ سکتے تاہم نقادوں نے صاحب طرز ادیبوں کی تخلیقات کا جائزہ لینے کے بعد اعلیٰ اسلوب کی کچھ ایسی صفات کا تعین کیا ہے جو اسے منفرد بناتی ہیں۔ اسلوب میں اول سادگی و سلاست، اختصار اور فصاحت و بلاغت وہ بنیادی ڈھانچہ ہے جس پہ باقی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ زورِ بیان، سوز و گداز، مزاح اور بذلہ سخی قاری کو اسلوب سے قلبی رشتہ قائم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ تجسیم کاری، تخیل آرائی، خیال افروزی، علامتوں اور تشبیہات و استعارات سے امیجری کی تشکیل اسلوب کو ٹھوس بنیادیں فراہم کرتی ہے اور ترنم، تکرار اور نغمگی کے ذریعے ایک منفرد آہنگ ترتیب دیا جاتا ہے جس سے پڑھنے یا سننے والے پر اثر دیر پار ہے۔ لیکن اس امر میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ان سب معیارات کے باوجود ہم حتمی طور پر کسی تخلیق کے بارے میں یہ رائے نہیں دے سکتے کہ اس کا اسلوب نگارش عمدہ ہے۔ اسلوب کے بارے میں پروفیسر شمیم حنفی کی یہ رائے غالباً حرفِ آخر ہے:

"تجربے اور تصورات مشترک ہو سکتے ہیں مگر اسلوب کو ایک انفرادی اور شخصی ملکیت کہا جاتا ہے۔ ہم خیالات تو کسی دوسرے سے مستعار لے سکتے ہیں لیکن کسی کا اسلوب اختیار نہیں کر سکتے تاوقتیکہ میلان جعل سازی کی طرف نہ ہو۔ اس طرح اسلوب کا ہر مطالعہ دراصل شخصی اور انفرادی استعداد کا مطالعہ ہوتا ہے۔ چونکہ لسانی صداقت ہی ادب پارے کی بنیادی یا پہلی اور آخری صداقت ہوتی ہے اس لیے اسلوب سے بے نیاز رہ کر ہم کسی ادب پارے کا مطالعہ کر ہی نہیں سکتے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ سچا تخلیقی اسلوب صرف لفظوں اور اصوات کا مجموعہ نہیں بلکہ ہر بڑے اور منفرد اسلوب کے پیچھے تجربے اور

تصور کی ایک پوری دنیا آباد ہوتی ہے۔" (۱۱)

جھمپا لہری کے اسلوب کے پس پردہ بھی تجربے اور تصور کی ایک دلکش دنیا آباد ہے۔ جھمپا کے افسانوں میں سوز و گداز، محاکات یعنی امیجری، مزاح، جذباتیت اور سادگی وغیرہ کے نمونے جابجا بکھرے ملتے ہیں۔ جھمپا اپنے افسانوں کی ابتداء عام طور پر ایسے جملوں سے کرتی ہیں جو کہانی کے موڈ کا تعین کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے ابتدائی جملے کہانی کی مجموعی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ مثلاً پہلا افسانہ "تعطل" (A temporary matter) یوں شروع ہوتا ہے:

"The notice informed them that it was a temporary matter: for five days their electricity would be cut off for one hour, beginning at 8 P.M." (۱۲)

"انہیں ایک نوٹس کے ذریعے پتہ چلا کہ یہ ایک عارضی تعطل ہے۔ روزانہ شام آٹھ بجے ایک گھنٹے کے لیے بجلی کو بند ہونا تھا اور یہ سلسلہ آنے والے پانچ دنوں تک جاری رہتا۔"

قاری بجلی کی فراہمی میں اس تعطل اور افسانے کے عنوان میں ربط کی تلاش ابتدائی سطور سے ہی شروع کر دیتا ہے۔ افسانہ "دکھوں کا ترجمان" (Interpreter of maladies) میں بھی ابتدائی سطور دونوں مرکزی کرداروں کے درمیان سرد مہری اور بے اعتنائی کو واضح کرتے ہوئے افسانے کے مجموعی ردھم کا تعین کرتی ہیں:

"At the tea stall Mr. and Mrs. Das bickered about who should take Tina to the toilet. Eventually Mrs. Das relented when Mr. Das pointed out that he had given the girl her bath the night before." (۱۳)

"چائے کے اسٹال پہ مسٹر داس اور اس کی بیگم میں اس بات پہ تکرار جاری تھی کہ ٹینا کو ٹائلٹ کون لے کر جائے گا۔ آخر کار جب مسٹر داس نے یاد دلایا کہ اس نے لڑکی کو پچھلی رات نہلایا بھی تھا تو مسز داس نے گویا ہار مان لی۔"

افسانہ "مبارک گھر" (This blessed house) کی ابتدا بھی چونکا دینے والی ہے۔ کہانی کے ابتدائی چند الفاظ سے ہی قاری پہ یہ منکشف ہو جاتا ہے کہ یہ افسانوں کچھ غیر معمولی دریافتوں کے متعلق ہے:

"They discovered the first one in a cupboard above the stove, beside an unopened bottle of malt vinegar. "Guess what I found." Twinkle walked into the living room, lined from end to end with tapped up packaging boxes, waving the vinegar in one hand and

a white porcelain effigy of Christ, roughly the same size as the vinegar bottle, in the other."^(۱۴)

"نئے گھر میں انہیں پہلی دفعہ ایسی کوئی چیز انگلیٹھی کے اوپر بنی الماری میں سر کے کی بند بوتل کے ساتھ پڑی ملی۔" دیکھو تو مجھے کیا ملا ہے؟" ٹوٹکل نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا جہاں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک سامان کے بند ڈبے قطار میں پڑے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں جو کے سر کے کی بوتل اور دوسرے میں لگ بھگ اسی جسامت جتنی چینی مٹی سے بنی یسوع مسیح کی سفید مورت تھی۔"

ابتدائی سطور میں ہی افسانے کا نچوڑ بیان کر دینے کا اسلوب "بی بی ہلدار کا علاج" (The treatment of BiBi Haldar) میں بھی نمایاں ہے:

"For the greater number of her twenty nine years, BiBi Haldar suffered from an ailment that baffled family, friends, priests, palmists, spinsters, gem therapists, prophets and fools."^(۱۵)

"اپنی انتیس سالہ زندگی کا بڑا حصہ بی بی ہلدار نے ایک ایسے مرض سے لڑتے ہوئے گزارا تھا جس نے اس کے خاندان اور عزیز واقارب کے ساتھ ساتھ پروہتوں، جوتشیوں، دست شناسوں، نگ شناسوں، رمالوں، سیانے حکیموں اور سادہ لوح قصبے والوں کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔"

اسی طرح آخری افسانے "تیسرا اور آخری برا عظم" کی پہلی سطر پڑھ کر ہی قاری سمجھ جاتا ہے کہ یہ افسانہ ہجرت کے موضوع پر لکھا گیا ہے:

"I left India in 1964 with a certificate in commerce and the equivalent, in those days, of ten dollars to my name."^(۱۶)

"میں نے اپنے وطن انڈیا کو انیس سو چوٹھ عیسوی میں الوداع کہا۔ اس وقت میرے پاس تعلیم کے نام پر کامرس میں ایک سرٹیفکیٹ اور زادِ راہ کے طور پر جیب میں، اس وقت کے حساب سے، دس ڈالر کے برابر رقم تھی۔"

کہانی کی ابتدا کی طرح جھمپا لہری اختتام بھی منفرد انداز میں کرتی ہیں۔ مثلاً بی بی ہلدار کے جس پر اسرار مرض کی خبر افسانے کی پہلی سطر میں دی گئی تھی افسانے کا اختتام بھی اسی کے ذکر سے ہوتا ہے:

"For years after afterward, we wondered who in our town had disgraced her. A few of our servants were questioned and in tea stalls and bus stands, possible suspects were debated and dismissed.

But there was no point carrying out an investigation. She was, to the best of our knowledge, cured."^(۱۷)

"کئی سال تک ہم یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتے رہے کہ بھلا قصبے میں کون ہے جس نے بی بی کی عصمت دری کی تھی۔ ہمارے کئی نوکروں سے پوچھ گچھ چلتی رہی، چائے کے اسٹالوں اور بس اسٹاپ پر مشتبہ ناموں پہ بحث کے بعد سب کو ایک ایک کر کے رد کیا جاتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ موضوع گفتگوؤں سے غائب ہو گیا۔ اس تفتیش کو جاری رکھنے کی کوئی وجہ باقی نہ تھی۔ ہمارے اندازے کے مطابق بی بی اپنی بیماری سے ہمیشہ کے لیے شفا پا چکی تھی۔"

اختتامی سطور میں افسانے کے مجموعی مزاج کی جھلک افسانہ "سیکسی" میں بھی نمایاں ہے جہاں میر انڈا احساس ندامت سے دوچار ہو کر دیو سے دور ہو جاتی ہے لیکن اس کے دل میں ابھی ابھی دیو کی طلب موجود ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دیو سے دور ہو رہی ہے لیکن اس کا دل ابھی ابھی انہی جگہوں کی سیر کا طالب ہے جہاں کبھی وہ دیو کے ساتھ گھوما کرتی تھی۔ وہ دیو سے دور ہو کر اسی میپوریم کے سامنے پہنچ جاتی ہے جہاں دیو نے سرگوشی میں اسے سیکسی کہا تھا۔

"The Mapparium was closed, but she bought a cup of coffee nearby and sat on one of the benches in the plaza outside the church, gazing at its giant pillars and its massive dome and the clear blue sky spread over the city."^(۱۸)

"میپوریم ابھی بند تھا لیکن اس نے نزدیکی پلازے سے کافی کا ایک کپ لیا اور چرچ کے سامنے بیچ پر آ بیٹھی۔ وہ دیر تک اس کے دیو قامت ستونوں، اس کے عظیم الشان گنبد اور شہر پر پھیلے صاف، نیلے آسمان پہ نظریں جمائیں کھوئی رہی۔"

افسانہ "دکھوں کا ترجمان" کا اختتام بھی دلچسپ ہے۔ مسٹر کاپاسی کے گھر کا پتہ جو مسز داس نے اس خیال سے لکھ کر اپنے دستی بیگ میں ڈال لیا تھا کہ وہ امریکا سے ان کو اس سیر کی تصاویر بھیجیں گی بیگ سے نکل کر گر جاتا ہے اور کاپاسی کے علاوہ کوئی اس کا نوٹس نہیں لیتا۔ جھمپانے کاپاسی کی حسرتوں کو اس اڑتے کاغذ سے جوڑ کر افسانے کا نہایت پر اثر اختتام تشکیل دیا ہے:

"He watched as it rose, carried higher and higher by the breeze, into the trees where the monkeys now sat, solemnly observing the scene below. Mr. Kapasi observed it too, knowing that this was the picture of the Das family he would preserve forever in his mind."^(۱۹)

"کپاسی اسے ہوا کی لہروں کے ساتھ تیرتے اور اوپر ہی اوپر اٹھتے ہوئے دیکھتا رہا یہاں تک کہ یہ ان درختوں کے پتوں میں کہیں او جھل ہو گئی جن پہ بندر بیٹھے بڑے انہماک سے نیچے کا یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ کپاسی نے بھی بہ نگاہ غور اس منظر کو دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ داس خاندان کی یہ ہی وہ تصویر ہے جو اس کے دماغ میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔"

جھمپانے اپنے افسانوں کے اختتام کو پر اثر اور یادگار بنانے کے لیے کسی ایک تکنیک پر اکتفا نہیں کیا۔ ان کے افسانوں کا انجام عام طور پر چونکا دینے والا نہیں ہوتا تاہم وہ کبھی انجام کو مبہم رکھ کر قاری کو دیر تک سوچنے پر مجبور ضرور کرتی ہیں۔ مثلاً پہلے افسانے "تعطل" (A temporary matter) کے آخر میں جب قاری کو یوں لگتا ہے کہ دونوں مرکزی کردار شوبھا اور شو کو مار ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں جھمپا کہانی کو ایک منفرد موڑ دے کر چھوڑ دیتی ہیں:

"Outside the evening was still warm and the Bradfords were walking arm in arm. As he watched the couple the room went dark and he spun around. Shobha had turned the lights off. She came back to the table and sat down and after a moment Shukumar joined her. They wept together, for the things they now knew."^(۲۰)

"باہر شام ابھی تک کسی قدر گرم تھی، بریڈ فورڈ فیملی کے میاں بیوی بازوؤں میں بازو ڈالے چہل قدمی کر رہے تھے۔ وہ جب بے خیالی میں اس جوڑے کو دیکھ رہا تھا تو اچانک کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ وہ فوراً پیچھے مڑا۔ شوبھانے کمرے کی لائٹ بند کر دی تھی۔ وہ چپ چاپ چلتی ہوئی واپس میز تک آئی اور بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد شو کو مار بھی واپس اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ تاریکی میں دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ ان باتوں کو یاد کر کے رورہے تھے جن کا اس سے پہلے انہیں علم نہ تھا۔"

افسانہ "دکھوں کا ترجمان" کی ان اختتامی سطور میں جھمپانے سوز و گداز کی جس کیفیت کو نہایت مہارت سے لفظوں میں ڈھالا ہے وہ اس مجموعے کے بیشتر افسانوں میں جا بجا موجود ہے۔ جھمپا دکھ اور درد کو بیان کرنے کے لیے غم انگیز لفظوں یا جملوں کا سہارا لینے کی بجائے عام طور پر صورتِ حال ہی اس طرح کی تشکیل دیتی ہیں کہ قاری کرداروں کے غم کو پوری شدت سے محسوس کر سکتا ہے۔ افسانہ "جدائی" (When Mr. Pirzada came to dine) میں دس سالہ لیلیا اگرچہ جدائی کے غم کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہے لیکن پیرزادہ صاحب کے ڈھاکہ رخصت ہو جانے کے کئی ماہ بعد جب ان کے خط کے ذریعے ان کی خیریت کی اطلاع ملتی ہے اور لیلیا کی امی اس خبر کی خوشی میں

خصوصی کھانے کا اہتمام کرتی ہے تو لیلیا کو کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے پہلی دفعہ جدائی کے کرب کا اندازہ ہوتا ہے۔
جھپانے یہاں افسانے کے مجموعی کرب کو چند لفظوں میں سمیٹ دیا ہے:

"Though I had not seen him for months, it was only then that I felt Mr. Pirzada's absence. It was only then, raising my water glass in his name, that I knew what it meant to miss someone who was so many miles and hours away, just as he had missed his wife and daughters for so many months."^(۲۱)

"اگرچہ میں نے پیرزادہ صاحب کو کئی مہینوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن آج مجھے پہلی دفعہ ان کی عدم موجودگی کا شدت سے احساس ہوا۔ اس وقت پیرزادہ صاحب کے نام پہ گلاس ہوا میں بلند کرتے ہوئے مجھ پہ منکشف ہوا کہ ہزاروں میل دور بیٹھے اپنوں کو یاد کرنے کا احساس کیا چیز ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں پیرزادہ صاحب کے ان کی بیوی اور بیٹیوں سے مہینوں دوری کے دکھ کو پوری طرح محسوس کر رہی ہوں۔"

غم و اندوہ اور اذیت کے احساس کو جھمپا لہری نے افسانہ "دکھوں کا ترجمان" میں مسز داس اور کاپاسی کے درمیان مکالموں میں بھی بڑی مہارت سے سمو دیا ہے۔ مسز داس جب کاپاسی کے سامنے یہ انکشاف کرتی ہے کہ اس کا ایک بیٹا اس کی بے وفائی کی نشانی ہے تو اس کا کرب اس کے ایک ایک لفظ سے جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جھمپا لہری نے مسز داس کی ابتر نفسیاتی کیفیت کو کسی نفسیات دان کی سی مہارت سے بیان کیا ہے۔

"It means that I am tired of feeling so terrible all the time. Eight years Mr. Kapasi, I have been in pain eight years. I was hoping you could help me feel better, say the right thing. Suggest some kind of remedy."^(۲۲)

"یہ ظاہر کرتا ہے کہ میں اب اس اذیت کے بوجھ تلے دبے دبے تھک گئی ہوں۔ آٹھ سال کاپاسی صاحب، میں نے آٹھ سال یہ اذیت سہی ہے۔ میں امید کر رہی تھی کہ آپ میرے اس احساسِ اذیت کو کم کر سکیں گے، آپ کچھ ایسا کہیں گے کہ میں بہتر محسوس کروں۔ میرا خیال تھا آپ مجھے اس روگ سے نجات کا کوئی نسخہ بتائیں گے۔"

افسانہ "اصلی دربان" میں بوڑھی اماں کی بے بسی اور بے کسی کو جھمپانے کمال مہارت سے بیان کیا ہے۔ رہائشی عمارت کے زینے صاف کرنے والی بوڑھی اماں کی دلائی کثرت استعمال سے گھس چکی ہے اور اب بارش پڑنے کے

باعث استعمال کے قابل نہیں رہی۔ وہ اخبارات بچھا کر ان پہ سو جاتی ہے لیکن کسی کو اس کی کیفیت سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کی واحد ہمدرد مسز دلال سیر کرنے شملہ جاچکی ہے اور اب وہ اکیلی چھت پہ بیٹھی اس نئی دلائی کے خواب دیکھ رہی ہے جس کا وعدہ مسز دلال نے اس سے کیا تھا:

"More rains came. Below the dripping awning, a newspaper pressed over her head, Boori Ma squatted and watched the monsoon ants as they marched along the clothesline, carrying eggs in their mouths. Damper winds soothed her back. Her newspapers were running low. Her morning were long, her afternoons longer. She could not remember her last glass of tea. Thinking neither of her hardships nor of earlier times, she wondered when the Dalals would return with her new bedding."^(۲۳)

"آسمان سے ہر روز مینہ برستا اور چھت پہ بوڑھی اماں ٹپکتے ہوئے عارضی سائبان کے نیچے اخبار سر پہ رکھے اکڑوں بیٹھی ان برسائی چوٹیوں کو دیکھتی رہتی جو کپڑوں والی تار پہ اپنے انڈے مونہہ میں دبائے قطار میں چل رہی ہوتی تھیں۔ نم آلود ہواؤں نے اس کی پیٹھ کی جلن کو کچھ کم کر دیا تھا لیکن اس کے بستر کے لیے اخباروں کی تہہ پتلی پڑتی جا رہی تھی۔ اب بوڑھی اماں کی بے کیف صبحیں طویل اور شامیں طویل تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ آخری دفعہ کب اس نے کسی فلیٹ سے چائے کا گلاس پیا تھا۔ اب وہ نہ اپنی موجودہ زندگی کی مشکلات کے بارے میں سوچتی تھی اور نہ اسے ماضی کی آسائشیں یاد آتی تھیں وہ بس دلال فیملی کے لوٹ آنے کی منتظر تھی۔ اسے اپنے نئے بستر کا انتظار تھا۔"

افسانہ "سیکسی" اگرچہ سوز و گداز کی ان کیفیات سے عاری ہے جو "اصلی دربان" کی ہر ہر سطر میں موجود ہیں لیکن جھمپانے یہاں بھی میرانڈا کے احساسِ ندامت کو پر سوز انداز میں بیان کیا ہے۔ سات سالہ روہن کے سرہانے بیٹھی میرانڈا جب یہ سوچتی ہے کہ اس معصوم کو اپنے ماں باپ کی چھپش اور جدائی کے سبب کس اذیت سے گزرنا پڑتا ہو گا تو اس کی اپنی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں اور قاری بھی دکھ کی اس رو میں بہتا چلا جاتا ہے:

"As Miranda imagined the scene she began to cry a little herself. In the Mapparium that day, all the countries had seemed close enough to touch, and Dev's voice had bounced wildly off the glass. From across the bridge, thirty feet away, his words had reached her ears,

so near and full of warmth that they had drifted for days under her skin. Miranda cried harder, unable to stop. But Rohin still slept. She guessed that he was used to it now, to the sound of a woman crying."^(۲۴)

"جب میرا نڈانے یہ سب تصور کیا تو اس کی اپنی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ اس روز میپوریم میں اسے ایسا لگا تھا جیسے دنیا کا ہر ملک اتنا پاس ہے کہ اسے چھو کے دیکھا جاسکتا ہے اور اسے دیو کی آواز شیشے کی دیواروں سے ٹکرا کر اکر کے خود تک آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس روز میپوریم کے پل پہ دیو سے تیس فٹ دور کھڑے ہو کر بھی اس کی آواز اسے اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس سرگوشی کی حدت وہ کئی دنوں تک اپنے رگ و پے میں محسوس کرتی رہی تھی۔ لیکن اب وہ سرگوشی اس کے دل و دماغ کو برما رہی تھی۔ اب وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ خود کو روکنا چاہتی تھی پر روک نہیں پار رہی تھی۔ روہن ابھی تک سو رہا تھا۔ میرا نڈانے روتے روتے سوچا یہ معصوم اس سب کا عادی ہو چکا ہے۔ یہ سوتے ہوئے اپنے سرہانے کسی روتی بلکتی عورت کی سسکیوں کا عادی ہو چکا ہے۔"

افسانہ "مسز سین کا گھر" میں مسز سین کی اپنے وطن اور اپنوں سے دوری کے دکھ کو جھپپانے منفرد انداز سے پیش کیا ہے۔ اجنبی دیس میں کوئی ایسا نہیں جس سے مسز سین اپنا غم بانٹ سکیں اس لیے وہ گیارہ سالہ ایلین کے سامنے اپنی بے بسی اور جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتی رہتی ہیں۔ مسز سین کے ٹوٹے پھوٹے فقروں میں جھپپانے بے وطنی کے سارے دکھ سمیٹ دیے ہیں:

"Send pictures, they write. 'Send pictures of your new life.' What pictures can I send?" She sat, exhausted, on the edge of the bed, where there was now barely room for her. 'They think I live the life of a queen, Eliot.' She looked around the blank walls of the room. 'They think I press button and the house is clean. They think I live in a palace.'^(۲۵)

"تصویریں بھیجو، میرے گھر والے لکھتے ہیں تصویریں بھیجو، اپنی نئی زندگی کی تصویریں بھیجو۔ میں بھلا انہیں کیا تصویریں بھیجوں ایلین؟" وہ مضطرب سی پلنگ کے کنارے پہ جیسے ڈھے گئیں۔ پلنگ پہ جا بجا بکھری ساڑھیوں نے ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ محدود کر دی تھی۔ "وہ سمجھتے ہیں کہ میں یہاں کسی ملکہ کی طرح زندگی گزار رہی ہوں۔" انہوں نے کمرے کی سپاٹ دیواروں پہ کھوئی کھوئی نظریں دوڑائیں۔ "وہ لوگ

سمجھتے ہیں کہ میں ایک بٹن دباتی ہوں اور سارا گھر صاف ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں کسی محل میں رہتی ہوں۔"

جھمپا لہری کی کہانیوں میں سوز و گداز (Pathos) کے علاوہ امیجری کا کثرت سے استعمال بھی ان کی تخلیقات کو منفرد بناتا ہے۔ لفظی تصویر کشی اور واقعات کی صورت گری ان کے اسلوب کی نمایاں صفت ہے۔ لفظوں سے صورت گری کے اس فن میں وہ مختلف تکنیکیں استعمال کرتی ہیں۔ وہ فطرت، ثقافت، مذہب، اساطیر، لباس وغیرہ کی مدد سے اپنے امیجز تخلیق کرتی ہیں۔ ہم لتا اپنے تحقیقی مضمون میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہیں:

"Jhumpa Lahiri has made an elaborate use of imagery. Her stories and the novel The Namesake are replete with all kinds of imagery. She has generally drawn her images from varied sources such as from culture, geography, animal world, the world of nature, Hindu mythology, religion and human anatomy."^(۲۶)

جھمپا لفظی امیجری کے علاوہ علامتوں کے استعمال سے بھی اپنے افسانوں اور ناولوں میں معنوی گہرائی پیدا کرتی ہیں۔ افسانہ "تعطل" میں تاریکی اور کھانا؛ "جدائی" میں پیرزادہ کی جیبی گھڑی جو ڈھاکہ کا وقت بتاتی ہے، بنگالی کھانے، ہالوین پہ لایا جانے والا پمپکین اور لیلیا کو ملنے والی کینڈیاں؛ "دکھوں کا ترجمان" میں کاپاسی اور مسز داس کے لباس، بندر، مر مرے، کیمرا اور سوریا مندر؛ "اصلی دربان" میں بوڑھی اماں کے سابقہ خزانوں کی چابیاں، دلائی اور واش بیسن؛ "سیکسی" میں میرانڈا کا لباس اور میپوریم؛ "مسز سین کا گھر" میں ساڑھی، مچھلیاں، کار اور خمیدہ پھل والی چھری؛ "مبارک گھر" میں مسیحی تبرکات؛ "بی بی ہلدار کا علاج" میں اسٹور روم اور "تیسرا اور آخری براعظم" میں چاند پہ امریکی پرچم وہ چند علامتیں ہیں جن کی مدد سے جھمپا نے اپنے افسانوں میں تہہ در تہہ معنویت بھر دی ہے۔ جھمپا لہری تشبیہات و استعارات کے بر محل استعمال سے اپنے اسلوب کو دلکش بنانے کا فن جانتی ہیں۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے عام طور پر کھانے پینے کی چیزوں اور ملبوسات سے جڑے ہوتے ہیں جیسے "اصلی دربان" میں بوڑھی اماں کا تعارف وہ کچھ یوں کرواتی ہیں:

"She was sixty four years old, with hair in a knot no longer than a walnut, and she looked almost as narrow from the front as she did from the side. In fact, the only thing that appeared three dimensional about Boori Ma was her voice: brittle with sorrows, as tart as curds, and shrill enough to grate meat from a coconut."^(۲۷)

"اس کی عمر چونسٹھ سال تھی اور اس کے سر پہ بالوں کی گنجلک چوٹی اب محض اخروٹ جتنی رہ گئی تھی۔ وہ سامنے سے جیسی سوکھی سڑی لگتی تھی پہلو سے بھی ویسی ہی سپاٹ دکھائی دیتی تھی۔ بوڑھی اماں کی ناتواں کاٹھی میں جو چیز توانا تھی وہ اس کی آواز تھی۔ یوں لگتا جیسے اس کی تیز آواز میں اس کے سارے غم گندھ گئے ہوں۔ اس میں ترش دہی جیسی کاٹھوتی اور یہ ایسی پاٹ دار تھی جیسے کدو کش پہ ناریل چھیلا جا رہا ہو!"

افسانہ "مسز سین کا گھر" میں مسز سین کی خمیدہ پھل والی چھری کا تعارف کرواتے ہوئے جھمپا لکھتی ہیں:

"Instead of a knife she used a blade that curved like prow of a Viking ship, sailing to battle in distant seas."^(۲۸)

"روایتی چاقو کی بجائے مسز سین ایک ایسی چھری استعمال کرتی تھیں جس کا لمبا چوڑا پھل کسی ایسے بحری جہاز کے اگلے حصے کی طرح خمیدہ تھا جسے قدیم بحری قذاق پر اسرا سمندر کی پہنائیوں میں دوڑاتے پھر رہے ہوں۔"

الغرض حسی استعاروں کے استعمال کی مثالیں زیرِ نظر افسانوی مجموعے میں جا بجا دکھائی دیتی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ان دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہوئے آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلوب کی ندرت، پلاٹ کی چستی اور یاد گار کرداروں کے سبب جھمپا لہری ایک ماسٹر کہانی کار ہیں۔

حوالہ جات

- ۱۔ مجنوں گورکھ پوری، افسانہ (مقالہ)، ایوان اشاعت گورکھ پور، ۱۹۳۵ء، ص ۷
- ۲۔ وقار عظیم، سید، فن افسانہ نگاری، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۶۶
- ۳۔ نگہت ریحانہ، ڈاکٹر، اردو مختصر افسانہ: فنی و تکنیکی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۹
- ۴۔ نجم الہدیٰ، ڈاکٹر، کردار اور کردار نگاری، بہار اردو اکادمی، ۱۹۸۰ء، ص ۴۵
- ۵۔ وقار عظیم، سید، افسانہ نگاری، سرسوتی پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد، ۱۹۳۵ء، ص ۱۰۳-۱۰۴
- ۶۔ وقار عظیم، سید، افسانہ نگاری، سرسوتی پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد، ۱۹۳۵ء، ص ۱۰۵-۱۰۶
- ۷۔ عابد علی عابد، سید، اسلوب، علی گڑھ بک ڈپو، علی گڑھ، ۱۹۷۶ء، ص ۴۴
- ۸۔ عابد علی عابد، سید، اسلوب، علی گڑھ بک ڈپو، علی گڑھ، ۱۹۷۶ء، ص ۴۸
- ۹۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ادبی تنقید اور اسلوبیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۴
- ۱۰۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۶
- ۱۱۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، ص ۱۳
- ۱۲۔ Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, HarperCollins Publishers, New York, USA, 1999, Page 1
- ۱۳۔ Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 43
- ۱۴۔ Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 83
- ۱۵۔ Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 158

Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 173	- ¹⁹
Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 172	- ¹²
Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 110	- ¹⁸
Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 69	- ¹⁹
Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 22	- ²⁰
Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 42	- ²¹
Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 65	- ²²
Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 80-81	- ²²
Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 108-109	- ²²
Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 125	- ²⁵
Hemlata, Pattern of imagery: A thematic and structural study of selected works of Jhumpa Lahiri, Research Article, The Criterion, Vol IV Issue 4, August 2013, P1-7	- ²⁶
Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 70	- ²²
Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, Page 114	- ²⁸

ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ

ترجمہ کاری کے ایک پیچیدہ فن ہونے میں کچھ کلام نہیں۔ ایک زبان کے متن کو کسی دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ اصل مفہوم بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے اور ترجمے میں اجنبیت اور غیریت بھی نہ آنے پائے ایک مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ غیر ادبی متون کے برعکس جہاں محض لفظوں کے ظاہری مفہیم کو دوسری زبان میں منتقل کرنا مقصود ہوتا ہے ادبی متون کا ترجمہ نہایت جانفشانی اور عرق ریزی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ ادبی متن میں الفاظ تہہ در تہہ معنویت کا ایک جہان اپنے اندر سموئے ہوتے ہیں اس لیے ان کے ظاہری اور باطنی دونوں مفہیم تک پہنچ کر ان کو ہدفی زبان (Target Language) میں منتقل کرنا پڑتا ہے۔ ادبی تراجم کی اسی پیچیدگی کے پیش نظر ہمارے ہاں اس میدان میں طبع آزمائی کرنے والوں کی تعداد محدود ہے۔ بہر حال ادبی تراجم کے میدان میں ان کٹھنائیوں کے باوصف اردو ادب کے دامن میں انیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر موجودہ عہد تک انگریزی، ترکی، فارسی اور فرانسیسی وغیرہ زبانوں سے کیے گئے تراجم کا ایک خزانہ موجود ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس ادبی متون کے تراجم کی ایک روایت، اگرچہ کمزور ہی سہی، بہر حال موجود ہے۔

ایک عالمی لنگوائفرازا ہونے کے سبب انگریزی زبان کی اہمیت مسلمہ ہے۔ انگریزی ادب کا دامن بھی، انگریزی کے عالمگیر ہونے کے سبب، اب محض انگریزوں اور امریکی ادیبوں کی تخلیقات تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کے آب و رنگ میں مختلف تہذیبوں اور زبانوں سے تعلق رکھنے والوں ادیبوں کا لہو بھی شامل ہو چکا ہے۔ ایشیا سے تعلق رکھنے والے تارکین وطن بالعموم اور جنوبی ایشیائی تارکین وطن نے بالخصوص پچھلی آدھ پون صدی میں تلاشِ معاش اور بہتر زندگی کی تلاش میں یورپ اور امریکا کی طرف ہجرت کر کے ان زمینوں کو اپنا مسکن بنایا ہے۔ یوں جنوبی ایشیائی تارکین وطن کی ایک بڑی تعداد اب یورپ و امریکا میں رچ بس چکی ہے۔ ان تارکین وطن کو درپیش مشکلات پر انگریزی ادب میں متعدد ادیبوں نے قلم اٹھایا ہے۔ جھمپا لہری ایسے ادیبوں کی کہکشاں میں غالباً سب سے روشن ستارہ ہیں۔ جھمپا کے والدین نے مغربی بنگال سے ہجرت کر کے اول انگلستان اور پھر امریکا کو اپنا مسکن بنایا اس لیے جھمپا نے تارکین وطن کے دکھوں کو بہ یک وقت ایک ہندوستانی اور ایک امریکی کی آنکھ سے دیکھ کر لفظوں میں ڈھالا ہے۔

جھپا معاصر انگریزی ادب کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں اپنے پہلے افسانوی مجموعے Interpreter of maladies کو ملنے والے پلٹزر پرائز سے ادبی شہرت کی بلندیوں کو چھونے والی جھپا کالب دلچہ دھیمالیکن شستہ ہے۔ "دکھوں کا ترجمان" (Interpreter of maladies) میں انہوں نے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں چھپنے والی ۹ کہانیوں کو جمع کیا ہے۔ زیر نظر مقالے میں ان کہانیوں کو با محاورہ اردو زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے یہ امر بالخصوص پیش نظر رہا کہ ترجمے کی زبان نہ اتنی سلیس ہو کہ اس میں ادبیت جاتی رہے اور نہ اتنی ادق ہو کہ محض الفاظ کا ایک گورکھ دھند ابن کر رہ جائے۔ تاہم اردو زبان کی شستگی، روانی اور ترنم کو قائم رکھنے کی کوشش میں اصل متن سے دوری کی قربانی دینے سے گریز کیا گیا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ترجمے کو ہم اصل متن کے بالمقابل رکھ کر سطر بہ سطر پڑھ سکتے ہیں۔

جھپا لہری کے اس افسانوی مجموعے میں متعدد موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کل شامل ۹ میں سے ۸ افسانے تارکین وطن کی پہلی یا دوسری نسل کی کہانیاں ہیں۔ یوں ہجرت اور ہجرت کے نتیجے میں جنم لینے والے دکھ کتاب میں جابجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف ہمیں "مسز سین کا گھر" کی مسز سین اپنی مٹی اور اپنے رشتوں سے دوری کے کرب میں تڑپتی، مچلتی اور سسکتی دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف "جدائی" کے پیر زادہ صاحب بو سٹن میں بیٹھے اپنے جنگ زدہ شہر ڈھاکہ کے خیال سے پریشان ہیں جہاں ان کی بیوی اور سات بیٹیاں محصور ہیں۔ ہجرت کی کہانیوں میں بٹوارے کے نتیجے میں بے گھر ہونے والی "بوڑھی اماں" کا دکھ ترحم انگیز بھی ہے اور المناک بھی۔ مشرقی بنگال سے ہجرت کر کے کلکتہ کی ایک رہائشی عمارت کی سیڑھیوں تلے اپنا ٹھکانہ بنانے والی بوڑھی اماں کو جب عمارت کے مکین نکال باہر پھینکتے ہیں تو اسے ایک اور بے گھری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ "تیسرا اور آخری برا عظم" کا نوجوان امریکا ہجرت کرنے کے بعد مہینوں بے یار و مددگار اجنبی زمین پر بھٹکتا پھرا لیکن اپنی سخت جانی اور جانفشانی کے سبب بالآخر وہ خود کو نئی مٹی کی بوباس میں ڈھالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہجرت نئی تہذیب سے شناسائی اور نئے آب و گل میں رچ بسنے کا نام ہے لیکن جہان نو سے شناسائی کے اس سفر میں مسافروں کو متعدد مشکلات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ جھپانے تارکین وطن کی پہلی اور بالخصوص دوسری نسل کو درپیش عائلی مشکلات پر بھی اس افسانوی مجموعے میں قلم آرائی کی ہے۔ شادی شدہ جوڑوں کی زندگیوں میں زہر گھولتی خاموشیاں، تنہائیاں اور بے وفائیاں متعدد افسانوں میں بکھری پڑی ہیں۔ "تعطل" کے شوہا اور شوہار اپنے پہلے بچے کی موت پر ایک دوسرے کا دکھ بانٹنے کی بجائے ایک دوسرے سے بے اعتنا ہو کر اپنے اپنے غم کی آگ میں جل رہے ہیں اور یہ آگ ان کے آشیانے کو جلانے کے درپے ہے۔ "دکھوں کا ترجمان" کی مسز داس اپنے شوہر سے

بے وفائی کی آگ میں جل رہی ہے اور ۸ سال سے اس راز کو اپنے سینے میں دبائے وہ اس قدر تھک چکی ہے اب ایک اجنبی مسٹر کا پاسی کے سامنے پھٹ پڑتی ہے۔ "سیکسی" میں ادھیڑ عمر دیو اپنی بیوی کو چھوڑ کر نوجوان امریکی لڑکی سے جنسی حظ اٹھا رہا ہے جب کی لکشمی کی کزن کا شوہر بھی کسی انگریز عورت کے لیے اپنے بیوی بچے کو چھوڑ بیٹھا ہے۔ یوں دونوں خاندان بے وفائی کے طوفان میں گھرے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے کے قریب ہیں۔ "مبارک گھر" کا نیا شادی شدہ جوڑا ٹوٹنکل اور سنجیو ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش میں ٹھوکریں کھا کھا کر سنبھل رہا ہے۔

جھمپا لہری کے اس افسانوی مجموعے میں جنسی مہم جوئی کے نتیجے میں جنم لینے والے جذباتی اور نفسیاتی مسائل کا احاطہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ "سیکسی" کی نوخیز میرانڈا محبت کی اصل سے آشنا نہیں چنانچہ جب وہ دیو کے دام محبت میں گرفتار ہو کر جنسی استحصال کا نشانہ بنتی ہے تو اسے یہ حقیقت سمجھ نہیں آتی کہ دیو اس سے محض اپنی آتش ہوس بجھا رہا ہے۔ لیکن بالآخر روہن کا کرب دیکھ کر میرانڈا کے اندر احساسِ ندامت جنم لیتا ہے اور وہ دیو سے دور ہو کر اس استحصالی تعلق سے نجات پالیتی ہے۔ "دکھوں کا ترجمان" کی مسز داس بھی ایک کمزور لمحے میں کیے جانے والے ناجائز جنسی تجربے کا بوجھ اپنے ضمیر پر اٹھائے پھر رہی ہے۔ اس کی جذباتی شکست و ریخت اس کے ایک ایک لفظ سے ہویدا ہے۔ لکشمی اور مسز داس کے برعکس ہسٹیریا کی مریض بی بی بلدار کے لیے جنسی تجربہ اس کے دکھوں کا درماں ثابت ہوتا ہے۔ یوں جھمپانے جنس کو اس کی متنوع صورتوں میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

"بی بی بلدار کا علاج" میں مرض سے لڑتی، گرتی، سنبھلتی بی بی کا ہاتھ اس کا رشتہ دار کزن تو نہیں تھامتاتا ہم عمارت کے مکین اس کے لیے فرشتہ ثابت ہوتے ہیں جب کہ "اصلی دربان" میں رہائشی عمارت کے مکین بوڑھی اماں کے کرب کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور شقاوتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے عمارت بدر کر دیتے ہیں۔ یوں جھمپانے سماجی احساس اور سماجی بے حسی کی دونوں صورتوں کو ہمارے سامنے ان افسانوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔

منفرد موضوعات کے علاوہ جھمپا کے ہاں اندازِ اسلوب کی ندرت، مشاقانہ پلاٹ گری اور خلا قانہ کردار نگاری بھی ان کے افسانوں کو ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ جھمپانے پلاٹ کی تشکیل میں روایتی سانچوں سے استعفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ تجربات بھی کیے ہیں۔ وہ ایک ایک لفظ، ایک ایک واقعہ، ایک ایک جملہ اس قرینے سے باندھتی ہیں کہ پلاٹ میں ہر چیز ایک دوسرے سے پوری طرح مربوط نظر آتی ہے یوں کہانی میں کہیں جھول دکھائی نہیں دیتا۔ ان کے کردار افسانوی ہوتے ہوئے بھی اس قدر حقیقی دکھائی دیتے ہیں کہ ہمیں اکثر فسانے پہ حقیقت کا گماں ہونے لگتا ہے۔ وہ کرداروں کی نفسیاتی پرداخت اس باریک بینی سے کرتی ہیں کہ ہم ان کرداروں کو اپنے ارد گرد چلتے پھرتے بولتے چالتے محسوس کرتے ہیں۔ جھمپا لہری کا اسلوب ان کی فنکارانہ صناعی کا مونہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ تخیل

آرائی، لفظی تصویر کاری اور صنائع بدائع کے موزوں استعمال سے منظر گری کرنے میں مہارتِ تامہ رکھتی ہیں۔ امیجری کے شاہکار نمونے ہمیں ان کے افسانوں میں متعدد مقامات پہ جڑے ملتے ہیں۔ مقالہ ہذا میں جھمپا لہری کے افسانوں کو اردو میں ڈھالنے اور ان کی محولہ بالا فنی ندرت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ب۔ نتائج

جھمپا لہری کے افسانوی مجموعے "دکھوں کا ترجمان" کا محاورہ ترجمہ اور تجزیہ کرتے ہوئے درج ذیل نتائج اخذ کیے گئے ہیں:

۱۔ ادبی ترجمہ کاری میں کسی ایک معین تکنیک کا سہارا لے کر کامیاب ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ ترجمہ کرتے ہوئے عملی طور پر مختلف تکنیکوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ متعدد مقامات پر ایک ہی پیرا گراف میں کہیں لفظی، کہیں محاورہ، کہیں آزاد اور کہیں توضیحی ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ اگر ترجمے کی کسی ایک معین تکنیک پر سختی سے کاربند رہ کر ترجمہ کیا جائے تو حاصل ہونے والا نتیجہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر صرف محاورہ ترجمہ کیا جائے تو مفہوم تو ادا ہو جائے گا لیکن عین ممکن ہے کہ وہ ادبی چاشنی سے بالکل عاری ایک روکھا پھیکا ترجمہ ہو جس میں متعدد جگہوں پر زبان میں غرابت اور نامانوسیت در آئے۔

۳۔ انگریزی ادب سے ترجمہ کرتے ہوئے بعض صورتوں میں انگریزی تہذیب سے مخصوص کھانوں، لباسوں، روایتوں، تہواروں، اساطیری و مذہبی علامتوں وغیرہ کا ترجمہ کرتے ہوئے مشکل پیش آتی ہے لیکن اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے یا تو مطلوبہ لفظ کو بعینہ اسی طرح اردو میں لیا جاسکتا ہے یا پھر اس کا ایسا ترجمہ کیا جاسکتا ہے جس سے اردو قاری کے ذہن میں اس کا وہی تاثر بیٹھے جو انگریزی لفظ ادا کرتے ہوئے انگریزی تہذیب سے وابستہ کسی شخص کے ذہن میں بیٹھتا ہو۔

۴۔ جھمپا لہری کے افسانوں میں تلاشِ معاش میں مشرق سے مغرب ہجرت کرنے والے جنوبی ایشیائی تارکینِ وطن کے جذباتی، نفسیاتی، معاشی، سماجی اور تہذیبی دکھ جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ ہجرت اور ترکِ وطن جھمپا لہری کا محبوب موضوع ہے اور یہی ان کی امتیازی پہچان ہے۔

۵۔ جھمپا لہری کو ایک خلاق کہانی کار بنانے میں ان کے منفرد اسلوب اور کردار نگاری کا کلیدی کردار ہے۔

ج۔ سفارشات

۱۔ اس تحقیق میں جھمپا لہری کے پہلے افسانوی مجموعے "Interpreter of maladies" کا ترجمہ اور تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان کے دوسرے افسانوی مجموعے "Unaccustomed Earth" کے ترجمے پر بھی کام کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ جھمپالہری کے دو ناول "The Namesake" اور "The lowland" بھی جھمپا کی فنکارانہ صناعی کا مونہ بولتا ثبوت ہیں۔ ادبی حلقوں میں ان کی پذیرائی انہیں جدید امریکی ادب میں نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔ ان ناولوں کے اردو تراجم پر بھی کام کیا جانا ضروری ہے۔

۳۔ جدید انگریزی ادب میں جنوبی ایشیائی قلمکاروں کے تخلیق کردہ جنوبی ایشیائی ادب کا ایک بڑا اہم اور نمایاں کردار ہے لیکن اردو میں ان قلمکاروں کی کتابوں کے تراجم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس میدان میں بھی تحقیق کی اشد ضرورت ہے۔

۴۔ تراجم سے قطع نظر اردو میں جھمپالہری پر کوئی تحقیقی کام دستیاب نہیں ہے۔ امریکی ادب کا ایک معتبر حوالہ ہونے کی حیثیت سے ان پر تحقیق کی گنجائش موجود ہے۔

۵۔ ادبی ترجمہ کاری کی عملی ضرورتوں پر اردو میں تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہے اس کو بھی موضوع تحقیق بنایا جاسکتا ہے۔

کتابیات

الف۔ بنیادی ماخذ

Jhumpa Lahiri, Interpreter of Maladies, HarperCollins Publishers, New

York, USA, 1999

ب۔ ثانوی ماخذ

کتب

اعجاز راہی (مرتب)، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلپیٹ تک، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع ہفتم، ۲۰۰۳ء

خلیق انجم (مرتب) فن ترجمہ نگاری، انجمن ترقی اردو ہند، طبع سوم، ۱۹۹۶ء

شبلی نعمانی، مقالات شبلی، جلد ششم، مرتبہ مولوی مسعود علی، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۳۶ء

صوبیہ سلیم، ڈاکٹر، (مرتب) فن ترجمہ کاری، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۲ء

عابد علی عابد، سید، اسلوب، علی گڑھ بک ڈپو، علی گڑھ، ۱۹۷۶ء

فاخرہ نورین، ڈاکٹر، ترجمہ کاری، ادارہ تحقیقات اردو، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

قمر رئیس، ڈاکٹر، ترجمہ کافن اور روایت، تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی، بار اول، جون ۱۹۷۶ء

گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ادبی تنقید اور اسلوبیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

مجنوں گورکھ پوری، افسانہ (مقالہ)، ایوان اشاعت گورکھ پور، ۱۹۳۵ء

مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، مغرب سے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء

مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، صحافتی زبان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

مشاورتی کمیٹی (مرتب)، ترجمے کے فنی اور عملی مباحث، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نیو دہلی، ۲۰۱۲ء

نثار احمد قریشی، ترجمہ: روایت اور فن، نظر ثانی محمد شریف کنجاہی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

نجم الہدیٰ، ڈاکٹر، کردار اور کردار نگاری، بہار اردو اکادمی، ۱۹۸۰ء

نگہت ریحانہ، ڈاکٹر، اردو مختصر افسانہ: فنی و تکنیکی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۶ء

وقار عظیم، سید، افسانہ نگاری، سرسوتی پبلیشنگ ہاؤس، الہ آباد، ۱۹۳۵ء

وقار عظیم، سید، فن افسانہ نگاری، اعتقاد پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

Jhumpa Lahiri, The Namesake (Novel), Houghton Mifflin, Boston, USA, 2003

Jhumpa Lahiri, Unaccustomed Earth (Short Stories), Knopf, New York, 2008

Jhumpa Lahiri, The Lowland (Novel), Random House, India, 2013

Suman Bala, Jhumpa Lahiri, The master story teller: A critical response to Interpreter of maladies, Khosla Publishing House, Dehli, 2002

رسائل و جرائد

Research Journal of English language and Literature, Volume 1 Issue 4, Oct-Dec 2013

International Journal of Advanced Research (IJAR), June 2017

The Literati, Volume 7, 2017

Postcolonial Interventions, Volume II, Issue 2, June 2017

International Journal of English Language, Literature and Humanities,

Volume VI, Issue 1, Jan 2016, Page 450-470

Journal of English Studies, Volume 17, 2019

Journal of English Language and Literature, Volume IV, Issue 4, 2017

Language in India, Volume XIX, Issue 2, February 2019

International Journal of English Language, Literature and Humanities,

Volume I, Issue 5, Feb 2014

The Criterion, Vol IV Issue 4, August 2013

کالم

انتظار حسین، اردو میں ترجمہ کے مسائل (کالم) مشمولہ روزنامہ ایکسپرس، کراچی، ۱۵ اکتوبر ۲۰۱۵ء